چاہِ یوسف سے صدا

یوسف رضا گیلانی

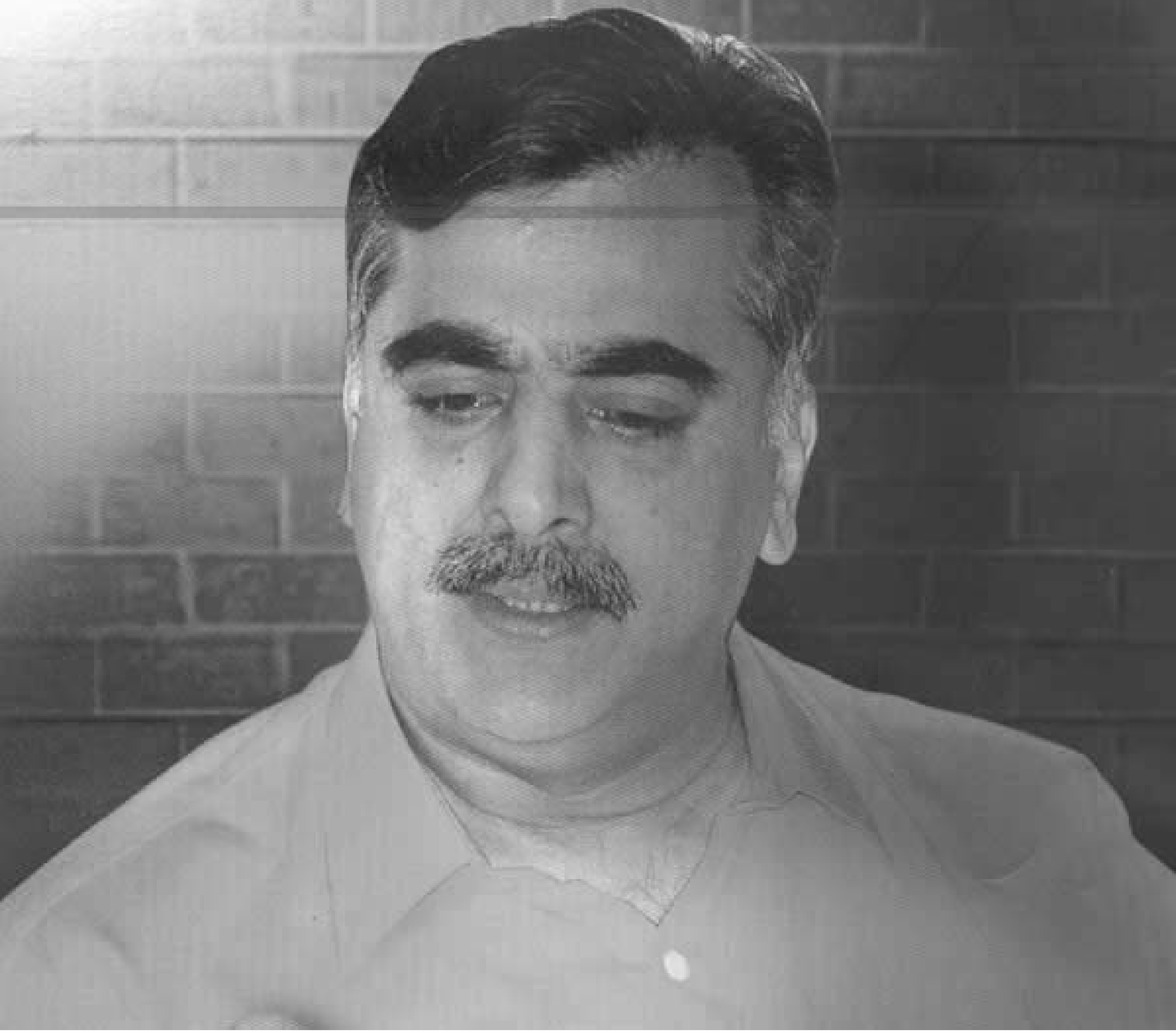

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: چاہِ یوسف سے صدا

مصنف: یوسف رضا گیلانی

زندگی کے جتنے دروازے ہیں مجھ پر بند ہیں
دیکھنا، حدِ نگاہ سے آگے دیکھنا بھی جرم ہے
سوچنا، عقیدوں اور یقینوں سے آگے سوچنا بھی جرم ہے
'کیوں' بھی کہنا جرم ہے 'کیا' بھی کہنا جرم ہے
سانس لینے کی اجازت تو ہے مگر
زندگی کے لیے 'کچھ اور بھی' درکار ہے
اور اس 'کچھ اور بھی' کا تذکرہ بھی جرم ہے
اے ہنر مندانِ آئین و سیاست!
اے خدا وندانِ ایوانِ عقائد!
زندگی کے نام پر بس اِک اجازت چاہیے
مجھ کو اِن سارے جرائم کی اجازت چاہیے

انتساب

خدا کرے کہ میری ارضِ پاک پر اُترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو
خدا کرے میرے اِک بھی ہم وطن کے لیے
حیات جرم نہ ہو زندگی وبال نہ ہو

اُس خاموش اکثریت کے نام

جس کے بولے بغیر ارض پاک پر
حیات جرم اور زندگی وبال ہی رہے گی

فہرست

پیش لفظ 9

باب اول: خاندانی پس منظر 13

باب دوئم: بچپن سے نوعمری تک 37

باب سوئم: جنرل ضیاء الحق کا دورِ حکومت (1977ء۔1985ء) 59

باب چہارم: محمد خان جونیجو کا دورِ حکومت (1985ء۔1988ء) 83

باب پنجم: محترمہ بے نظیر بھٹو کا پہلا دورِ حکومت (1988ء۔1990ء) 115

باب ششم: میاں محمد نواز شریف کا پہلا دورِ حکومت (1990ء۔1993ء) 137

باب ہفتم: محترمہ بے نظیر بھٹو کا دوسرا دورِ حکومت (1993ء۔1996ء) 153

باب ہشتم: میاں محمد نواز شریف کا دوسرا دورِ حکومت (1997ء۔1999ء) 199

باب نہم: جنرل پرویز مشرف کا دورِ حکومت (1999ء تا حال) 213

باب دہم: اختتامیہ 259

پیش لفظ

والدِ محترم مخدوم سیّد علمدار حسین گیلانی کی زندگی اور اُن کی ملک وقوم کے لیے خدمات ہمیشہ میرے لیے مشعلِ راہ رہیں۔ نیز جیل کی سلاخوں کے پیچھے آنے کے بعد میری آنکھیں مزید کھلیں اور اُن کی زندگی کے بعض واقعات کی معنویت مجھ پر ایک اور ہی طرح سے عیاں ہوئی۔ اُن کے عزم، حوصلے، صبر، انتھک محنت، خدمتِ خلق اور سیاسی جدوجہد نے میری زندگی اور شخصیت پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ اُنھیں اپنے خاندان کے اکابرین کی دینی ودنیاوی کاوشوں پر کتاب مرتب کرنے کا شوق تھا لیکن وہ اپنی گوناں گوں مصروفیات کے پیشِ نظر ایسانہ کر سکے۔ ان کی محبت وشفقت کا تقاضا ہے کہ میں اس کتاب کے توسط سے اُن کی دِلی آرزو کی تکمیل کروں۔ میں نے اس کتاب میں اپنے خاندان کی تاریخ اور بزرگوں کی خدمات کا ذکر بھی کیا ہے۔

اس کتاب کا اصل مقصد عہدِ حاضر کی سیاست کے پنہاں گوشوں اور ایوانِ اقتدار کی راہداریوں کی سرگوشیوں کو خاموش اکثریت کی سماعتوں تک پہنچانا ہے اگرچہ اس میں عوام کے حقوق اور ملک وقوم کی فلاح و بہبود کے لیے کی گئی میری مقدور بھر جدوجہد اور کاوشوں کی ایک جھلک بھی نظر آئے گی۔

آمریت، آزادیِ انسان کے منافی ہے۔ آمریت کے خلاف جمہوریت کی جنگ لڑنے والوں کو ذہنی، اعصابی اور جسمانی صعوبتیں برداشت کرنے کے لیے زندگی کے وقار کا احساس ہی حوصلہ، ہمت اور جرأت عطا کرتا ہے کیونکہ جمہوریت مکمل انسانی رویّے کا نام ہے، پسِ دیوارِ زنداں، کائنات قید میں سمٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے مگر ارادے اور حوصلے قائم رہتے ہیں۔ میں اپنے آباواَجداد کی روحوں کو گواہ بنا کر دوستوں کو یقین دلاتا ہوں کہ قید نے میرے ارادوں اور حوصلوں کو

پہلے سے زیادہ بلند اور مضبوط و توانا بنا دیا ہے۔

اس کتاب میں درج یادداشتیں بالواسطہ یا بلاواسطہ مجھ سے متعلق ہیں جن کا مقصد قارئین کو واقعات و حقائق کے ساتھ اُن کے پیش منظر اور پس منظر سے آگاہ کرنا ہے نہ کہ کسی کی دِل شکنی کرنا۔ دورانِ تحریر روانی اور دلچسپی کو قائم رکھنے کے لیے میں نے اپنے قابلِ عزت و احترام بزرگوں، عزیز و اقارب، احباب اور ساتھیوں کے القابات کی تکرار سے پرہیز کیا ہے۔ میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اُن کی عزت و احترام کرتا ہوں۔ میں نے حتیٰ الامکان آسان اور عام فہم الفاظ کا استعمال کیا ہے۔

''چاہِ یوسف سے صدا'' اصولوں پر سمجھوتہ کیے بغیر مثبت تبدیلی کے لیے باطل نظام کے سامنے ڈٹے رہنا ہے۔ صبر و استقامت اس یقین کا اظہار ہے کہ باطل کو آخر مٹ جانا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا تھا کہ فرعون سے بات نرمی سے کریں۔ اضطراب کا اظہار اپنی ناکامی اور باطل کی فتح تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔ سو، صعوبتوں کے سفر میں کبھی اضطراب کا اظہار نہیں ہوگا۔ باقی رہا باطل، اسے تو جانا ہی ہے۔ یہی میری ارضِ پاک کی خاموش اکثریت کی آرزو ہے۔

❀ ❀ ❀

اظہارِ تشکر

اس کتاب کو مکمل کرنے میں کئی احباب نے مختلف انداز میں میری مدد و معاونت کی:

- مظہر برلاس اور جیل کے ساتھیوں محمد اصغر علی چوہدری، مظہر انوار نورانی اور جاوید قریشی نے مسودہ کی نوک پلک سنوارنے میں مدد کی۔
- سردار احمد رضا درانی نے مسودہ کو کمپیوٹر میں محفوظ کیا۔
- میری اہلیہ، بھائی سیّد احمد مجتبیٰ، چچا زاد بھائی سیّد علی رضا، سیّد اسد مصطفیٰ، عزیزم سیّد عبدالقادر، سیّد علی موسیٰ اور بھانجے سیّد جواد معین نے خاندان کے بزرگوں کی تحریروں اور تصویروں کو تلاش کرنے میں مدد دی۔
- سیّد سجاد محی الدین، سیّد ناصر، سیّد حسن رضا اور میرے کلاس فیلو سیّد حر ریاحی گردیزی نے گیلانی خاندان پر لکھی گئی تاریخی کتب میں سے تحقیقی مواد اکٹھا کر کے دیا جس سے مستند انداز میں خاندانی پسِ منظر کو بیان کرنے میں سہولت ملی۔
- اعتزاز نیازی، میاں امجد، سردار حیات خان مندوخیل اور احتشام الحق نے دورانِ اسیری مطلوبہ اسباب اور سہولیات بہم پہنچائیں۔
- اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں سیّد ارشاد احمد عارف کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔
- میں ان تمام حضرات کا ممنون ہوں اور اُن کا بھی جن کا نام آنے سے رہ گیا ہے۔

☆☆☆

باب اوّل

خاندانی پس منظر

میرے والد مخدوم سیّد علمدار حسین گیلانی، مخدوم سیّد غلام مصطفےٰ شاہ گیلانی کے بیٹے اور پیر سیّد محمد صدر الدّین شاہ گیلانیؒ کے پوتے تھے۔ پیر صدر الدّین شاہ حضرت پیر سیّد ولائیت حسین شاہ گیلانیؒ کے فرزندِار جمند اور سجادہ نشیں تھے۔ آپ کا شجرۂ نسب حضرت سیّد ابوالحسن جمال الدین المعروف موسیٰ پاک شہیدؒ (952ھ۔1010ھ) سے جاملتا ہے۔

حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ، حضرت سیّد حامد گنج بخش گیلانیؒ کے بیٹے تھے۔ حضرت سیّد حامد گنج بخش گیلانی کے والد سیّد عبدالرزاق شاہ گیلانیؒ، دادا حضرت سیّد عبدالقادر ثانیؒ اور پردادا حضرت سیّد شیخ بندگی محمد غوث گیلانی حلبی اوچیؒ تھے جو کہ حضرت سیّد شیخ شمس الدّین جیلانی حلبیؒ کے اکلوتے فرزند تھے۔ سیّد بندگی محمد غوث گیلانی حلبی اوچیؒ شام سے ہجرت کر کے اُوچ تشریف لائے اور شمعِ رشد و ہدایت روشن کی جس کی روشنی برصغیر میں پھیل گئی۔ اُن کا شجرۂ نسب نویں پشت میں قادریہ سلسلہ کے اوّلین بزرگ غوث الاعظم میراں محی الدّین شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے جاملتا ہے۔ غوث الاعظمؒ 470ھ میں ملک فارس (ایران) کے علاقہ گیلان میں پیدا ہوئے اور 561ھ میں وفات پائی۔ آپ کی شہرۂ آفاق تصانیف 'غنیۃ الطالبین' اور 'فتوح الغیب' اپنا نعم البدل نہیں رکھتیں۔ چشتیہ سلسلہ کے بانی حضرت خواجہ معین الدّین اجمیریؒ اور سہروردیہ سلسلہ کے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ بھی آپ کے فیض یافتگانِ صحبت میں شامل ہیں۔ آپ کا مزارِ مبارک بغداد (عراق) میں ہر خاص و عام کی زیارت گاہ ہے۔ آپ کا سلسلۂ نسب والد ماجد سیّد ابی صالح محمد موسیٰؒ کی طرف سے حضرت امام حسن علیہ السلام اور والدہ ماجدہ سیّدہ اُم الخیرہ فاطمہ کی طرف سے

حضرت امام حسین علیہ السلام سے جا ملتا ہے جو نواسۂ رسول ہیں، اس لیے ہم ''حسنی الحسینی سید'' کہلاتے ہیں۔

حضرت شیخ بندگی محمد غوث گیلانی 833ء میں حلب (شام) میں پیدا ہوئے۔ آپؒ نے تحصیلِ علم کی غرض سے خراسان، ترکستان، ایران اور عرب ممالک کا سفر کیا۔ ہندوستان کے سفر کے دوران لاہور اور ناگور میں بھی کچھ عرصہ قیام فرمایا اور والد کی وفات کے بعد آپ خراسان کے راستے ہندوستان تشریف لائے اور آخر کار 877ھ میں اُوچ میں سکونت پذیر ہوئے۔ 923ھ میں اُوچ میں واصل بحق ہوئے اور وہیں مدفون ہیں۔ آپؒ اور آپؒ کے خاندان کے مریدوں، خلیفوں اور عقیدت مندوں میں شاہ دہلی سلطان سکندر لودھی، حاکم سندھ سلطان حسین مرزا، شیر شاہ سوری، سلطان قطب الدّین لنگاہ، بادشاہ ہند ہمایوں، حاکمِ ملتان نواب میراں، شیر شاہ ملتانی، شیخ داوَد بندگی کرمانی کے علاوہ شمالی ہندوستان، افغانستان اور سندھ میں بھی مریدین کی کثیر تعداد ہے۔

حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ نے قرآنِ مجید کم عمری ہی میں حفظ کرلیا اور جملہ دینی علوم سے فارغ التحصیل ہونے پر آپؒ کے والدِ گرامی نے آپ کو اپنا جانشیں مقرر فرمایا اور ساتھ ہی اپنا خاص خرقہ مبارک، سجادہ اور انگوٹھی عطا فرمائی۔ والد کی وفات کے بعد آپؒ کے بڑے بھائی سید نظام الدّین عبدالقادر ثالثؒ نے آپ کی جانشینی پر اعتراض اٹھایا تو اس معاملے کو دربارِ شاہی میں لے جایا گیا۔ مغل شہنشاہ جلال الدّین اکبر نے ان بزرگوں کو فتح پور سیکری مدعو کیا اور علمائے قضاۃ اور رُوسائے دربار کو تحقیق و تفتیش پر مامور کیا۔ قرآن مجید کے حکم کے مطابق مجلس شوریٰ بلائی گئی اور اراکینِ مجلسِ شوریٰ نے فیصلہ حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ کے حق میں لکھ کر دربار میں پیش کر دیا۔ مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر نے مصلحتاً عبدالقادر ثالث کو اپنے پاس رکھا اور حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ کو لشکر کے ساتھ دکن بھیج دیا۔ دکن کی مہم سے فارغ ہو کر آپ آگرہ آئے تو بادشاہ نے پانصدی کا عہدہ عطا کر کے نہایت عزت و احترام سے رخصت کیا اور آپؒ دہلی تشریف لے آئے۔ دہلی میں بہت سے لوگ آپ کے مرید ہوئے جن میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی قابلِ ذکر ہیں۔

دہلی میں رشد و ہدایت کی شمعیں روشن کرنے کے بعد آپؒ اُوچ کی جانب روانہ ہوئے اور اپنے والد ماجد کی مسند پر بیٹھ کر دین کی تبلیغ و تلقین شروع کی۔ آپؒ 1010ھ میں قزاقوں کے

ہاتھوں شہید ہوئے اور اُوچ میں دفن ہوئے۔ آپؒ کے جسدِ مبارک کو وہاں سے نکلوا کر ملتان کے قریب موضع منگے ہٹی میں امانتاً دفن کیا گیا۔ پندرہ سال بعد آپؒ کے جسدِ مبارک کو ملتان منتقل کیا گیا۔ روایت کے مطابق جب جسدِ مبارک کو وہاں سے نکال کر ملتان لایا گیا تو وہ صحیح حالت میں تھا اور کسی قسم کا کوئی نقصان واقع نہ ہوا تھا۔ تابوت دستیاب نہ ہو سکا، اس لیے جسدِ مبارک کو گھوڑے پر سوار کروا کے ملتان لایا گیا۔ لوگ دیکھ کر بے حد متعجب اور معتقد ہوئے۔ حضورؒ کے جسدِ اطہر کو اس روضۂ پاک میں دفن کیا گیا جہاں آج بھی آپؒ کا مزار واقع ملتان ہر خاص و عام کے لیے مرجع وخلائق ہے۔ آپ کی تصنیف 'تیسیر الشاغلین' ایک اہم علمی یادگار ہے۔

مدینتہ الاولیاء ملتان برصغیر کا قدیم ترین شہر ہے۔ اس کی تاریخ ہزاروں سالوں پر محیط ہے۔ اس بنا پر بحیثیت شہر ملتان کی قریب ترین مماثلت دمشق سے ہے۔ دونوں ہزاروں سالوں سے بغیر انقطاع کے زندہ و آباد ہیں۔ شہر کے محل وقوع کی خاص بات پنجاب کے پانچ دریاؤں کا سنگم ہے۔ جس نے ملتان کو برصغیر میں ایک تجارتی مرکز اور بحیرۂ عرب سے زمینی و دریائی رابطے کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے ملتان پاکستان کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔

وسط ایشیا سے ہندوستان کے راستے میں ہونے کے سبب ملتان نے کئی جنگوں کا سامنا کیا۔ یہاں ایک ہزار سال سے زائد عرصے تک ہندو راج رہا۔ جب سکندر اعظم ملتان آیا اور اس کی فوجوں نے اسے میدانِ جنگ میں زخمی اور بے ہوشی کی حالت میں دیکھا تو تمام شہر میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا۔ پانچویں صدی کے وسط میں Nomads نے Tozman کی سربراہی میں حملہ کر کے شہر پر قبضہ کر لیا مگر وہ یہاں قیام پذیر نہ ہوئے۔ ان کے جانے کے بعد ہندو راج قائم ہو گیا۔ ہندو دور میں یہاں بڑے بڑے مندر بنائے گئے جن میں بہت زیادہ مال و زر جمع کیا گیا۔ اسی وجہ سے ملتان سونے کا شہر "City of Gold" مشہور ہو گیا۔ ملتان میں واقع سورج مندر برصغیر میں سب سے بڑا اور مال و زر سے بھرا ہوا تھا۔ تاریخ دانوں کے مطابق اس مندر میں چھ ہزار سے زائد لوگ رہتے تھے۔ اس وقت سورج کنڈ "Pool of the sun" اور مندر پرہاد پوری بھی مشہور تھے۔

ساتویں صدی میں پہلی مرتبہ صلیب کی سپہ سالاری میں مسلم افواج نے ہندوستان پر لشکر کشی کی۔ انہوں نے فارس 'Persia' سے یہاں کئی حملے کیے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کے چند

دہائیوں بعد عرب سپہ سالار محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اور ملتان تک آیا۔ اس نے 712ء میں یہاں مسلم حکومت قائم کر کے ملتان کو سندھ میں شامل کرلیا۔ اس طرح ملتان ایک آزاد ریاست بن گئی۔ نئی صدی کے آغاز پر بت شکن مسلمان سپہ سالار محمود غزنوی نے ملتان پر دو مرتبہ حملہ کیا اور سورج مندر کو تباہ کردیا۔ اس کے بعد محمد غوری نے ہندوستان میں فتوحات حاصل کیں اور دہلی کو اپنا دارالخلافہ بنا کر ملتان کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ جس سے منگولوں نے اسے آزادی دلوائی۔ مغلوں کے دور میں دوسو سال تک ملتان میں امن رہا تو ملتان 'دارالامن' مشہور ہوگیا۔

ملتان کے حکمران گورنر نواب علی محمد خان خاکوانی نے اپنے دور میں یہاں تعمیرات اور زراعت کو ترقی دی۔ 1757ء میں اس نے مشہور مسجد 'ولی محمد خاں' تعمیر کروائی۔ جو اب بھی موجود ہے۔ مغلوں کے دور کے اختتام پر پستون سدوزئی ملتان کا حکمران تھا۔ اُسی دور میں سکھ مسلم فسادات شروع ہوئے۔ سکھ انتہا پسندوں نے بھنگی مسل سنگھ کی سربراہی میں ملتان کے خلاف تحریک کا آغاز کیا۔ سردار ہری سنگھ بھنگی نے ہیرا سنگھ کے ساتھ مل کر 1763ء میں ملتان اور اس کے مضافات میں حملہ کر کے لوٹ مار کی۔ مسلمانوں کے گھر جلا دیے اور مسجدوں کو مسمار کردیا۔ اس کے بیٹوں جھنڈا سنگھ اور گنڈا سنگھ نے 1764ء میں دوبارہ حملہ کر کے لوٹ مار کی مگر قلعہ ملتان پر قبضہ کرنے میں ناکام رہے۔ اُس وقت کے حکمران مظفر خاں سدوزئی سے لاکھوں روپے تاوان وصول کر کے واپس ہوگئے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں سکھ حکمران رنجیت سنگھ نے سدوزئی کو شکست دے کر قتل کردیا۔ سدوزئی کی موت دراصل مسلمانوں کے اقتدار کی موت تھی۔ اُس کے بعد دیوان ساون مل نے اقتدار سنبھالا۔ وہ اپنے دور کا قابل اور طاقتور حکمران تھا۔ وہ بادشاہِ وقت کے لیے دھمکی بن گیا تھا۔ اُس نے بہت دولت جمع کر رکھی تھی۔ اُس کے مرنے کے بعد اُس کا بیٹا ملراج گورنر ملتان بنا مگر قتل کردیا گیا۔ اِس طرح ملتان میں سکھ راج کا خاتمہ ہوا۔ ایک طویل اور خون خرابے سے بھرپور جنگ کے بعد 22 جنوری 1849ء میں ملتان پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ انگریز سرکار نے دیوان ساون مل کے دوسرے بیٹے کو اپنے دور میں رائے بہادر اور سر کے خطاب سے نوازا۔ 1947ء میں تقسیم ہندوپاک کے بعد ملتان صوبۂ 'پنجاب' پاکستان میں شامل ہوا۔

مغل شہنشاہ' امیر تیمور نے اپنے دورِ حکومت میں ثقافت اور فنِ تعمیر کے انمٹ نقوش

چھوڑے تھے۔ جو آج بھی ہر سیاح کو سمرقند' بخارا اور ملتان کا دورہ کرتے وقت دکھائی دیتے ہیں۔ ان شہروں کے طرزِ تعمیر میں مشابہت اور مماثلت ہر لحاظ سے عیاں ہے۔ یہاں تک کہ سفید اور نیلے رنگ کی ٹائیلوں پر قاشی کا کام ان تینوں شہروں کے مقبروں اور مسجدوں کے میناروں کی تعمیر میں حیرت انگیز طور پر مشابہت اور ثقافتی ہم آہنگی کا آئینہ دار ہے جبکہ ان تینوں شہروں کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ ہے۔ قاشی فن کا ہم پلہ کام یورپ میں 'Deftiblue Pottery of Holland' کہلاتا ہے۔

برصغیر میں ملتان اور اُوچ اپنی عظمتِ رفتہ اور اسلامی تاریخ کے اعتبار سے خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان شہروں کی قدامت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ملتان کے قدیم قلعہ (ابن قاسم باغ) کی غاروں سے برآمد ہونے والی ٹھیکریوں پر کنندہ رسم الخط' ہڑپہ' اُوچ اور موہنجوداڑو کی عمارتوں میں استعمال ہونے والے مسالے Bitucman کے اجزاء ایک ہی دور کی تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان شہروں کی تاریخی قدامت سے قطع نظر ان کی آبادیوں میں سلسلۂ قادریہ کے ایسے بزرگان کے نقوشِ پا ثبت ہیں جن کی ضیاء باریوں سے ایک دنیا جگ مگا رہی ہے۔

یہاں کی علاقائی زبان سرائیکی ہے جس پر سندھی زبان کا گہرا اثر ہے۔ اس کے ذخیرۂ الفاظ میں کثرت سندھی الفاظ کی ہے۔ اس زبان کے لہجے میں وہی مٹھاس ہے جو اس کی سرزمین ملتان میں پائی جاتی ہے جو کبھی سندھ کا دارالخلافہ ہوا کرتا تھا۔ سرائیکی کا لفظ سندھی زبان سے نکلا ہے۔ سر کے لغوی معنی جسم کے مرکزی حصے کے ہیں، سرائیکی زبان سندھ کے بالائی حصے میں بھی بولی جاتی ہے۔ اسی مناسبت سے سرائیکی زبان کو ملتان میں ملتانی اور ملحقہ ریاست بہاولپور* میں ریاستی زبان کہا جاتا ہے۔

بلاشبہ سرائیکی زبان برصغیر کی سب سے میٹھی اور نفیس زبان ہے۔ یہ زبان پاکستان کے چاروں صوبوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہے کہ ملتان کی تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی اقدار کا پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتون تہذیب و ثقافت پر گہرا اثر ہے۔

حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ کا مزار شہرِ فصیل کے جنوبی حصے میں واقعہ ہے۔ جس

* 1954ء سے قبل بہاولپور خودمختار ریاست تھی۔

دروازے سے جسدِ مبارک کوشہر کے اندر لے جایا گیا وہ 'پاک دروازہ' کے نام سے مشہور ہوگیا، اس دروازے کو اُس وقت سے اسی نام سے موسوم کیا گیا ہے جب سے اس کے اندر یہ مقبرہ تعمیر کیا گیا ہے اور اس سے ملحقہ دروازہ جس میں جسدِ مبارک کے ساتھ آنے والے قافلے کی خواتین داخل ہوئیں اس کا نام اسی دن سے 'حرم دروازہ' مشہور ہوگیا۔

حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ کے چار بیٹے تھے:

(۱) سیّد حامد گنج بخش ثانی گیلانی (آپ کا مزار، دربار پیر پیراں موسیٰ پاک شہیدؒ، ملتان میں واقع ہے)۔

(۲) سیّد جان محمد گیلانی (آپ کا مزار دہلی میں اور اولاد آگرہ میں آباد ہے)۔

(۳) سیّد عیسیٰ گیلانی المعروف پیر عنایت ولائیت (آپ کا مزار بالمقابل حرم دروازہ، ملتان میں ہے)۔

(۴) سیّد یحییٰ گیلانی المعروف پیر سخی نواب (آپ کا مزار کھلے گنبد والا، حرم دروازہ اور پاک دروازہ ملتان کے درمیان واقع ہے) آپ مغل شہنشاہ شاہجہاں کے دورِ حکومت میں گورنر ملتان رہے۔

آپ کی ایک وجہ شہرت سخاوت بھی تھی اور لوگوں نے آپ کو 'سخی نواب' کا لقب دے رکھا تھا۔

حضرت موسیٰ پاک شہیدؒ کی وفات پر آپؒ کے بڑے بیٹے حامد گنج بخش ثانی گیلانی المعروف شیخ حامدؒ نے ملتان میں مستقل سکونت اختیار کی اور درگاہ عالیہ حضرت پیر پیراں موسیٰ پاک شہیدؒ ملتان کے سجادہ نشیں مقرر ہوئے۔ آپ کی تمام عمر درس و تدریس اور ہدایتِ خلق میں بسر ہوئی۔ آپ کے بعد آپ کے فرزند حضرت نواب موسیٰ پاک دین المعروف شیخ موسیٰؒ سجادہ نشیں قرار پائے۔ حضرت موسیٰ پاک دین علم و فضل میں یکتا ہونے کے علاوہ روحانیت میں بھی اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔

شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر جب اپنے بھائیوں کے ساتھ تخت کے حصول کی جنگ میں مصروف تھے، اُس وقت شیخ موسیٰ صوبہ ملتان کے دیوان اور پیش کار (گورنر) تھے۔ شہنشاہ اورنگزیب جب اپنے بھائی دارا شکوہ کی تلاش میں لشکر کے ساتھ ملتان پہنچے تو اس سے پہلے ہی دارا

شکوہ بھکر کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔شہنشاہ اورنگزیب نے شیخ موسیٰؒ (دیوان) سے دارا شکوہ کے بارے میں یوں دریافت کیا کہ دارا بے شکوہ (دارا بے حیثیت) کہاں ہے؟ شیخ موسیٰ نے جرأت سے اُن کے اس سوال کا جواب دیا کہ دارا با شکوہ (دارا با حیثیت) اگر یہاں ہوتے تو وہ میری داڑھی کو میرے اپنے ہی خون سے سرخ ہوئی دیکھتے۔شہنشاہ اورنگزیب اپنی بات کی اس گستاخانہ جرأت سے تردید پر سیخ پا ہوئے اور شیخ موسیٰ کو فوری طور پر اُن کے عہدے سے معزول کر دیا۔

اُس دن سے آج تک حضرت پیر پیراں موسیٰ پاک شہیدؒ کے سجادہ نشیں نے نہ کسی قسم کے دنیاوی عہدے کو قبول کیا اور نہ ہی سیاست میں آئے یا کسی انتخاب میں حصہ لیا۔

میری پیدائش سے قبل میرے پر دادا پیر سیّد محمد صدرالدّین شاہ گیلانی، اُن کے بھائی مخدوم سیّد راجن بخش گیلانی، پردادا کے بیٹے مخدوم سیّد غلام مصطفیٰ شاہ گیلانی (میرے دادا)، مخدوم زادہ سیّد محمد رضا شاہ گیلانی اور پیر سیّد مختار حسین شاہ گیلانی اس دارِفانی سے کوچ کر چکے تھے مگر وہ اعلیٰ روایات، تدبر اور اخلاقیات کے ایسے انمٹ نقوش چھوڑ گئے جو ہمارے لیے آج بھی مشعلِ راہ ہیں۔

پردادا پیر صدرالدّین شاہؒ کی پیدائش 1868ء میں ہوئی اور 1878ء میں اپنے والد پیر سیّد ولائیت حسین شاہ گیلانی کی وفات کے بعد آپؒ نے دس سال کی عمر میں سجادگی کی اہم ذمہ داریاں سنبھالیں۔آپؒ کے زمانے میں لیفٹنٹ گورنر سر لوئیس ڈین اور اُن کی اہلیہ لیڈی ڈین نے 1906ء میں دربارِ عالیہ پر حاضری دی۔ چیف جج پنجاب چیف کورٹ سر آرتھر ریڈ اور اُن کی اہلیہ لیڈی ریڈ نے بھی دربارِ عالیہ پر حاضری دی۔آپؒ 1910ء میں شہنشاہِ برطانیہ جارج پنجم کی تاج پوشی کے موقعہ پر دہلی میں بحیثیت روحانی سردار اور رئیسِ پنجاب مدعو کیے گئے۔شہنشاہِ برطانیہ نے 16/دسمبر 1911ء کو آپؒ سے مسلمانوں کے روحانی سردار ہونے کی وجہ سے ملاقات کی۔آپ کی فیوض و برکات اور حکمت و دانائی سے خاندان کا وقار مزید بلند ہوا۔مسلم، ہندو، سکھ اور عیسائی سب انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔آپ کی اولاد میں سیّد غلام یٰسین شاہ گیلانی، سیّد غلام مصطفیٰ شاہ گیلانی، سیّد محمد رضا شاہ گیلانی اور سیّد مختار حسین شاہ گیلانی شامل ہیں۔

پیر صدرالدّین شاہ گیلانی کے بھائی مخدوم سیّد محمد راجن بخش گیلانی 1878ء میں پیدا ہوئے۔آپ کی عمر ابھی چھ ماہ تھی جب آپ کے والد وفات پا گئے۔آپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد

سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا اور 1903ء سے لے کر زندگی بھر یعنی تینتیس سال بلا مقابلہ میونسپل کمیٹی، ملتان کے رکن منتخب ہوتے رہے۔ آپ 1913ء میں میونسپل کمیٹی' ملتان کے وائس پریذیڈنٹ منتخب ہوئے جبکہ 1916ء میں قانون ساز کونسل (Legislative Council) کے رکن منتخب ہوئے۔ آپ قائدِ اعظمؒ کی انڈیپنڈنٹ پارٹی سے بھی منسلک رہے۔ آپ کی سر فضلِ حسین سے مسلمانوں کی ترقی اور فلاح کے لیے مکمل ہم آہنگی تھی۔ دونوں رہنماؤں نے 1917ء میں وائسرائے ہند اور سیکرٹری سٹیٹ سے ملاقات کر کے انہیں مسلمانوں کے مطالبات سے آگاہ کیا۔ آپ نے 1921ء میں حکومتِ برطانیہ کے نمائندے ڈپٹی کمشنر سر سی کنگ کو میونسپل کمیٹی، ملتان کے انتخابات میں شکست دی اور پہلے غیر سرکاری مسلمان پریذیڈنٹ (میئر) منتخب ہوئے۔ اسی سال جب جدید اصلاحات شروع ہوئیں تو آپ چار اضلاع ملتان، مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خان اور منٹگمری (ساہیوال) سے ہندوستان کی قانون ساز اسمبلی* کے بلا مقابلہ رکن منتخب ہوئے اور پھر زندگی بھر بلا مقابلہ منتخب ہوتے رہے جس کی وجہ سے آپ کو متحدہ ہندوستان کی لجسلیٹو اسمبلی میں ''بابائے اسمبلی'' کہا جاتا تھا۔ انہوں نے 'تحریکِ خلافت' میں اہم کردار ادا کیا۔ اُن کی وفات 3/ اپریل 1936ء بروز جمعتہ المبارک 10 محرم الحرام کو ہوئی۔ اُن کی تدفین کے موقعہ پر پیر صدرالدّین شاہ گیلانی نے دعا کی کہ اُن کی وفات بھی دس محرم الحرام کو ہو۔ دس سال بعد دس محرم الحرام کو اُن کی وفات ہوئی۔ اسی لیے دونوں بھائیوں کی تقریب برسی ایک ہی دن منعقد کی جاتی ہے۔

مخدوم سیّد شیر شاہ گیلانی (پیر صدرالدین شاہ گیلانی کے بھائی) 1898ء میں عدلیہ سے منسلک ہو کر 1932ء میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے عہدے سے ریاست ٹونک علاقہ راجپوتانہ سے ریٹائر ہوئے اور 1939ء میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ 1945ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کی طرف سے حصہ لے کر سنٹرل اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ آپ نے 25/ جنوری 1947ء کو عیدگاہ باغ، ملتان میں برسرِ اقتدار یونینسٹ پارٹی کے خلاف جلسہ کیا جس کی پاداش میں آپ کو دیگر ساتھیوں سمیت پابندِ سلاسل کر دیا گیا۔ یونینسٹ پارٹی کے خاتمہ پر آپ کو تمام ورکروں سمیت رہا کر دیا گیا۔

---

* Indian Legislative Assembly (ILA)

فدائے ملّت سیّد زین العابدین گیلانی، پیر صدرالدّین شاہ گیلانی کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔آپ 1878ء میں پیدا ہوئے۔تعلیم حاصل کرنے کے بعد نائب تحصیلدار تعینات ہوئے مگر'تحریکِ خلافت' کے دوران سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ مل کر تحریک کے لیے کام کیا۔آپ نے ملتان میں 'تحریکِ خلافت' کی بنیاد رکھی اور اس تحریک کے صدر منتخب ہوئے۔ آپ نے 3/دسمبر 1919ء میں امرتسر میں منعقدہ خلافت کمیٹی، جمعیت علماءِ ہند، احرار پارٹی، کانگریس پارٹی اور مسلم لیگ کے عوامی اجلاس میں عبدالکریم قاصف، عبدالقادر صدیقی، عبدالراشد صدیقی، بیرسٹر مولانا صدیق بابر، غلام قادر خان بابر، قاضی حکیم اللہ بخش اور دیگر ساتھیوں سمیت شرکت کی۔1926ء میں آپ نے اپنا ہفتہ وار اخبار 'قومی ترجمان' نکالا۔آپ کی قیادت میں 1931ء میں 'انجمنِ فدایانِ اسلام' کی تشکیل ملتان میں ہوئی جس کے پلیٹ فارم سے آپ نے مسلمانوں کی بہبود و ترقی کے لیے کاوشیں کیں۔آپ کی مقبولیت سے متاثر ہو کر کانگریس کے صدر سبھاش چندر بوس نے 1938ء میں ملتان کا دورہ کیا اور آپ کو کانگریس میں شمولیت کی دعوت دی مگر آپ نے معذرت کر لی۔آپ نے 1939ء میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور مسلم لیگ ضلع ملتان کے صدر منتخب ہوئے اور 'انجمنِ فدایانِ اسلام' کو بھی مسلم لیگ میں ضم کر دیا۔1940ء میں آپ کو قائدِ اعظمؒ نے مسلم لیگ کی سنٹرل ورکنگ کمیٹی (مرکزی مجلسِ عاملہ) کا رکن نامزد کیا۔'تحریکِ مسجدِ شہید گنج' اور 'تحریکِ کشمیر' میں آپ نے بے مثال خدمات سرانجام دیں۔آپ کو ملتان کا 'بے تاج بادشاہ' کہا جاتا تھا۔آپ کی باقاعدگی سے ہر سال رسم تاج پوشی کی جاتی تھی جس میں سجادہ نشیں دربار موسیٰ پاک شہیدؒ پیر صدرالدّین شاہ گیلانی آپ کو تاج پہنایا کرتے تھے۔ 23/مارچ 1940ء میں تاریخی 'قراردادِ پاکستان' منظور کرنے کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا جس میں آپ کی قیادت میں مخدوم علمدار حسین گیلانی (میرے والد)، سیّد علی حسین گردیزی، خواجہ عبدالکریم قاصف اور محمد بخش کپتان پر مشتمل وفد شامل ہوا اور 'قراردادِ پاکستان' پر دستخط کیے۔آپ کو 1944ء میں صوبائی مجلسِ عاملہ کا رکن بھی نامزد کیا گیا۔آپ 1945ء میں مسلم لیگ ضلع ملتان کے صدر منتخب ہوئے۔ 14 اور 15 اگست 1947ء کی درمیانی شب آپ ہی کے دستِ مبارک سے ملتان کی تمام اہم سرکاری عمارات پر قومی پرچم لہرائے گئے۔

دادا مخدوم غلام مصطفیٰ شاہ کے بڑے بھائی مخدوم سیّد غلام یٰسین شاہ گیلانی 1918ء سے 1922ء تک آنریری مجسٹریٹ رہے جبکہ 1918ء سے 1938ء تک میونسپل کمیٹی، ملتان کے رکن رہے اور مخدوم راجن بخش گیلانی کی وفات کے بعد پریذیڈنٹ (میئر) میونسپل کمیٹی' ملتان منتخب ہوئے۔

دادا مخدوم غلام مصطفیٰ شاہ حلیم و بردبار شخصیت کے حامل تھے۔ سول سروس سے ریٹائر ہونے کے بعد 1946ء کے عام انتخابات میں تحصیل لودھراں (اَب ضلع کا درجہ دیا جاچکا ہے) سے مسلم لیگ کی ٹکٹ پر انتخاب میں حصہ لیتے ہوئے یونینسٹ پارٹی کے اُمیدوار سیّد سردار شاہ کو شکست دی۔ بعد اَزاں اپنے والد کی رحلت کے بعد تین سال سجادہ نشیں دربار پیر پیراں موسیٰ پاک شہید'' رہے۔ وہ سجادہ نشینی سے پہلے ہی ایم ایل اے * تھے گو بیک وقت سجادہ نشینی اور سیاست ہمارے خاندان سے متروک کردی گئی تھی تاہم تقسیمِ ہند اور مسلمانوں کی سیاسی و سماجی زبوں حالی آبا و اجداد کے اس فیصلے کے آڑے آئی۔ اُن کا انتقال 1949ء میں ہوا۔

مخدوم غلام مصطفیٰ شاہ کے چھوٹے بھائی مخدوم زادہ محمد رضا شاہ گیلانی نے ایچی سن چیفس کالج، لاہور سے ریواز گولڈ میڈل * حاصل کیا۔ آپ متعدد بار ایم ایل اے منتخب ہوئے۔ آپ نے 'تحریکِ خلافت' میں اہم کردار ادا کیا۔ 1921ء میں پنجاب کی لجسلیٹو کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ آپ ملتان ڈسٹرکٹ بورڈ کے رکن بھی تھے اور 1931ء میں سینئر وائس پریذیڈنٹ منتخب کیے گئے۔ آپ نے 1934ء میں ملتان کے اس وقت کے ڈپٹی کمشنر ای پی مون کو شکست دی جس وقت انگریزوں کا راج تھا۔ ڈپٹی کمشنر نے نہ صرف show of hands کا طریقہءِ انتخاب استعمال کیا بلکہ چند اَراکین کی نامزدگیاں بھی کیں مگر اس کے باوجود مخدوم زادہ بھاری اکثریت سے غیر سرکاری پریذیڈنٹ ڈسٹرکٹ بورڈ، ملتان منتخب ہوگئے اور تاحیات اس عہدے پر فائز رہے۔ انہیں 1944ء میں مسلم لیگ ملتان ڈویژن کی آرگنائزنگ کمیٹی کا صدر منتخب کیا گیا۔ آپ نے 1946ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر تحصیل شجاع آباد سے انتخاب میں حصہ لیا اور اپنے مدِ مقابل

استفادہ از: مرقع ملتان، غنیۃ الطالبین، خطہء پاک اوچ، اخبار الاخیار، ملتان کی ادبی وتہذیبی زندگی میں صوفیائے کرام کا حصہ، تاریخ ملتان۔

* Member Legislative Assembly (MLA)

* 'Riwaz' Gold Medal - Best School Leaving Boy

یونینسٹ پارٹی کے اُمیدوار نواب مخدوم مرید حسین قریشی (مخدوم سجاد حسین قریشی جو بعد میں گورنر پنجاب بھی رہے کے والد) کو شکست دی۔ انہوں نے اپنے کردار، محنت اور لگن کی بدولت بڑی شہرت پائی۔ اُن کے نام سے منسوب 'رضا ہال' آج بھی ملتان کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ اُن کی بیعت اپنے چھوٹے بھائی پیر مختار حسین شاہ سے تھی۔ اُن کی وفات 7/مارچ 1949ء میں ہوئی۔

مخدوم زادہ محمد رضا شاہ کے بعد تایا سیّد ولائیت حسین گیلانی ایم ایل اے و چیئرمین ڈسٹرکٹ بورڈ، ملتان منتخب ہوئے۔ تایا ولائیت حسین کی شادی سر مہدی شاہ آف گوجرہ کے خاندان میں ہوئی۔ سر مہدی شاہ کے بزرگوں کا تعلق دربار سخی سلطان ملائی تولا، اٹک سے ہے۔ انہوں نے 1926ء میں کونسل آف سٹیٹ، ہندوستان کے انتخاب میں ملکہ برطانیہ کے اے ڈی سی سر عمر حیات ٹوانہ کو شکست دی۔ اسی سال وائسرائے ہند لارڈ ریڈنگ نے اُن کے گاؤں مہدی آباد گوجرہ، لائل پور (فیصل آباد) کا دورہ کیا۔

میرے والد 12/دسمبر 1919ء بمطابق آٹھ محرم الحرام اپنے آبائی گھر واقع پاک دوازہ ملتان میں پیدا ہوئے۔ پیدائش کے وقت اُن کا نام سید ابوالحسن شاہ رکھا گیا لیکن آٹھ محرم الحرام کی نسبت سے بعد میں علمدار حسین رکھ دیا گیا اور یہی نام معروف ہوا۔ ہمارا گھرانہ سنی شیعہ اتحاد کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ حسب روایت دس محرم الحرام کے موقع پر جب تعزیوں کے ساتھ چلنے کے لیے تایا مخدوم شوکت حسین نکلے تو مخالف حکومت نے روکا کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر جلوس میں نہ آئیں۔ سرکاری رکاوٹوں کے باعث تایا باہر نہ آئے، جس کی وجہ سے ملتان شہر کے تمام تعزیے رُک گئے اور حالات اتنے کشیدہ ہو گئے کہ انتظامیہ امن و امان قائم رکھنے کے لیے اُن کی منت سماجت کر کے جلوس میں لے آئی۔ اس طرح تعزیے روانہ ہوئے، یہ رسم آج بھی جاری ہے۔

والد نے ابتدائی تعلیم ملتان اور مظفر گڑھ میں حاصل کی کیونکہ دادا اُن دنوں سَب ڈویژنل مجسٹریٹ علی پور، مظفر گڑھ تعینات تھے۔ نوابزادہ نصراللہ خان والد کے کلاس فیلو تھے۔ والد نے 1941ء میں ایمرسن کالج ملتان سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ وہ خاندان کے دوسرے فرد تھے جنہوں نے بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ پہلے فرد مخدوم راجن بخش گیلانی کے بڑے بیٹے اور والد کے چچا مخدوم غلام محی الدین شاہ گیلانی تھے جنہوں نے گورنمنٹ کالج، لاہور سے 1927ء

میں بی اے پاس کیا، بعد ازاں وہ سول سروس میں رہے اور بطورِ سیکرٹری مغربی پاکستان ریٹائر ہوئے۔

والد نے اپنے زمانۂ طالب علمی ہی سے سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا اور مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ جب وہ ایف اے کے طالب علم تھے تو انہوں نے اپنے بزرگ سیّد زین العابدین شاہ اور مسلم لیگ ضلع ملتان کے صدر، چچا مخدوم غلام نبی شاہ کے ساتھ مل کر مسلم لیگ کے لیے کام کیا۔

مخدوم غلام نبی شاہ نے 'تحریکِ پاکستان' کے دوران مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور ملتان کے دیہی علاقوں میں مسلم لیگ کو متعارف کروانے اور فعال بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہیں 14 / اگست 1942ء کو مسلم لیگ، ملتان شہر کا صدر منتخب کیا گیا۔ آپ 1949ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ آپ کو 1944ء میں مسلم لیگ کی صوبائی مجلسِ عاملہ کا رکن نامزد کیا گیا۔

پیر صدر الدّین شاہ گیلانی 1946ء میں چچا سیّد رحمت حسین کی منگنی کے سلسلے میں مخدوم الملک سیّد غلام میراں شاہ گیلانی کے ہاں جمال الدین والی، ضلع رحیم یار خان گئے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو مخدوم الملک نے خواہش ظاہر کی کہ ان کی والدہ اور دو بیٹیوں سے بیعت لیں۔ اس طرح یہ خواتین پردادا کے ہاتھ پر بیعت ہوئیں اور بعد میں اُن کی بیٹیوں میں سے ایک کی شادی 1948ء میں میرے والد اور دوسری کی شادی اُسی روز چچا رحمت حسین سے ہوئی، یوں اُن کی یہ دونوں بیٹیاں میری والدہ اور خالہ بنیں۔ اُن کی تیسری بیٹی اُس وقت نوعمر تھیں، بعد میں اُن کی شادی پیر صاحب پگاڑو سے ہوئی۔ والدہ کو شادی کے بعد آبائی گھر واقع پاک دروازہ میں لایا گیا۔ بڑی پھوپھی (جو بڑی بی بی کے نام سے موسوم تھیں، زُہد و تقویٰ اور پرہیز گاری میں اتنی مشہور تھیں کہ ملتان میں شاید ہی کوئی ایسا گھر ہو جس نے ان سے فیض نہ پایا ہو، ساتھ ہی وہ صاحبِ ثروت بھی تھیں) نے والد اور چچا رحمت حسین کو قائل کیا کہ آپ دونوں کی دُلہنیں بڑے گھرانوں سے ہیں اور انہوں نے محلات میں پرورش پائی ہے، لہٰذا انہیں الجیلان روڈ پر واقع گھر 'الجیلان' لے جائیں اور وہیں رہائش پذیر ہوں۔ یہ گھر آدھ مربع رقبہ پر محیط پھوپھی کی اپنی ملکیت تھا سو، والد اور چچا رحمت حسین اس گھر میں منتقل ہو گئے۔ تایا ولائیت حسین پہلے ہی سے اُس گھر کے قریب رہائش پذیر تھے جو نئے ڈیزائن کے مطابق تعمیر ہوا تھا اور جس میں ایک تہہ خانہ تھا جو ان دنوں ایک جدّت

تھی۔

والد اس گھر 'الجیلان' کو خوش بختی اور ملتان کی سیاست کا محور سمجھتے تھے کہ اس گھر میں گورنر جنرل غلام محمد، خواجہ ناظم الدّین، وزرائے اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان، حسین شہید سہروردی، آئی آئی چندریگر اور ملک فیروز خان نون کے علاوہ محترمہ فاطمہ جناح، سردار عبدالرب نشتر اور راجہ غضنفر علی جیسی نامور شخصیات تشریف لا چکی تھیں۔ علاوہ ازیں پیر صاحب اجمیر شریف بھی اس گھر میں تشریف لا چکے تھے۔

گیلانی گروپ نے 1949ء میں میاں ممتاز محمد خان دولتانہ کے ساتھ ایک سیاسی معاہدہ کیا جو بعد میں 'گیلانی دولتانہ پیکٹ*' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس معاہدے کی تحریر مندرجہ ذیل تھی:

"ہم مندرجہ ذیل مسلمان اس کلامِ پاک پر ایمان رکھتے ہوئے عہد کرتے ہیں کہ ہم آپس میں متفق رہیں گے اور ایک دوسرے سے متفق اور وفادار رہیں گے اور گیلانی پارٹی کے اکثریت کے فیصلہ کے پابند رہیں گے۔

دستخط

ممتاز محمد دولتانہ، سیّد شوکت حسین گیلانی، نام پڑھا نہیں جاتا، محمد علمدار حسین گیلانی،
محمد انور رانا نون، فیض بخش کھوکھر، دُر محمد، اُمیر محمد شاہ،
ہیبت ڈاہا، سیّد غلام نبی گیلانی، محمد اکرم بوسن،
غلام قادر سنڈھل، نام پڑھا نہیں جاتا، غلام محمد خان، نام پڑھا نہیں جاتا، ولی ہراج،
نام پڑھا نہیں جاتا، سیّد احمد شاہ، نام پڑھا نہیں جاتا، محمد ریاض رانا،
محمد حسین 12-9-49"

ممتاز دولتانہ نے گیلانی گروپ کی اکثریت کے فیصلے کی پابندی کا حلف اٹھایا مگر اس کے برعکس انہوں نے 1951ء میں وزیرِ اعلیٰ پنجاب کا عہدہ سنبھالنے کے بعد نہ صرف گیلانی گروپ کو نظر انداز کیا بلکہ اُن کے سیاسی حریف سیّد علی حسین گردیزی کو اپنا صوبائی وزیرِ تعلیم مقرر کر دیا۔ اُن کے اس اقدام سے 'گیلانی دولتانہ پیکٹ' ختم ہو گیا۔ 1988ء کے عام انتخابات میں جب میرا مقابلہ ملتان سے اسلامی جمہوری اتحاد (آئی جے آئی) کے سربراہ/ وزیرِ اعلیٰ پنجاب میاں محمد نواز شریف سے ہو رہا تھا تو انتخابی مہم میں جسٹس (ر) سردار عبدالجبار خان نے میرے لیے ایک

* اس معاہدے کا عکس آخر میں موجود ہے۔

بڑے جلسۂ عام کا انعقاد لطف آباد، ملتان میں کیا۔ اس موقعہ پر انہوں نے 'گیلانی دولتانہ پیکٹ' سے پردہ اٹھاتے ہوئے مجھے بتایا کہ آپ کے والد مسلم لیگ ضلع ملتان کے صدر اور میں سیکرٹری تھا، میں ممتاز دولتانہ کے پاس گیا کہ آپ معاہدہ کے مطابق سیّد علمدار حسین گیلانی کو وزیر بنائیں۔ انہوں نے کہا:

"He is already an established person. I can't further establish him."

ترجمہ: وہ پہلے ہی سے مستحکم شخص ہیں۔ میں اُنہیں مزید مستحکم نہیں کر سکتا۔

ممتاز دولتانہ بمشکل ڈیڑھ برس اس منصب پر فائز رہے۔ بعد اَزاں وہ از خود مستعفی ہو گئے جس کے اسباب یہ تھے کہ پنجاب حکومت کی زرعی اصلاحات سے زمیندار طبقہ ناراض تھا اور اسی بنا پر انہوں نے حکومت کو گندم فروخت کرنے سے انکار کر دیا، نتیجتاً صوبہ بھر میں گندم کی قلت ہو گئی۔ 'مجلسِ احرار' نے اپنی کھوئی ہوئی ساکھ بحال کرنے کے لیے اُن کی حمایت کرنی شروع کر دی۔ وفاق کو کمزور کرنے کی ضِد میں وزیرِ اعلیٰ ممتاز دولتانہ در پردہ 'مجلسِ احرار' کی حمایت کر رہے تھے۔ اسی دوران 'مجلسِ احرار' نے قادیانی کافر کا نعرہ لگا دیا۔ ملک میں فسادات شروع ہو گئے۔ لاہور کی طرح کراچی اور کوئٹہ بھی لپیٹ میں آ گئے حالانکہ مسلم لیگ پنجاب پہلے ہی قادیانیوں کو کافر قرار دینے کے لیے بھاری اکثریت سے قرارداد منظور کر چکی تھی۔ لاہور میں ہنگامے اس قدر بڑھ گئے کہ جنرل اعظم کی سربراہی میں وہاں مارشل لا لگا دیا گیا۔ اس طرح دولتانہ حکومت کا خاتمہ ہوا۔ ممتاز دولتانہ کے بعد فیروز خان نون کو وزیرِ اعلیٰ پنجاب مقرر کیا گیا۔

1951ء کے عام انتخابات میں والد کے نامزد اُمیدواروں کو مسلم لیگ کے ٹکٹ دیئے گئے۔ ان انتخابات کے سلسلے میں مسلم لیگ کا کنونشن ہمارے گھر 'الجیلان' ملتان میں ہوا جس کی صدارت وزیرِ اعظم پاکستان اور صدر مسلم لیگ نوابزادہ لیاقت علی خان نے کی۔ جلسے کے دوران وزیرِ اعظم نے والد، تایا ولائیت حسین اور چچا رحمت حسین کے ہاتھ تھام کر کہا:

"They are the backbone of the Muslim League."

ترجمہ: یہ مسلم لیگ کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔

ان انتخابات میں بہت سے احباب نے گیلانی خاندان کی بھرپور امداد کی جن میں قابلِ ذکر پیر سیّد غلام محی الدین گیلانی المعروف بابو جی پیر صاحب گولڑہ شریف ہیں۔ اس سلسلے میں

انہوں نے 1951ء میں اپنے مریدوں کے لیے ایک خط * تحریر کیا جس کا مضمون یہ تھا:

"جملہ مخلصان جن کا تعلق جناب حضرت صاحب قبلہ مدظلہ کے ساتھ ہے اُن کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ جناب سیّد ولائیت حسین شاہ صاحب و دیگر برادران سیّد علمدار حسین شاہ صاحب گیلانی و رحمت حسین شاہ صاحب گیلانی کی کامیابی کے لیے خاص طور پر امداد کرتے ہوئے سعادت حاصل کریں۔

والسلام

حسب الارشاد جناب حضرت قبلہ مدظلہ

بقلم سلطان محمود بھٹی از آستانہ عالیہ گولڑہ شریف

۱۳ جمادی الاول بمطابق 20/2/51

از طرف غلام محی الدین شاہ گیلانی امروزہ گولڑہ شریف"

تایا ولائیت حسین نے مسلم لیگ کے اُمیدوار کی حیثیت سے 1951ء کے انتخابات میں حلقہ مخدوم رشید، ملتان سے آزاد اُمیدوار مخدوم سجاد حسین قریشی کو ایم ایل اے کی لوکل نشست پر شکست دی جبکہ مہاجر نشست پر مسلم لیگی اُمیدوار چوہدری محمد حنیف ایم ایل اے منتخب ہوئے۔ والد نے اسی انتخاب میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر لودھراں کی معروف شخصیت سیّد سردار شاہ (سیّد ناصر علی رضوی کے سسر) جو جناح عوامی لیگ کے اُمیدوار تھے، کو شکست دی۔ اس انتخاب میں چچا رحمت حسین نے جلال پور پیر والا (شجاع آباد) سے دیوان غلام عباس بخاری کا مقابلہ کیا مگر وسائل کی کمی کے سبب انتخابی مہم کو پُر زور انداز میں نہ چلا سکے اور انتخاب ہار گئے لیکن اُن کے مدِّ مقابل کے لیے یہ سرائیکی فقرہ زبان زدِ عام ہو گیا "جگ دا والی تے ووٹ چاہلی"۔ کیونکہ دیوان صاحب کو اپنے ہی گھر جلالپور پیر والا شہر سے صرف چالیس ووٹوں کی برتری مل سکی تھی۔

دادا مخدوم غلام مصطفےٰ شاہ انتہائی اعتماد کی وجہ سے میرے والد کو اپنا جانشین مقرر کرنا چاہتے تھے مگر والد نے خاندانی روایت کہ سجادہ نشیں سیاست میں حصہ نہیں لے گا، کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے معذرت کر لی کیونکہ وہ پہلے ہی میدانِ سیاست میں اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ تایا ولائیت

* اس خط کا عکس آخر میں موجود ہے۔

حسین بھی سیاست میں سرگرم تھے، لہٰذا خاندان نے تایا مخدوم شوکت حسین کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ تایا ولائیت حسین مضبوط اعصاب کے مالک، کھرے، نڈر اور دوستوں کے دوست تھے۔ انہوں نے بھی خلوصِ نیت سے اس فیصلے کا احترام کیا اور اپنے چھوٹے بھائی مخدوم شوکت حسین کے پاؤں چھو کر بڑائی کا ثبوت دیا۔ دادا کی وفات کے بعد، اُن کے سوتیلے بھائی مخدوم غلام یٰسین شاہ گیلانی جن کی طبیعت میں سادگی اور بھولپن تھا، سجادہ نشینی کے سوال پر خاندان سے اختلاف کر گئے۔ مخدوم غلام یٰسین شاہ نے 1951ء کے انتخابات میں دیوان غلام عباس بخاری کی مدد کی تھی، لہٰذا اس مسئلہ پر دیوان صاحب نے والد کو پیشکش کی کہ میں اُن کی آپ سے مصالحت کروا دیتا ہوں۔ والد نے دیوان صاحب کی اس تجویز سے اتفاق کیا اور نتیجتاً یہ مسئلہ خوش اسلوبی سے طے پا گیا۔ اس طرح تایا مخدوم شوکت حسین تمام خاندان کی جانب سے متفقہ طور پر سجادہ نشین مقرر ہوئے۔

تایا مخدوم شوکت حسین نے ہمیشہ والد کا ساتھ دیا اور زندگی بھر اُن کے سیاسی فیصلوں کی حمایت کی۔ اُن کی رفاقت اَنمول اور بے مثل تھی۔ انہیں 1945ء میں مسلم لیگ ضلع ملتان کا نائب صدر منتخب کیا گیا۔ اُس وقت یہ تاثر عام تھا کہ مسلم لیگ ملتان صرف گیلانی خاندان کی جماعت ہے۔ اس تاثر کو ختم کرنے کے لیے تایا نے رضاکارانہ طور پر اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ وہ 1949ء سے 1982ء تک سجادہ نشین رہے۔ دین کی شبانہ روز تبلیغ کے ساتھ ساتھ والد اور اُن کے چھوٹے بھائی سیّد فیض مصطفیٰ کے شانہ بشانہ تعلیمی میدان میں بھی انقلابی کارنامے انجام دیئے۔ اُن کے دور میں مریدوں کا حلقہ مزید وسیع ہوا۔

والد نے کئی خاندانوں کے ساتھ روایتی تعلقات کو رشتوں میں بھی بدل دیا۔ اُن کی ایک بھتیجی کی شادی سجادہ نشین درگاہ اُوچ شریف مخدوم سیّد شمس الدین گیلانی کے بڑے بیٹے سید مختار حسن گیلانی اور دوسری بھتیجی کی شادی دربار حجرہ شاہ مقیم اُوکاڑہ کے گدی نشین پیر سید اعجاز علی شاہ گیلانی سے کروائی۔ میری اور میری بہن کی شادی سجادہ نشین دربار پیر قطبیہ سندیلیانوالی پیر محل پیر سیّد اسرار حسین شاہ بخاری کی بیٹی اور بیٹے سے کروائی۔ میری بڑی بہن کی شادی اپنے بھتیجے سیّد وجاہت حسین سے کروائی جو بعد میں دربار پیر پیراں موسیٰ پاک شہیدؒ کے سجادہ نشین بنے۔

والد کا قول تھا کہ اگر کسی شخص کے ہاتھ میں شفا ہونے کے باوجود وہ کسی دوسرے شخص کو

فیض یاب نہیں کرتا تو ایسا شخص خود بدنصیب ہے۔ والد کی یادداشت کمال کی تھی۔ اُنہیں ہزاروں لوگوں کے نام زبانی یاد تھے اور جب کبھی کسی تقریب میں لوگوں کو مدعو کرنا ہوتا تو بہت ہی کم وقت میں اپنی یادداشت سے لوگوں کے نام تحریر کروا دیتے تھے۔

والد نے اپنے وزیر بننے کا واقعہ یوں سنایا کہ ایک مرتبہ میں وزیرِاعلیٰ پنجاب فیروز خان نون سے ملنے اُن کے گھر گیا کہ تمہارے نانا مخدوم الملک سیّد غلام میراں شاہ سے اچانک وہاں ملاقات ہوگئی۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کیسے تشریف لائے ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ میں سردار محمد خان لغاری (سردار فاروق احمد خان لغاری کے والد) کو صوبائی وزیر بنوانے آیا ہوں۔ مجھے یہ سن کر افسوس ہوا کہ انہیں لغاری صاحب کے علاوہ میری بھی سفارش کرنی چاہیے تھی۔ جب میری ملاقات نون صاحب سے ہوئی تو انہوں نے مجھے کہا کہ تم وزیرِاعلیٰ پنجاب ہو اور مجھے اپنی کابینہ بنا کر دو۔ میں نے کہا کہ میں وزیرِاعلیٰ نہیں ہوں، آپ ہی ہیں اور یہ استحقاق بھی آپ ہی کا ہے۔ مگر وہ بضد تھے کہ کابینہ مجھے ہی بنانی ہے۔ میں نے کابینہ کے لیے پانچ نام تجویز کیے جن میں سردار محمد خان لغاری، رانا عبدالحمید، مظفر علی قزلباش، علی اکبر خان اور شیخ مسعود صادق کے نام شامل تھے مگر جب کابینہ کا اعلان ہوا تو ایک نام کا اضافہ تھا اور وہ نام میرا تھا۔

والد نے 1953ء میں فیروز خان نون کی کابینہ میں بطورِ وزیرِ صحت و بلدیات، حلف اٹھایا۔ وزارتِ بلدیات عوام کے ساتھ رابطے اور مقامی سطح کے کام کروانے کے نکتۂ نظر سے اہم ہے۔ 1956ء میں ماموں مخدوم زادہ سیّد حسن محمود نے صوبائی وزیر مغربی پاکستان بننے پر والد سے محکمے کے متعلق مشورہ مانگا تو والد نے انہیں بھی یہی محکمہ تجویز کیا اور وہ بلدیات کے صوبائی وزیر بن گئے۔ والد نے وزیرِ صحت کی حیثیت سے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ انہوں نے کئی اضلاع میں ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال (ڈی ایچ کیو) بنوائے جن میں ملتان، میانوالی، مظفر گڑھ اور ڈیرہ غازی خان کے ہسپتال قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ نشتر ہسپتال و میڈیکل کالج ملتان کے قیام میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ میو ہسپتال لاہور اور ساملی سینی ٹوریم (ٹی بی ہسپتال) مری کی توسیع بھی ان ہی کے دور میں ہوئی۔

اس دور میں ڈاکٹروں کی بے حد کمی تھی اور دیہی علاقوں میں طبی سہولتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اس اہم انسانی مسئلے کے فوری حل کے لیے والد نے وکٹوریہ ہسپتال، بہاولپور میں ایل

ایس ایم ایف میڈیکل سکول کی بنیاد رکھی۔ میٹرک کے بعد اس سکول میں تین برس کا میڈیکل کورس کروایا جاتا تھا جس کے بعد دو برس تک دیہی علاقے میں خدمات انجام دینے کی لازمی شرط پوری کرنے پر متعلقہ امیدوار ایم بی بی ایس کے امتحان دینے کا اہل قرار پاتا تھا۔ ماموں سیّد حسن محمود اس دور میں بہاولپور ریاست کے وزیرِ اعظم تھے۔ انہوں نے اس نیک کام کے لیے تمام بنیادی ضروریات بہم پہنچائیں اور یوں ایک دردمند دل کی انقلابی سوچ نے نہ صرف دیہی علاقوں میں طبّی سہولیات مہیا کر دیں بلکہ ملک میں ڈاکٹروں کی شدید کمی دور کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ ملک میں اس سکیم کے تحت سینکڑوں ڈاکٹروں نے اپنی اعلیٰ قابلیت اور خدمات کی بدولت بڑا نام کمایا ان میں ملتان سے ہمارے فیملی ڈاکٹر محمد حسین ملک قابلِ ذکر ہیں۔ والد نے اپنے دورِ اقتدار میں عوام النّاس کو روزگار فراہم کرنے کے لیے بھی دوڑ دھوپ کی۔ بطور وزیرِ صحت انہوں نے ایم بی بی ایس میں غریب لوگوں کے بچوں کو بھی داخلہ دلوا کر ڈاکٹر بنوایا کیونکہ اس وقت میڈیکل کالج کی نامزدگی گورنر نہیں بلکہ وزیرِ صحت خود کیا کرتا تھا۔

1953ء میں والد کے پارلیمانی سیکرٹری چوہدری فضل الٰہی تھے جو بعد میں صدرِ پاکستان کے عہدے پر فائز ہوئے۔ سردار عطاء محمد خان لغاری محکمے کے سیکرٹری تھے جو بعد میں رکن صوبائی اسمبلی (ایم پی اے) پنجاب منتخب ہوئے اور سردار عاشق محمد خان مزاری محکمے کے ڈپٹی سیکرٹری تھے جو بعد میں رکن قومی اسمبلی (ایم این اے) منتخب ہوئے۔ والد کو اس حیثیت سے بھی یاد رکھا جاتا ہے کہ صوبائی وزیرِ صحت و بلدیات بننے پر 1954ء میں انہوں نے قیامِ پاکستان کے بعد پہلی مرتبہ پنجاب میں بلدیاتی انتخابات کروائے۔ انہوں نے کوشش کی کہ ہر ضلع میں ایک لائبریری ہوتا کہ عوام کی کتابوں تک رسائی ممکن بنائی جاسکے۔ اس سلسلے میں قلعہ کہنہ قاسم باغ، ملتان میں ایک وسیع میونسپل لائبریری کا افتتاح کیا جو ملتان کے لیے ایک عظیم علمی خزانہ ہے۔ والد کچھ عرصہ امپرووومنٹ ٹرسٹ (موجودہ وزارتِ ہاؤسنگ) کے صوبائی وزیر بھی رہے۔ اس وقت انہوں نے گلبرگ، لاہور اور مری کو ترقی دلانے کے لیے خصوصی طور پر دلچسپی لی جس کی وجہ سے پورے ملک سے لوگوں نے سرمایہ کاری کی اور کچھ ہی عرصے میں وہ سب سے زیادہ پُر رونق آبادیاں بن گئیں۔

والد کے سابق گورنر مغربی پاکستان نواب آف کالا باغ ملک امیر محمد خان سے دیرینہ مراسم تھے۔ نواب صاحب مقامی طور پر پیر سید لعل بادشاہ گیلانی آف مکھڈ، کیمبل

پور (اٹک) کے سیاسی حریف تھے۔ پیر صاحب کی سیاسی وابستگی ممتاز دولتانہ سے تھی۔ اُن کے بیٹے پیر صفی الدّین شاہ گیلانی وائس چیئرمین ڈسٹرکٹ بورڈ، کیمبل پور تھے۔ اُس وقت تک اُن سے میری پھوپھی کی شادی نہیں ہوئی تھی، لہٰذا والد نے بطورِ وزیرِ بلدیات اُن کے خلاف تحریکِ عدمِ اعتماد میں نواب صاحب کا ساتھ دیا۔ عدمِ اعتماد کامیاب ہوگیا۔ جب میری پھوپھی کا رشتہ پیر صفی الدّین شاہ سے ہوا تو نواب صاحب نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ کچھ عرصہ بعد بلدیاتی انتخابات میں چچا حامد رضا وائس چیئرمین ڈسٹرکٹ بورڈ، ملتان کے عہدے کے لیے اُمیدوار بن گئے۔ نواب صاحب نے والد کو کہلوا بھیجا کہ آپ اپنے چھوٹے بھائی سید رحمت حسین کو اپنا اُمیدوار بنائیں ورنہ آپ کے کزن حامد رضا کو نہیں بننے دوں گا۔ والد نے انکار کر دیا تو نواب صاحب نے ہمارے خاندان کے ساتھ تمام تر تعلقات کو پسِ پشت ڈال کر چچا حامد رضا کی نہ صرف مخالفت کی بلکہ گیلانی گروپ کے سیاسی حریف صادق حسین قریشی کو اس عہدے پر بلا مقابلہ منتخب کروا دیا جس پر والد، نواب صاحب سے ناراض ہو گئے کیونکہ اُن کے اس اقدام سے گیلانی گروپ کو سیاسی طور پر بہت نقصان پہنچا۔

نواب صاحب نے چچا حامد رضا کو قائل کیا کہ میرے پیر یعنی اپنے کزن علمدار حسین گیلانی کی مجھ سے صلح کروا دیں۔ چچا نے والد کو نواب صاحب کی دعوت پر لاہور جانے کے لیے آمادہ کیا اور ان کے ہمراہ جب ملتان ائرپورٹ پر پہنچے تو جہاز جا چکا تھا۔ ملک غلام مصطفیٰ کھر اُن دنوں قومی اسمبلی کے رکن تھے۔ انہوں نے میرے والد اور چچا کو پیشکش کی کہ میں آپ کو اپنی کار میں لاہور لے جاتا ہوں۔ انہوں نے نہایت تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے چند گھنٹوں میں 'گورنر ہاؤس' لاہور پہنچا دیا۔ والد اور چچا، نواب صاحب سے ملاقات کرنے 'گورنر ہاؤس' کے اندر چلے گئے اور کھر صاحب باہر انتظار کرتے رہے۔ اس وقت کھر صاحب کے ذہن میں بھی نہ ہوگا کہ کبھی وہ بھی اسی 'گورنر ہاؤس' میں بطور گورنر پنجاب موجود ہوں گے۔ 2005ء میں کھر صاحب جب مجھے ملنے سنٹرل جیل اڈیالہ، راولپنڈی آئے تو میں نے اُن سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو انہوں نے اس واقعہ کی تصدیق کی۔

تعلیمی میدان میں گیلانی خاندان کی بے حد خدمات ہیں۔ تایا ولائیت حسین نہ صرف بااصول سیاستدان تھے بلکہ ماہر تعلیم بھی تھے۔ انہوں نے 'انجمن اسلامیہ' ملتان کی انتظامیہ

سے ملاقات کی اوراس ادارے کی ناقص منصوبہ بندی کے بارے میں گفتگو کی۔ اس سلسلے میں 'انجمنِ اسلامیہ' کا ایک ہنگامی اجلاس 2 رجون 1933ء کوطلب کیا گیا۔اس اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ خسارے میں چلنے والے تعلیمی اداروں کی باگ ڈور تایا ولائیت حسین کے سپرد کر دی جائے۔تایا نے اس فیصلے کوبطورِ چیلنج قبول کرلیا۔اس وقت مسلمانوں کے پاس اپنا کوئی تعلیمی ادارہ نہ تھا اور دوسرے اداروں میں بھی اُنہیں داخلہ نہیں ملتا تھا۔علی گڑھ یونیورسٹی اورانجمن حمایتِ اسلام، لاہور کے بعداس قسم کےادارے کا قیام بہت بڑا کارنامہ تھا۔یہ ادارہ 1884ء میں مولوی محمد عبداللہ نے قائم کیا تھا۔

والد نے اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر'انجمن اسلامیہ' ملتان کے لیے بھرپور کام کیا۔ جس کے تحت ان کی زندگی ہی میں کئی سکولوں اور کالجوں کا قیام عمل میں آیا۔انجمنِ اسلامیہ کی چند تعلیمی یادگاریں گیلانی لاکالج ،ولائیت حسین اسلامیہ کالج ،علمدار حسین کالج ،غلام مصطفٰے شاہ گرلز کالج ،شوکت حسین کے.جی سکول،اسلامیہ ہائی سکول حرم گیٹ،اسلامیہ ہائی سکول عام خاص باغ، اسلامیہ ہائی سکول دولت گیٹ اور رضا شاہ پبلک سکول ہیں۔

والد کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ 1956ء کا آئین بنانے والوں میں شامل تھے۔ آئین کی اہمیت اور تقدس کواُن سے بہتر کون جان سکتا ہے،جنہوں نے قیام پاکستان کے لیے اَن گنت قربانیاں دی ہوں۔آئین پاس ہونے پر انہوں نے تمام اراکین کے ساتھ بابائے قوم قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کوخراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ننگے پاؤں اُن کے مزار پر حاضری دی۔اُن کے اس عمل میں قوم کے لیے پیغام تھا کہ زندہ قومیں اپنے محسنوں سے محبت اور اُن کاادب و احترام اُن کی زندگی اور بعد از زندگی برقرار رکھتی ہیں۔دنیا کی مشہور سوانح عمری "The World's Who's Who 1954-55 Edition" میں بھی اُن کا نام شامل ہوا۔

والد 1956ء میں شیخ مجیب الرحمٰن (جو بعد میں بنگلہ دیش کے صدر رہے)اور بیگم سلمٰی تصدق حسین (والدہ جسٹس ریاض حسین جو بعد میں میرے ساتھ بھی وفاقی کونسل کی رکن رہیں) کے ہمراہ چین کا دورہ کرنے والے اس وفد میں شامل تھے جس نے پاک چین (Sino-Pak) دوستی کی بنیاد رکھی۔ وہ اسی سال انٹر پارلیمنٹری یونین (آئی پی یو) کے رکن منتخب ہوئے ،اسی حیثیت سے انہوں نے دنیا کے مختلف ممالک کا دورہ کیا اور وہاں پاکستان کو متعارف کروایا۔اس دور کی اہم

شخصیات وزیرِ اعظم برطانیہ سر ونسٹن چرچل، صدر امریکہ آئزن ہاور، صدر فرانس چارلس ڈیگال، شہنشاہ سعودی عرب عبدالعزیز، چین کی کمیونسٹ پارٹی کے چیئر مین ماوزے تنگ، چین کے پہلے وزیرِ اعظم چواین لائی اور آغا خان سوئم آغا سلطان سر محمد شاہ سے بھی ملاقاتیں کیں۔ چلی کا دورہ کرنے والوں میں وہ پاکستان کے پہلے چند اراکینِ پارلیمنٹ میں سے تھے۔ اسی سال والد نے عراقی فضائیہ کی سلور جوبلی تقریبات میں پاکستان کی نمائندگی کی۔

اکتوبر 1958ء میں جنرل ایوب خان نے ملک میں پہلا مارشل لا نافذ کیا اور 1956ء کا آئین معطل کر دیا۔ 'تحریکِ پاکستان' کے کارکنوں اور چوٹی کے سیاستدانوں کو ایبڈو* کے ذریعے نااہل کر دیا گیا۔ اس بدنامِ زمانہ قانون کی زد میں آنے والوں میں حسین شہید سہروردی، خواجہ ناظم الدّین، آئی آئی چندریگر، فیروز خان نون، خان عبدالقیوم خان، میاں ممتاز دولتانہ، محمد خان لغاری، کرنل (ر) عابد حسین، سید حسن محمود، ایوب کھوڑو، پیر الٰہی بخش، جی ایم سید، قاضی علی اکبر، قاضی عیسیٰ اور کئی دیگر رہنماؤں کے علاوہ میرے والد بھی شامل تھے۔ ایوب خان نے ایبڈو کے ذریعے بیک جنبشِ قلم سب کو بدیانتی کے بلا ثبوت الزام کے تحت نااہل قرار دے دیا اور یوں سیاست کے میدان میں صفِ اول کے رہنماؤں کو پیچھے دھکیل دیئے جانے سے ایسا خلا پیدا ہوا جس نے ملک کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ یہ قانون سات سال تک نافذ رہا۔

طویل مارشل لا اور نت نئے تجربوں نے ملک کی بنیادیں کھوکھلی کر دیں۔ اس سیاہ عہد میں مقبول ترین شخصیتوں اور جماعتوں کو کمزور کر دیا گیا۔ بنیادی جمہوریت کی آڑ میں فردِ واحد کو مضبوط کرنے کی کوشش کی گئی اور تمام معاملات و اختیارات ایک ہی ذات میں یوں مرکوز کر دیئے گئے کہ بقول شخصے ایوب خان کی مثال لائل پور (فیصل آباد) کے گھنٹہ گھر جیسی تھی، جدھر سے بھی آؤ سامنے پاؤ۔ اس دور میں اداروں کو پامال کیا گیا، لوگوں کے حقوق غصب کیے گئے اور عام انتخابات کی بجائے بی ڈی سسٹم* کے تحت انتخابات کروائے گئے۔ ان انتخابات میں محترمہ فاطمہ جناح جیسی ہستی کو بدترین انداز میں شکست دلائی گئی اور یوں ملک کو متحد رکھنے کا آخری موقعہ بھی ضائع کر دیا گیا۔ عوام کے احساسِ محرومی میں اضافے کے باعث عوامی ردِ عمل شدید تر ہوتا

* Elective Bodies (Disqualification) Order (EBDO)

* Basic Democracy System (BD System)

چلا گیا۔ مغربی اور مشرقی صوبوں کے درمیان طبقاتی فاصلے بڑھتے گئے، یگانگت ختم ہوگئی اور بالآخر ملک دولخت ہوگیا۔ والد کے لیے سقوطِ ڈھاکہ کا صدمہ اتنا گہرا تھا کہ وہ کئی راتیں بہت مضطرب رہے اور سو نہ سکے۔

محمد خان لغاری، والد سے اکثر کہا کرتے تھے کہ آپ کے خلاف ریفرنس بنے گا جب والد اور لغاری صاحب ایبڈو کا شکار ہوگئے تو ایک دن وہ والد سے ملنے کے لیے ملتان آئے۔ والد حسبِ سابق اپنی چٹوں پر عوام کے کام کر رہے تھے۔ لغاری صاحب حیران ہوئے اور کہا کہ مخدوم صاحب! آپ کی چٹیں آج بھی چل رہی ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے اپنے دورِ اقتدار میں کام کیے ہیں اور مجھے نااہل کر دیا گیا ہے۔ پھر اَز راہِ مذاق کہا کہ آپ نے تو کوئی کام بھی نہیں کیا اور پھر بھی ایبڈو ہوگئے، آپ سے تو پھر میں ہی بہتر رہا۔

صدر ایوب خان سے والد کی پہلی ملاقات ایبڈو کے تحت نااہلی کے دوران ماموں حسن محمود کے ہاں رحیم یار خان میں شکار کے موقعہ پر ہوئی۔ صدر ایوب نے ان سے دریافت کیا کہ آپ ہم سے ملاقات کیوں نہیں کرتے؟ والد نے جواب دیا کہ ہم مسترد شدہ لوگ ہیں، آپ نے ہمیں سیاست سے باہر کیا ہے، ہمیں آپ نے دنیا سے باہر کیوں نہیں کر دیا۔ صدر ایوب خان یہ سن کر کچھ دیر خاموش رہے اور پھر بولے کہ میں چرچل کا بڑا مداح ہوں اور بقول اُس کے،

" The grass grows on the battle field but on the scaffold, never. "

ترجمہ: گھاس میدانِ جنگ میں تو اُگ سکتی ہے لیکن پھانسی گھاٹ پر کبھی نہیں۔

صدر ایوب نے مزید کہا کہ میں نہیں چاہتا کہ ہر آنے والا ہر جانے والے کو پھانسی پر لٹکا دے جس سے ایک نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو جائے۔

ایبڈو کی مدّت ختم ہونے پر والد نے 1970ء کے عام انتخابات میں قومی اسمبلی کے حلقہ ملتان سے پاکستان پیپلز پارٹی کے صادق حسین قریشی کے مقابلے میں مسلم لیگ (قیوم گروپ) کی طرف سے انتخابات میں حصہ لیا۔ چچا حامد رضا نے شجاع آباد سے رانا تاج احمد نون اور چچا فیض مصطفیٰ نے ملتان شہر سے شیخ اکبر قریشی کے مقابلے میں صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ یہ زمانہ پیپلز پارٹی کے عروج کا تھا جس کی تیز آندھی کے سامنے کئی بُرج اُلٹ گئے جن میں والد اور چچا حامد رضا بھی شامل تھے۔ چچا فیض مصطفیٰ تقریباً دو سو ووٹوں کی برتری سے ایم پی اے منتخب

ہوئے۔قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ صرف دو روز قبل ہی اسی حلقے سے پاکستان پیپلز پارٹی کے سربراہ ذوالفقار علی بھٹو ایم این اے منتخب ہوئے تھے۔ان انتخابات میں مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوگئی۔

میں نے ہمیشہ والد کو اپنے بھائیوں کے ہمراہ عید میلاد النبیؐ کے مرکزی جلوس، دس محرم الحرام اور ہر جمعرات کو دربار حضرت پیر پیراں موسیٰ پاک شہیدؒ پر حاضری دیتے دیکھا۔وہ ہر جمعرات کو بڑی ہمشیرہ کے پاس جاتے اور رات کا کھانا خاندان کے افراد کے ساتھ مل کر کھاتے، یہیں پر خاندان کے اکثر معاملات اور مسائل پر گفتگو ہوتی۔یہ سلسلہ خاندان میں اتفاق قائم رکھنے کا موجب تھا۔

میرے آبائی گھر پاک دروازہ کے قریب ایک چھوٹی سی دکان ہے جس میں عرصہ دراز سے تھومی نہایت لذیذ سری پائے پکاتا ہے اور دور دراز سے لوگ اُس کا پکا ہوا کھانا لینے آتے ہیں جو والد کو بھی بہت پسند تھا اور وہ اپنے دوستوں کو بھی یہ کھانا کھلاتے تھے۔والد کی وفات پر تھومی نے بطورِ نیاز کھانا غریبوں میں تقسیم کر دیا۔

والد کے دوستوں میں جن سے اُن کی اکثر ملاقات رہتی تھی' ملک اللہ بخش، ملک احمد بخش، منظور احمد قریشی، ملک قادر بخش سنڈھل، خلیفہ عبدالغفار، حافظ اکرام الٰہی، شیخ خورشید احمد، دلاور حسین قریشی، میاں محمود حسین قریشی، ملک بشیر احمد، ذوالفقار علی گیلانی، ہاشم علی گیلانی، ملک غلام محبوب لابر، ملک حضور بخش کھوکھر، حکیم فدا حسین، ڈاکٹر محمد حسین ملک، خواجہ عبدالکریم قاصف، مولوی منظور حسین احقر، مولوی محبوب احمد اویسی، پروفیسر عبدالقدوس اور روزنامہ نوائے وقت کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر شیخ ریاض پرویز شامل تھے۔

والد کے قریبی دوستوں میں مخدوم راجن بخش گیلانی کے بیٹے پھوپھا سیّد عبداللہ شاہ بھی شامل تھے۔اُن کا زیادہ تر وقت والد کے ساتھ گزرتا تھا۔ایک مرتبہ پھوپھا نے لاہور سے ملتان ٹرین کے سفر کا اپنا ایک واقعہ سنایا کہ اُن دنوں مسافروں کا معمول ہوتا تھا کہ اپنے سوٹ کیس پر اپنا نام مع القاب و ڈگری لکھا کرتے تھے۔پھوپھا کم تعلیم یافتہ تھے۔انہوں نے اپنے سوٹ کیس پر یہ تحریر کروا رکھا تھا:

I.S.P.G Multan

اُن کے کمپارٹمنٹ میں ایک انگریز افسر بھی سفر کر رہا تھا۔ اُس نے پھوپھا سے دریافت کیا کہ آپ کے سوٹ کیس پر کون سی ڈگری لکھی ہوئی ہے۔ پھوپھا بڑی معصومیت سے بولے کہ اس کا مطلب ہے Inside Pak Gate Multan۔ یہ اُن کے گھر کا پتہ تھا۔

والد کو لاہور بہت پسند تھا۔ وہ جب بھی لاہور جاتے تو داتا دربارؒ حاضری ضرور دیتے تھے۔ کبھی کبھار دربارِ میاں میرؒ پر بھی حاضری کے لیے جاتے تھے۔ کئی مرتبہ میں بھی ان کے ہمراہ گیا۔ وہاں پر میری ممانی رضیہ حَسن محمود کا مزار بھی ہے۔ ممانی رشتہ میں فاروق لغاری کی پھوپھی اور سابق وفاقی وزیر بیگم عفیفہ ممدوٹ کی ہمشیرہ تھیں۔ مجھے زمانہ طالب علمی ہی سے والد لاہور کے اپنے چیدہ احباب سے روشناس کرواتے رہے جن میں صاحبزادی محمودہ بیگم، ملک محمد اختر، چوہدری یوسف علی اور سید شبیر شاہ (ایم این اے میجر (ر) تنویر حسین سیّد کے والد) قابلِ ذکر ہیں۔

والد ہمیشہ تین رمضان المبارک کو اپنے ہاتھ سے کھانا تیار کرتے اور کہتے کہ یہ بی بی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ولادت کا دن ہے۔ اُس دن اپنے دوستوں کو مدعو کرتے اور اُن کی خوب تواضع کرتے تھے۔ زندگی بھر انہوں نے اس روایت کو نہایت محبت وشوق سے نبھایا۔ اتفاق ہے کہ وہ اسی دن یعنی 3 رمضان المبارک مورخہ 9/اگست 1978ء کو نشتر ہسپتال، ملتان میں انتقال کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

اُن کی اس دن سے عقیدت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں اُن کی برسی کا اہتمام تین رمضان المبارک ہی کو کرتا ہوں۔ میں نے جب پہلی مرتبہ اُن کی برسی محدود جگہ اور ٹریفک کے مسئلہ کی بنا پر دربار کی بجائے اپنی رہائش گاہ 'گیلانی ہاؤس' پر منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تو اُس وقت سجادہ نشیں تایا مخدوم شوکت حسین نے بُرا منایا کہ یہ تبدیلی خاندانی روایات کے برعکس ہے۔ تاہم وقت نے ثابت کیا کہ میرا فیصلہ درست تھا۔ والد باقاعدگی سے ڈائری لکھا کرتے تھے۔ اپنی وفات سے ایک روز قبل انہوں نے ڈائری میں یہ شعر لکھا:

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات ہے دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

بابِ دوم

بچپن سے نوعمری تک

میری ولادت 9رجون 1952ء کو نانا مخدوم الملک سیّد غلام میراں شاہ کے گھر 314 لارنس روڈ کراچی میں ہوئی۔ نانا نے میرا نام میراں مصطفیٰ رکھا۔ انہوں نے یہ نام رکھ کر مجھے یہ اعزاز بخشا کہ دو گھرانوں کے بزرگوں یعنی اپنے نام اور میرے دادا مخدوم غلام مصطفیٰ شاہ کے نام کو میرے نام میں یکجا کر دیا۔ والدین کے لیے میرا نام مخمصے کا باعث بن گیا کیونکہ ان دونوں کے والد کے نام میرے نام کا حصہ تھے۔ نانی محترمہ کے لیے دلچسپ پیچیدگی یہ تھی کہ مجھے پیار سے پکارتے ہوئے نانا کا نام لینے میں انہیں حیا آتی تھی، لہٰذا انہوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ مجھے یوسف کی عرفیت عطا کر دی۔

نانا کی جمال الدّین والی، ضلع رحیم یار خان میں اپنی اسٹیٹ (جاگیر) تھی جس کے دروازے رات کو بند کر دیئے جاتے تھے۔ اُن کے اپنے باغات اور شکارگاہ تھی جہاں وہ مہمانوں کو شکار کھیلنے کے لیے لے جاتے تھے۔ وہاں اُن کی ایک بڑی حویلی (mansion) بھی تھی جو انہوں نے 1928ء میں تعمیر کروائی تھی اور اُس زمانے میں وہاں بجلی کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ یہ حویلی آج بھی موجود ہے جس سے ہماری بہت سی پرانی یادیں وابستہ ہیں۔ بچپن میں ہم خوشی کے موقعوں پر علاقائی زبان میں نانا کے قصیدے سنتے تھے۔ چند بول یاد ہیں جو کچھ یوں تھے:

؎ چٹا پھل غلاب دا
میراں سائیں دے باغ دا

عورتیں کورس میں گاتی تھیں۔ وہ بھی کیا دن اور رونقیں تھیں، جن کی یادیں آج بھی دل کو تازگی و سکون بخشتی ہیں۔ نانا لجپال تھے، اُن کی بدولت بے شمار زندگیاں سدھرتی اور بنتی گئیں۔

نانا نے میرے لیے آیا کا انتظام بھی کیا جس کا نام چاند تھا۔ اُن کا بیٹا یوسف کم عمری ہی میں فوت ہو گیا جسے وہ پیار سے عیصَب بلاتی تھیں۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں۔ انہوں نے میری پرورش کے بعد ماموں سیّد اقبال محمود اور ماموں مخدوم زادہ حسن محمود کی بیٹی سہیلہ محمود کی بھی پرورش کی۔ وہ نہایت وضع دار اور خوش لباس خاتون تھیں اور اکثر ساڑھی پہنا کرتی تھیں۔ میں ایک مرتبہ کراچی گیا تو انہیں خصوصی طور پر جا کر ملا۔ وہ بے حد خوش ہوئیں اور آوازیں دے کر محلے داروں کو اکٹھا کر لیا اور بتایا کہ آج میرا عیصَب آیا ہے۔ انہوں نے میری بہت خاطر تواضع کی۔

میرے چھوٹے ماموں سیّد حُسین محمود نوجوانی میں بہت شریر تھے اور ہر دم نت نئی شرارتیں کرنے میں انہیں ملکہ حاصل تھا۔ ایک موقعہ پر ہم ماموں کے ساتھ نانی سے ملنے اُن کی حویلی جمال الدّین والی گئے تو وہاں انہوں نے پانی کا بھرا مٹکا چھت سے نیچے پھینک دیا جہاں دیگر عزیز و اقارب کے علاوہ نانی بھی موجود تھیں۔ مٹکا نیچے گرنے سے زوردار دھماکہ ہوا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں ماموں کی خوشیاں پنہاں تھیں۔ نانی کی دوستی محترمہ فاطمہ جناح سے تھی، انہوں نے اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں ان کی تصویر لگائی ہوئی تھی۔ ماموں یہ تصویر اُتار لیتے تو نانی کا اُن کے ساتھ جھگڑا ہو جاتا۔ ماموں اپنی عمدہ تحریر کی بدولت کبھی کبھار اخبارات میں اپنے قلمی نام 'Peccavi*' سے کالم لکھتے ہیں۔ وہ مستقل مزاج نہ ہونے کی بناء پر اپنی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ نہ کر سکے۔

میری زندگی کے ابتدائی ماہ و سال 'الجیلان' ملتان میں بسر ہوئے، وہاں پر ہماری اور چچا رحمت حسین کی فیملی اکٹھے رہتے تھے۔ یہ وسیع رقبے پر پھیلا ہوا گھر تھا۔ پانی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ایک رہٹ• تھا جس سے پانی نکالنے کے لیے بیل استعمال ہوتے تھے۔

بچپن میں بزرگوں کے ساتھ ہم اپنے باغ حامد پور، ملتان جایا کرتے تھے جس میں آم،

---

* Peccavi: I have sinned

• ایسا کنواں جس کے اندر چرخی اور پانی کے برتن لگے ہوتے ہیں اور بیل یا اونٹ کی مدد سے چرخی کو چلا کر پانی نکالا جاتا ہے۔

انار، امرود، مالٹے اور کھجوروں کے درخت اور خوبصورت مور تھے، وہاں ایک گھر تھا جو بعد میں دو حصوں میں تقسیم ہوگیا، ایک حصہ چچا حامد رضا اور دوسرا میرے چھوٹے بھائی سیّد احمد مجتبیٰ کو ملا۔

بچپن میں ہمارے بزرگ دریائے چناب ملتان کے کنارے فردوس ہوٹل، ملتان کے مالک، ملک کریم بخش کے فارم ہاؤس 'مَنا بھگت' سورج میانی جایا کرتے تھے۔ ملک صاحب وہاں خاص طور پر مینگو پارٹی کا اہتمام کرتے تھے۔ میرے والد اپنے بھائیوں، دوستوں اور بچوں کے ہمراہ اس فارم پر جاتے، دریا میں تیراکی کرتے اور پکنک مناتے تھے۔ اُن دنوں لوگوں کے پاس اپنے لیے وقت تھا۔ ملک صاحب کے چھوٹے بھائی ملک صبح صادق سے آج بھی میری دوستی ہے۔

والد صوبائی وزیر پنجاب بنے تو ہم ملتان سے لاہور منتقل ہو گئے۔ والد کو لاہور میں مہیا کیا گیا گھر، 5۔ پام ویو، ڈیوس روڈ پر واقع تھا۔ ہم وہاں تقریباً تین سال رہے۔ یہ رہائش گاہ بالمقابل شملہ پہاڑی تھی جس کے اندر ایک مندر تھا۔ گھر کے قریب ہی جیسس اینڈ میری کانونٹ سکول تھا جس میں میری بڑی بہن زیرِ تعلیم رہیں جن کا میری اسیری کے دوران 20 ستمبر 2004ء کو انتقال ہوا۔ اب ڈیوس روڈ خاصا گنجان آباد ہو چکا ہے۔ اُس گھر کا بیشتر حصہ پلازے میں تبدیل ہو چکا ہے اور سڑک بھی ٹریفک کی سہولت کے لیے یک طرفہ کر دی گئی ہے۔

ایک دن ماموں سیّد حُسین محمود نے مجھے اپنی پشت پر باندھا اور اسی گھر کی اوپر والی منزل سے باتھ روم کے پائپ پر پھسل پھسل کر نیچے اُترنے لگے۔ والدہ نے یہ منظر دیکھا تو خوف کے مارے رونا شروع کر دیا۔ تمام گارڈز مجھے بچانے کی کوشش کر رہے تھے مگر ماموں کسی کی پروا کیے بغیر پھسلتے پھسلتے مجھے نیچے لے آئے تب کہیں سب کی جان میں جان آئی۔

میں ایک دن اسی گھر کے باہر بندر کا تماشا دیکھنے میں محو تھا کہ ہمارے گھر کے گارڈز مجھے اندر لے جانے کے لیے لپکے تو میں بھاگ کھڑا ہوا۔ آگے لوہے کی خاردار باڑ تھی جو مجھے بھاگتے ہوئے نظر نہ آئی اور میں اُس پر گر پڑا جس سے میرے سر پر چوٹیں آئیں اور خون بہنے لگا۔ مجھے فوری طور پر مرہم پٹی کے لیے ہسپتال لے جایا گیا۔ میرے سر پر کئی ٹانکے لگے جن کے نشانات آج بھی موجود ہیں۔ اس گھر کے سامنے سے رس گلے بیچنے والا سائیکل سوار گزرتا تھا اس نے بنگالی رس گلے مٹکے میں ڈالے ہوتے تھے۔ جو ہم بچوں کو بہت پسند تھے۔

جب والد 1956ء میں رکن آئین ساز اسمبلی* منتخب ہوئے تو ہم اپنے گھر گلبرگ، لاہور منتقل ہو گئے۔ ہمارے گھر سے ملحقہ گھر میں فلم سٹار مسرت نذیر رہائش پذیر تھیں۔ ہم بچوں کے لیے ان کو آتے جاتے دیکھنا خاصی دلچسپی کی بات تھی۔

مجھے بچپن میں والد اپنے کسی دوست کے ہاں ملوانے کے لیے لے گئے، جیسے ہی گاڑی گھر میں داخل ہوئی تو مجھے وہ عمارت بڑی خوبصورت دکھائی دی۔ میں نے والد سے اس عمارت کی تفصیل دریافت کی تو انہوں نے اس بلڈنگ 'چمبہ ہاؤس' لاہور کی مکمل تاریخ و تفصیل بیان کی۔ انہوں نے مزید کہا کہ آجکل اس میں وزرائے کرام اور سرکاری افسران رہائش پذیر ہیں۔ میں نے والد سے دریافت کیا کہ وزراء میں سے کون سا وزیر بڑا ہوتا ہے؟ انہوں نے کہا کہ کام کرنے والے سیاستدان کے لیے صوبائی وزیر کا عہدہ زیادہ اہم ہوتا ہے کیونکہ تھانہ، تحصیل اور انتظامیہ سب کا تعلق صوبے سے ہوتا ہے، لہٰذا وہ عوام کے مسائل جلد حل کروا سکتا ہے، وفاقی وزیر کا عوام سے رابطہ کم ہوتا ہے مگر وہ بلحاظ عہدہ بڑا ہوتا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں وفاقی وزیر بنوں گا اور اس 'چمبہ ہاؤس' میں رہائش پذیر ہوں گا۔ والد نے کہا کہ وفاقی وزیر بننے کے لیے امریکہ سے تعلقات بہت ضروری ہیں۔

میں نے تعلیمی سفر کا آغاز سینٹ میریز کانونٹ سکول، ملتان سے کیا۔ ہم چچا رحمت حسین کے خوبصورت گھوڑے تانگے پر سوار ہو کر سکول جایا کرتے تھے۔ چچا اُس وقت ایم ایل اے و چیئرمین ڈسٹرکٹ بورڈ، ملتان تھے۔ اُن کے پاس ایک شیورلیٹ کار تھی جو اُنہیں سرکاری طور پر مہیا کی گئی تھی۔ وہ بااصول شخص تھے، اس لیے مجھے اپنے ذاتی تانگے یا منی مورس کار میں سکول لے جایا کرتے تھے۔ اس وقت ملتان کا ہوائی اڈہ زیرِ تعمیر تھا اور فوجی چھاؤنی ملتان، گیمن کمپنی تعمیر کر رہی تھی، ہم اسی راستے سے گزر کر سکول جایا کرتے تھے۔

1958ء میں والد نے وزیرِ اعظم فیروز خان نون کی کابینہ میں بطورِ وفاقی وزیرِ مملکت برائے پاور اینڈ ورکس ذمہ داریاں سنبھالیں تو محکمے کے لوگ پاکستان کا پرچم لگانے ہمارے موجودہ گھر 'گیلانی ہاؤس' ملتان آئے تو میں نے ان سے کہا کہ یہ پرچم میں خود لہراؤں گا۔ چنانچہ میں نے بچپن ہی میں اس گھر پر پاکستان کا پرچم لہرایا۔ پروردگار کی کرم نوازی ہے کہ میرے کئی مرتبہ وفاقی

* Member of the Constituent Assembly

وزارتوں اور سپیکر کا عہدہ سنبھالنے پر اس گھر پر پاکستان کا پرچم لہرایا گیا۔

اُن دنوں سکول میں دوران پڑھائی کھانے کا وقفہ ہوا کرتا تھا، ہم اپنے سکول بیگ میں کھانا ساتھ لے کر جاتے تھے۔ کندورے (رومال) میں لپٹے دیسی گھی کے پراٹھے اور دیسی مرغی کے انڈوں سے بنا آملیٹ بیگ میں پڑے رہنے کی وجہ سے اتنے خستہ ہو چکے ہوتے تھے کہ لذت دوبالا ہو جاتی تھی۔ میں اس کا ذائقہ اور کلاس فیلوز کے ساتھ مل جل کر کھانے کا لطف آج تک نہیں بھولا۔ پرنسپل سسٹر* بینیڈکٹا جو طویل عرصے سے اس سکول میں پڑھا رہی تھیں، اُن کا چہرہ آج بھی میری یادداشت میں محفوظ ہے۔ سینٹ میریز کانونٹ سکول، ملتان میں مخلوط طریقۂ تعلیم* برسوں سے رائج تھا، تاہم اُس وقت یہ فیصلہ کیا گیا کہ لڑکوں کے پڑھنے کے لیے علیحدہ سکول ہونا چاہیے۔ لہٰذا جب میں نے اَپر کے جی پاس کی تو مجھے لاسال ہائی سکول، ملتان میں داخل کروا دیا گیا اور اس طرح مجھے کانونٹ سکول چھوڑنا پڑا۔

لاسال ہائی سکول میں میرا شمار اچھے طلبہ میں ہوتا تھا۔ میرا تعلق اس سکول کے 'جیمز ہاؤس*' موجودہ جناح ہاؤس سے تھا۔ میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش تھا۔ مصوری، کرکٹ، فٹ بال، باسکٹ بال، اتھلیٹکس، رگبی، مقابلہ تقاریر اور ڈراموں میں باقاعدگی سے حصہ لیتا تھا جس کی وجہ سے میری مجموعی کارکردگی بہتر ہوتی تھی۔ لاسال ہائی سکول میں ہم نے سٹیج ڈرامہ 'مرچنٹ آف وینس' پیش کیا جس میں مَیں نے ایک مرچنٹ کا کردار ادا کیا تھا۔ لاسال ہائی سکول سے میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کرنے والے طلبہ کے رول آف آنرز پر آج بھی میرا نام لکھا ہوا ہے۔ 1984ء میں لاسال ہائی سکول کی سلور جوبلی تقریبات منائی گئیں جس میں مجھے سکول کے 'کامیاب ترین طالب علم*' کا اعزاز دیا گیا۔ مجھے سٹیج پر بلاتے ہوئے میرا تعارف اس طرح کروایا گیا: یوسف رضا گیلانی، رول نمبر 228، ہاؤس جیمز، قد 5 فٹ 11 انچ۔ اُس وقت میں چیئر مین ضلع کونسل، ملتان اور اس تقریب کا مہمانِ خصوصی تھا۔

---

* A member of a women's religious order (a Roman Catholic nun)

* Co-education

* James House

* The Most Successful Student of La Salle High School, Multan

ایک دن جب میں سکول سے گھر آیا تو والد، نواب ہاتو خان کے ساتھ لان میں بیٹھے تھے۔ مجھے پاس بلا کر اُن کا تعارف کروایا کہ بیٹا! یہ نواب حیات اللہ خان ہیں۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا کہ یہ تو ہاتو خان پہلوان ہیں۔ جس پر انہوں نے مجھے ڈانٹا اور کہا کہ یہ نواب صاحب ہیں۔ دراصل نواب صاحب چوٹی کے پہلوان تھے اور گیلانی خاندان کے بے حد عقیدت مند تھے۔ والد کے تعارف کروانے پر انہوں نے احتراماً میرے پاؤں کو چھوا جس پر والد نے انہیں روکا کہ یہ تو بچہ ہے' آپ اس کے پاؤں مت چھوئیں۔ مگر وہ کہنے لگے کہ میں بچے کے پاؤں کو نہیں چھو رہا ہوں بلکہ جس کے پاؤں چھو رہا ہوں وہ ہستی کوئی اور ہے۔ اُن کا اشارہ میرے جدِّ اَمجد کی طرف تھا۔

لاسال ہائی سکول میں میرے ساتھ مقبول حسین قریشی، علی رضا گردیزی، سیّد قسور شاہ، محمد یار کھچی، راؤ محمد شکیل، شفاعت مصطفےٰ، خواجہ محمد اقبال، شیخ افضال احمد، الیاس اعوان، حسین امام، فرید ضیاء، ہاشم خان، محمد باقر، لوئس لیور، آفتاب احمد اور محمد سلیم پڑھا کرتے تھے۔ گردشِ دوراں دیکھئے کہ میری اسیری کے دوران نومبر 2004ء میں میرے کلاس فیلو راؤ محمد شکیل نے بطور ایڈیشنل سیکرٹری ہوم (پنجاب) سنٹرل جیل اڈیالہ، راولپنڈی کا دورہ کیا تو اچانک اُن کی مجھ سے ملاقات ہوگئی۔ لاسال ہائی سکول کے جن اساتذہ نے میری تعلیم و تربیت کی ان میں قابلِ ذکر نام برادر* سیزر، برادر اولیور، برادر ریمنڈ، برادر ہارڈنگ، برادر پیٹرک، مسز گائے، مس روز، محترم نوبل جان، محترم قادری صاحب اور محترم چوہان صاحب ہیں۔

لاسال ہائی سکول میں طالب علمی کے دوران سائنس میلے میں مجھے تیسرا انعام ملا۔ میں نے اپنے کزن محسن رضا کے ساتھ مل کر ونڈ مل بنائی تھی۔ محسن رضا کو شروع ہی سے مکینک بننے کا بے حد شوق تھا۔ جب میں چھٹی جماعت کا طالب علم تھا تو ایک مرتبہ میں نے اپنے تایا زاد بھائی شفاعت مصطفےٰ کی کُرسی اس کی پشت سے اُس وقت کھینچ لی جب وہ اُس پر بیٹھنے والا تھا۔ بھاری جسامت کی وجہ سے اُس کی گردن نظر نہیں آتی تھی۔ ہم اسے پیار سے شاہ فیٹ کہتے تھے۔ وہ جیسے ہی زمین پر گرا تو اس کے پیچھے قطار میں رکھی خالی کُرسیاں دھڑام سے گرتی چلی گئیں اور میں اپنی شرارت کی وجہ سے پکڑا گیا۔ ہمارے کلاس ٹیچر برادر اولیور نے مجھے بلایا اور دریافت کیا کہ

* A member of a men's religious order who is not in holy orders

آپ کی اس حرکت سے اس کی گردن ٹوٹ سکتی تھی؟ میں نے جواب دیا کہ اس کی تو گردن ہی نہیں ہے ٹوٹے گی کیسے؟ برادر اولیور نے چھڑی سے میری تواضع کی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اتنا غصہ بھی کر سکتے ہیں۔ کرسی کھینچنے کی اس حرکت کو بڑے عرصے بعد دوسروں نے میرے خلاف استعمال کیا مگر وہ سیاست کا کھیل تھا۔

لا سال ہائی سکول کے دنوں کا ایک سانحہ میرے دل و دماغ پر آج بھی نقش ہے، جب گرمیوں میں سکول کے طلبہ کو وادیٔ سوات کی سیر کے لیے لے جایا گیا تو سفر کے دوران پہاڑوں سے گزرتے ہوئے بس دریائے سوات میں جا گری۔ اس حادثہ میں ہمارا ایک کلاس فیلو الیاس جاں بحق ہو گیا۔ الیاس سکول کے ہونہار طالب علموں میں سے ایک تھا۔ یہ ایک ایسا المناک حادثہ تھا کہ سکول کے تمام طلبہ غم سے نڈھال ہو گئے۔ الیاس، ملک محمود اعوان کا بیٹا اور ملک بشیر اعوان کا بھتیجا تھا۔ ملک بشیر اعوان بھی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ انہوں نے چھبیس سال تک والد کی برسی میں مسلسل شرکت کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ساتھ ان کا یہ پیار صرف اُن ہی کا خاصا تھا۔

مجھے لا سال ہائی سکول میں پڑھائی کے دوران کار چلانے کا شوق پیدا ہوا تو میں نے عمر حیات سے ڈرائیونگ سیکھی۔ عمر حیات بہت اچھا مکینک ہے۔ خاندان کے بزرگ اس کا اپنے بچوں کی طرح خیال رکھتے تھے۔ آج کل اس کا امریکہ میں اپنا گیراج ہے۔ جب میں نے ڈرائیونگ سیکھ لی تو ہم والد سے ملنے آئے ہوئے مہمانوں کی کبھی کبھار کاریں لے کر نکل جاتے۔ ہم نے جن کاروں پر ڈرائیونگ کی ان میں دیوان غلام عباس کی پیکارڈ، تایا مخدوم شوکت حسین کی شیورلٹ، اَمین خان کانجو کی ڈاج ڈارٹ، رانا شفیع احمد نون کی وِیلیز جیپ، مخدوم منظور حسین قریشی کی مورس آکسفورڈ اور والد کی پلی متھ اور ہلمین شامل تھیں۔ ہماری خواہش تھی کہ ہم کبھی چچا رحمت حسین کی کار اوپل ریکارڈ بھی چلائیں لیکن ان کی سخت طبیعت کے پیشِ نظر ہم یہ جرأت نہ کر سکے، اس طرح ہماری یہ خواہش حسرت ہی رہی۔ والد کبھی کبھار ہمیں سکول خود چھوڑنے جاتے تھے۔ سردیوں کے موسم میں اگر ٹھنڈ کی وجہ سے کار سٹارٹ نہ ہوتی تو وہ ہم سے دھکے بھی لگواتے۔ اگر سکول پہنچنے میں تاخیر ہو جاتی تو سزا کے طور پر ہمیں کندھوں پر سکول بیگ رکھوا کر پورے گراؤنڈ کا چکر لگوایا جاتا اور خاصی ڈانٹ بھی پڑتی تھی۔

ایک مرتبہ میں اور چچازاد بھائی حسن رضا لٹھے کی شلوار، بوسکی کی قمیض اور شیروانی پہنے

ہوئے نمازِ عید ادا کرنے دربار پیر پیراں موسیٰ پاک شہیدؒ جا رہے تھے کہ ہمیں راستے میں ایک بہروپیا مل گیا جس نے ہاتھ میں اینٹ اُٹھا رکھی تھی۔ اس نے اینٹ کو ہماری طرف پھینکنے کی اداکاری کی۔ حسن رضا ڈر گیا اور حسین آگاہی بازار کی طرف بھاگ نکلا۔ بہروپئے کو موقعہ مل گیا، وہ بھی اینٹ اٹھائے اُس کے پیچھے بھاگ کھڑا ہوا۔ بہروپئے نے صرافہ بازار سے حسین آگاہی بازار تک پیچھا کیا۔ جب وہ پلٹ کر آیا تو نماز ہو چکی تھی۔

ہریانہ ٹرانسپورٹ کے مالک سابق ایم ایل اے الحاج شیخ ریحان الدّین ہمارے ملتان میں ہمسائے اور والد کے قریبی ساتھی تھے۔ اُن کا ٹرانسپورٹ کا عمدہ کاروبار تھا۔ اُن کے پاس امریکن کار تھی جس پر ہم اکثر سکول جایا کرتے تھے۔ اُن کا عالیشان گھر ملتان میں ہائی کورٹ کے بالمقابل ہے۔ اب اس کے احاطے میں کئی وکلا کے دفاتر بن چکے ہیں۔ آخری مرتبہ میری ملاقات اُن کی ایک نواسی سے ہوئی، وہ میری بہنوں کی کلاس فیلو رہ چکی تھیں۔ اُن دنوں میں سپیکر قومی اسمبلی تھا۔ مجھے اُن کے بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے افسوس ہوا۔

پیر مختار حسین والد کے چچا تھے۔ انہوں نے چاہ سہری والا، موضع سلطان پور ہمڑ، ملتان کے مقام پر چلّہ کاٹا تھا۔ وہ نہایت ہی نیک سیرت انسان تھے۔ اُن کا اوائل جوانی ہی میں انتقال ہو گیا۔ اس مقام پر درخت تھے اور روایت کے مطابق درختوں کے پتوں پر اللہ تعالیٰ کا نام لکھا ہوتا تھا۔ پتے گرنے اور دیگر خدشات کے پیشِ نظر بے حرمتی کا اندیشہ تھا۔ لہٰذا پردادا نے خصوصی دعا کی کہ یہ عمل رک جائے اور اس طرح یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ وہاں آج بھی عوام ٹائیفائیڈ بخار کے علاج کے لیے کھجور کے درختوں کی شاخیں گلے میں لپیٹے ہیں۔

پیر مختار کا میلہ ہر سال اسی مقام پر ہوا کرتا تھا۔ ہم اس کا سال بھر انتظار کرتے اور میلے کے موقعہ پر سکول سے کچھ دنوں کی چھٹیاں لے لیتے تھے۔ میلے کے مقام پر کئی شامیانے لگائے جاتے تھے گیلانی خاندان کی خواتین کے لیے مریدین اپنے گھر وقف کرتے تھے جبکہ چچاؤں کے الگ الگ کیمپ ہوتے تھے۔ میلے پر رنگ برنگی چوڑیوں، کھلونوں اور دیگر اشیاء کی دکانیں سجی ہوتی تھیں۔ جگہ جگہ مختلف قسم کی مٹھائیوں اور کھانے پینے کی اشیاء کے چھوٹے بڑے سٹالز لگائے جاتے۔ بچوں کے لیے جھولے بھی موجود ہوتے تھے۔ میلے کے موقعہ پر بڑے بڑے دنگل کرائے جاتے جن میں نامور پہلوان اپنی طاقت اور داؤ پیچ کا مظاہرہ کرتے تھے۔ چھوٹا، بڑا، امیر، غریب،

مرد، عورت ہر ایک اس میلے میں شریک ہو کر اپنی عقیدت کا اظہار کرتا تھا۔ بعض مہمانوں کے بچے چوری چھپے کپاس چُن کر اُس کے عوض دوکانوں سے ٹافیاں اور کھانے کی اشیاء خریدتے تھے۔ ہم دریائے چناب کے کنارے پکنک مناتے اور کبھی کبھار ہوائی بندوق سے پرندوں کا شکار بھی کرتے تھے۔

محمد خان جونیجو جب مغربی پاکستان کے وزیرِ ریلوے بنے تو انہوں نے اس مقام پر پیر مختار کے نام سے ریلوے سٹیشن بنوایا۔ اُس دور میں اس مقام پر کوئی پختہ سڑک نہیں تھی اور لوگ ریل گاڑی اور تانگے کے ذریعے سفر کرتے تھے۔ میں نے جب اسی حلقہٗ انتخاب سے منتخب ہو کر وفاقی وزیر کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھالیں یہاں ریکارڈ ترقیاتی کام کروائے۔ علاقے میں سڑکوں کے جال بچھا دیئے۔ ریلوے لیول کراسنگ بنوایا۔ پورے علاقے میں کوئی جگہ ایسی نہ رہی جس میں بجلی مہیا نہ کر دی گئی ہو۔ سکول اور ہسپتال تعمیر کروائے گئے اور سب سے بڑھ کر اس سیلابی علاقے کے گرد دریائے چناب پر بند بنوایا تا کہ آئندہ علاقہ سیلاب سے محفوظ رہے۔ یہ علاقہ اَب زرعی لحاظ سے بہت ترقی کر چکا ہے۔ میں اسی حلقہ سے چیئرمین ضلع کونسل ملتان اور متعدد بار ایم این اے منتخب ہوا۔

ایک مرتبہ حسن رضا اپنی مورس کار پر یہ میلہ دیکھنے گئے تو اُن کی کار اچانک ایک کنویں میں گر گئی جس میں پانی نہیں تھا۔ لوگوں کی کثیر تعداد نے انہیں کار سمیت کنویں سے نکال لیا۔ پریس فوٹو گرافر اقبال اس موقعہ پر موجود تھا اس نے فوراً کنویں میں کار کا فوٹو بنا لیا۔ دوسرے دن جب اخبار میں وہ فوٹو شائع ہوا تو اُسے پہلا انعام ملا۔

مکوّل قوم نے چاہ سہری والا، سلطان پور ہمڑ میں اپنی زمینیں گیلانیوں کے نام وقف کی ہوئی تھیں۔ چچا فیض مصطفیٰ کی وصیت تھی کہ وفات کے بعد انہیں اس جگہ دفن کیا جائے۔ 13 ستمبر 2004ء کو اُن کا انتقال ہو گیا۔ تو ہم نے اُن کی وصیت اور خواہش کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انہیں اُسی جگہ دفن کیا۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین!

گیلانی خاندان کی خواتین جب دربار پیراں پیر موسیٰ پاک شہیدؒ جاتیں تو گاڑی کے شیشوں پر چادر لگا دی جاتی تھی۔ جب وہ دربار پر پہنچتیں تو 'پردہ پردہ' کی آوازیں گونجتیں۔ مقامی لوگ اپنے گھروں کے اندر چلے جاتے اور زائرین دیواروں کی طرف منہ کر لیتے تھے۔ دربار کے

صدر دروازے کو بند کر دیا جاتا اور کسی غیر مرد کو اندر آنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ اس حوالے سے میں ایک اہم واقعہ ضرور رقم کرنا چاہوں گا کہ جب تایا مخدوم سیّد شوکت حسین 24/جولائی 1982ء کو انتقال فرما گئے تو ان کے بیٹوں سیّد وجاہت حسین اور سیّد تجمل حسین عرف سید صدرالدین شاہ کے درمیان سجادہ نشینی کے مسئلے پر اختلاف ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ یہ مسئلہ شدت اختیار کرتا، خاندان کے بزرگوں نے فیصلہ کیا کہ دادا مخدوم غلام مصطفےٰ شاہ کی اولاد سے خفیہ رائے لی جائے۔ اس مقصد کے لیئے دربار پر باقاعدہ بیلٹ بکس رکھوایا گیا۔ برسوں کے بعد دربار کے آس پاس 'پردہ پردہ' کی آوازیں گونجیں۔ مجھے ایسے لگا جیسے وقت کا پہیہ واپس گھوم گیا ہو۔ رائے شماری ہوئی اور جب نتیجہ نکلا تو تایا کے بڑے بیٹے سیّد وجاہت حسین کامیاب ہو گئے اور اس طرح دربار کی فیوض و برکات سے یہ تنازعہ اُس وقت خوش اسلوبی سے طے پا گیا۔

خلیفہ عبدالغفار جو ہماری درگاہ سے منسلک تھے، نہایت ہی نیک انسان تھے۔ انہیں مختلف علوم پر دسترس حاصل تھی۔ اُن کے تعویذ بہت مشہور تھے، وہ گھنٹوں والد کے پاس بیٹھتے اور اُن کی پرانی باتوں اور بزرگوں کی یاد سے دل تازہ کرتے تھے۔ اُن کے ساتھ میری بھی خاصی دوستی تھی۔ میں بھی اپنے والد کی طرح اُن سے اپنے خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کرتا اور حالات پر گفتگو کرتا رہتا تھا۔ انہوں نے خاندان کے کئی افراد کا نکاح پڑھایا جن میں مَیں بھی شامل ہوں۔ اُن کے بیٹوں تصدق حسین اور مصدق حسین سے آج بھی میرے اچھے مراسم ہیں۔

گرمیوں میں سکول کی چھٹیاں گزارنے ہم اکثر مری جاتے تھے۔ ہمارا گھر ویوفورتھ ہوٹل کے قریب اَپر جھیکا گلی روڈ پر تھا۔ رات کو مطلع صاف ہونے کی صورت میں وہاں سے اسلام آباد کی روشنیاں صاف دکھائی دیتی تھیں۔ اس گھر میں ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا، میں اس باغیچے میں پھولوں کے پودے لگایا کرتا تھا۔ مجھے موسمِ بہار میں گیندے اور ڈیلیا کے پھول بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ اَب دورانِ اسیری سنٹرل جیل اڈیالہ، راولپنڈی میں کبھی کبھار باغبانی کر کے اپنا شوق پورا کر لیتا ہوں۔ جیل میں پھولوں کی کیاریوں کو بڑے شوق اور محنت سے سینچتا ہوں۔ جب میرے جیل کے ساتھیوں کی فیملیز ملاقات کے لیے آتی ہیں تو وہ اُن کے لیے پھولوں کا تحفہ اسی باغیچے سے لے کر جاتے ہیں اور یوں جیل کی ملاقاتوں میں پھولوں اور محبت کی مہک آتی رہتی ہے۔

مری میں ہمارا گھر مین روڈ سے کافی گہرائی میں تھا۔ چڑھائی اتنی زیادہ تھی کہ بارش میں گھر تک کار میں اترنا یا بھوکے پیٹ گھر سے مین روڈ تک چڑھنا خاصا دشوار ہوتا تھا کیونکہ اس وقت راستہ ناہموار تھا۔ مری میں ہم بچوں کا سب سے بڑا مشغلہ مہمانوں کی کاروں کو مین روڈ تک لے جانا اور پھر واپس لانا ہوتا تھا۔ ہر بچہ اپنی کار اور اُس کے انجن کی طاقت پر ناز کرتا تھا۔ ہمارے پاس ایک امریکن کار پلی متھ تھی جو آج بھی میرے بھانجے غلام مصطفیٰ شاہ کے پاس موجود ہے۔ میں اور میرا بھائی سیّد احمد مجتبیٰ کار کو فُل ریس دے کر کلچ چھوڑتے تو وہ ٹائروں سے دھواں نکالتی، پتھروں پر سیاہ لائن چھوڑتی ہوئی گولی کی طرح تیزی سے اونچائی پر چڑھ جاتی تھی۔ گھر میں آئے ہوئے مہمان ہماری اس کارکردگی سے لطف اندوز ہوتے تھے اور یوں ہماری اس مہارت کا بڑا چرچا ہو گیا۔ ہماری کارکردگی اس وقت متاثر ہوئی جب چچا ولائیت حسین کے داماد سیّد اعجاز علی شاہ اور ان کے بھائی سیّد افضال علی شاہ جو بعد میں صوبائی وزیر بھی رہے، پہلی مرتبہ جاپانی ٹویوٹا کار لے کر مری آئے۔ ٹویوٹا کار حجم میں چھوٹی اور کارکردگی میں بہتر تھی۔ ہماری تمام بڑی کاروں کو پیچھے چھوڑ جاتی تھی۔ ہمیں اپنی امریکی کاریں کھٹارا لگنے لگیں۔ افضال علی شاہ کے بیٹے سیّد رضا علی جو اَب صوبائی وزیرِ ہاؤسنگ پنجاب ہیں، وہ بھی اپنے والد اور چچا کی طرح کاروں کے دلدادہ ہیں اور ان کی طرح کار بھی نہایت تیز رفتاری سے چلاتے ہیں۔

مری میں ہمارے گھر کے قریب خاندان کے دیگر افراد بھی چھٹیاں گزارنے کے لیے رہائش پذیر ہوتے تھے۔ ہم ایک دوسرے سے ملاقات کے لیے جاتے تھے۔ ہماری چچی بیگم سیّد ولائیت حسین ہمیں پڑھایا کرتی تھیں۔ اُن کا تعلق سر مہدی شاہ آف گوجرہ کے خاندان سے تھا۔ اُنہیں دست شناسی پر عبور حاصل تھا۔ انہوں نے اوائل 1940ء میں ایم اے فلسفہ کیا تھا۔ دست شناسی میں عبور ہونے کی وجہ سے ہم سب انہیں ہاتھ دیکھنے کے لیے کہتے تھے۔ وہ مجھے کہا کرتی تھیں کہ تم پڑھتے کم ہو مگر اس کے باوجود اپنے والد کی طرح بڑے آدمی بنو گے۔ ایک مرتبہ چچازاد بھائی محسن رضا سلیپنگ سوٹ میں ان سے پڑھنے گیا تو اُسے نامناسب کپڑے پہننے پر اُن سے ڈانٹ پڑی۔ چھٹیاں گزارنے کے بعد ہم مری سے واپس جا رہے ہوتے تو پہاڑوں پر اکثر جگہ لکھا ہوتا کہ مری کے پہاڑ آپ کو الوداع کہتے ہیں۔ الوداع کے یہ الفاظ دل کو اداس کر دیتے تھے۔

ایک مرتبہ ہم اپنی فیملی کے ہمراہ جیپوں پر سوار مری چھٹیاں گزارنے جا رہے تھے۔

جیپوں کے پیچھے سامان کے ٹریلرز لگے ہوئے تھے جن میں مرغیاں بھی تھیں۔ مری جاتے ہوئے ہم کچھ دیر کے لیے فلیشمین ہوٹل، راولپنڈی رکے کیونکہ وہاں ماموں حَسن محمود اور والد کی ملاقات طے تھی۔ ملاقات کے بعد ماموں والد کو ہوٹل سے باہر تک چھوڑنے آئے تو دیکھا کہ تمام مرغیاں ٹریلرز سے نکل کر ہوٹل میں پھیل چکی تھیں اور ہوٹل کے ملازمین انہیں پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے جبکہ وہاں پر موجود دیگر مہمان اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

میں نے میٹرک پاس کرنے کے بعد ایف ایس سی (پری میڈیکل) کے لیے ولائیت حسین اسلامیہ کالج، ملتان میں داخلہ لے لیا۔ یہ کالج انجمن اسلامیہ، ملتان کے زیرِ انتظام تھا۔ اس ادارے میں گیلانی خاندان کے افراد کا پڑھنا لوگوں کے لیے باعثِ اطمینان تھا کہ ان کے بچے بھی ایک معیاری ادارے میں زیرِ تعلیم ہیں۔ اس کالج میں میرے چچازاد بھائیوں شفاعت مصطفیٰ اور حسن رضا کے علاوہ نسیم لابر اور سلیم لابر زیرِ تعلیم تھے۔ ہم میں سے صرف شفاعت مصطفیٰ کے پاس کار تھی، وہ اکثر ہمیں گھمانے کے لیے کالج سے باہر لے جاتا تھا۔ اُسے مِلک شیک پینے کا شوق تھا۔ آرڈر دیتے وقت کہتا کہ ایک ڈبل اور چار سنگل گلاس دیں۔ ڈبل گلاس خود پیتا اور سنگل ہم چاروں کو دیتا۔

ایک مرتبہ نسیم لابر اور سلیم لابر نے مجھے اور شفاعت مصطفیٰ کو کھانے کی دعوت پر اپنے گاؤں لابر، ملتان مدعو کیا۔ اس موقعہ پر انہوں نے ہمیں اپنے باغات اور گاؤں کی سیر کروائی۔ شفاعت مصطفیٰ اُن کا کاروبار دیکھ کر خاصا متاثر ہوا اور اُن سے دریافت کیا کہ کیا یہ سب کچھ آپ کا ہے؟ جس پر انہوں نے کہا کہ ہاں! ہمارا ہے۔ جواب سن کر شفاعت مصطفیٰ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا اور پھر کہنے لگا کہ سچ بتاؤ یہ سب کچھ آپ کا ہے؟ جب اس کو دوبارہ بھی وہی جواب ملا تو کہنے لگا کہ آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ انہوں نے پریشان ہو کر کہا کہ اگر ہم پہلے بتا دیتے تو تم کیا کرتے؟ شفاعت مصطفیٰ نے جواب دیا کہ میں کم از کم آپ کی عزت پہلے سے زیادہ کرتا۔ وہ ہمارا مخلص اور ہمدرد دوست ہے۔

1968ء میں والد حج بیت اللہ کے لیے بذریعہ سڑک روانہ ہوئے۔ ان کے کوئٹہ پہنچنے پر مجھے ایک فون آیا کہ میرے لیے کچھ سامان کوئٹہ سے آیا ہوا ہے جو ملتان ریلوے سٹیشن کے قریب ایک گھر میں ہے، میں جا کر وہاں سے لے آؤں۔ میں جب بتائے ہوئے گھر پہنچا تو وہاں پہلے ہی

سے ایک شخص موجود تھا۔ میں نے اس سے سامان کے بارے میں دریافت کیا تو اُس نے کہا کہ دو سو روپے بلٹی کے دے دیں، میں سامان لے آتا ہوں۔ اُن دنوں پانچ سو روپے کا نیا نوٹ متعارف ہوا تھا۔ میں نے پانچ سو کا ایک نوٹ اُسے دے دیا۔ وہ اس گھر کے اندر داخل ہوا اور پھر واپس نہ آیا۔ میں ایک آدھ گھنٹہ انتظار کے بعد اسے دیکھنے اندر گیا تو وہاں کوئی بھی موجود نہ تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میرے ساتھ دھوکہ ہوا۔ اس واقعہ کو اخباروں نے بھی رپورٹ کیا۔ میں اخبار میں پہلی مرتبہ اپنا نام پڑھ کر بہت خوش ہوا۔

کالج کے دنوں میں شیخ شوکت میرے بہت اچھے دوست تھے۔ اُن کے خاندان کا قالینوں کا عمدہ کاروبار تھا۔ اُن کی میرے والد سے بھی دوستی تھی اور وہ جلسوں میں اکثر والد کے سٹیج سیکرٹری کا فریضہ ادا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ہم اکٹھے کہیں جا رہے تھے کہ عید گاہ، ملتان کے قریب ایک شخص اچانک جیپ سے ٹکرا گیا۔ کسی نے کہا کہ اسے دودھ پلائیں، کسی نے کہا کہ گھی پلائیں۔ ایک شخص بولا کہ اسے دس بیس روپے دے دیں۔ اس پر شیخ شوکت نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں کہا کہ چوٹ تو پانچ روپے کی لگی ہے اور میں دس بیس روپے کیسے دے دوں؟ وہاں موجود تمام لوگ شیخ شوکت کی بات سن کر محظوظ ہوئے۔

وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو ایک بڑا وفد لے کر شملہ کے دورے کی غرض سے ہندوستان گئے ہوئے تھے۔ شیخ شوکت کو معلوم تھا کہ دوپہر کا وقت والد کے آرام کا وقت ہے۔ اس نے عین اسی وقت فون کیا۔ اُن دنوں فون آپریٹر کا رواج نہیں تھا، فون خود ہی سننا ہوتا تھا۔ والد نے دورانِ نیند فون اٹھایا۔ دوسری جانب سے آواز آئی کہ آپ شملہ نہیں گئے تو والد نے برجستہ جواب دیا:

ع شاید کہ مجھے جنت کی ہوا راس نہ آئے

چچا رحمت حسین مسلم لیگ ضلع ملتان کے صدر تھے۔ ایک مرتبہ مسلم لیگ کا اجلاس ان کے گھر 'الرحمت' ملتان کے لان میں ہو رہا تھا۔ لان میں ایک طوطا آم کے درخت پر بیٹھا آم کھا رہا تھا۔ چچا نے اسے اشارے سے اڑانے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ اڑا۔ چچا نے کھڑے ہو کر منہ سے عجیب سی آواز نکالی جس سے صدر مسلم لیگ خان عبدالقیوم خان چونک گئے۔ ماموں حسن محمود نے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے مجلسی آداب کا خیال نہیں رکھا۔ انہوں نے سادگی سے جواب دیا کہ آپ آدابِ مجلس میں لگے ہیں اور طوطا آم کھاتا جا رہا ہے۔ اس جملے پر پوری

مجلس کشتِ زعفران بن گئی۔

1970ء کے عام انتخابات میں میاں مختار اے شیخ مسلم لیگ قیوم گروپ کی طرف سے صوبائی اسمبلی پنجاب کے اُمیدوار تھے۔ میں اُن کی دعوت پر ان کے انتخابی جلسے میں بطورِ مہمانِ خصوصی شریک ہوا۔ میں اس وقت انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا۔ انتخابی جلسہ ڈبل پھاٹک، ملتان کے قریب ہورہا تھا۔ ہم سٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک عوام کا ایک ریلہ آیا اور جلسے کو درہم برہم کر دیا۔ مجھ سمیت سٹیج پر بیٹھے تمام اکابرین نیچے گر گئے اور یوں یہ جلسہ ناکام ہو گیا۔ مہمان خصوصی کا سٹیج سے گرنا باعثِ شرمندگی تھا۔ مختار اے شیخ کا تعلق گیلانی گروپ سے تھا اور وہ والد کے بااعتماد ساتھی تھے۔ اُن کی اہلیہ مسز فرخ مختار اور میں ایم این اے اکٹھے رہے۔ آجکل اُن کا بیٹا فیصل مختار ناظمِ اعلیٰ ملتان ہے۔

میں ایک مرتبہ اپنے دوستوں کے ساتھ کرن سینما ملتان میں فلم دیکھ رہا تھا کہ کسی نے فائر بریگیڈ کو فون کیا کہ کرن سینما میں آگ لگی ہوئی ہے۔ ایمرجنسی میں فائر بریگیڈ کا عملہ گاڑیاں لے کر آگ بجھانے پہنچ گیا۔ ہال کے اندر فلم بینوں میں کھلبلی مچ گئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سینما میں فلم 'آگ' لگی ہوئی تھی اس لیے کسی نے یہ حرکت مذاق کے طور پر کی تھی۔

میں ایف ایس سی کے فائنل ائیر میں پروفیسر ایف ایم خان کے پاس پڑھنے جایا کرتا تھا۔ وہ علمدار حسین کالج کے پہلے پرنسپل تھے۔ جب میں شام کو ٹیوشن پڑھنے جاتا تو وہ اکثر اپنے چھوٹے سے لان کو پائپ کے ذریعے پانی دے رہے ہوتے تھے۔ وہ بہت سادہ اور ملنسار تھے۔ میں اُن سے فزکس اور کیمسٹری پڑھتا تھا۔ اُن کے بیٹے جاوید اکرم برکی انسپکٹر جنرل پولیس اسلام آباد بھی تعینات رہے ہیں۔

والد کی شدید خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں، اس لیے انہوں نے مجھے قائل کیا کہ میں ایف ایس سی، پری میڈیکل کروں۔ میں نے اُن کی خواہش کے احترام میں ایف ایس سی پاس کر لی مگر میرے نمبر میرٹ سے کم تھے۔ بھٹو صاحب کے دورِ اقتدار میں مجھے حکومت کی طرف سے میڈیکل کالج میں داخلے کی پیشکش ہوئی جیسے عوامی نیشنل پارٹی (اے این پی) کے سیکرٹری جنرل سید قسور حسین گردیزی کے بیٹے اور میرے کلاس فیلو سیّد علی رضا کو اس وقت کے گورنر بلوچستان نے اپنے کوٹے سے میڈیکل کالج میں نامزد کیا تھا۔ آج علی رضا گردیزی کارڈیالوجسٹ ہیں۔ یہ

پیشکش مشروط تھی کیونکہ در پردہ وہ والد سے حمایت کی توقع بھی رکھتے تھے۔ والد نے معذرت کر لی، لہٰذا مجھے میڈیکل کالج میں داخلہ نہ ملا اور میں ڈاکٹر نہ بن سکا۔

ایف ایس سی کرنے کے بعد مجھے والد اپنے دوست پروفیسر نامدار خان سیکرٹری تعلیم پنجاب سے ملوانے کے لیے لاہور لے گئے۔ پروفیسر صاحب، صاحبزادی محمودہ بیگم کے قریبی عزیز تھے۔ والد نے ان سے میرے گورنمنٹ کالج، لاہور میں داخلے کے لیے کہا۔ انہوں نے دوسرے روز مجھے اپنے دفتر بلوالیا۔ چند منٹ ملاقات کے بعد انہوں نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کے پاس بیٹھنے کو کہا، میں شام تک اُن کے پاس بیٹھا رہا۔ پروفیسر صاحب گھر جانے سے پہلے مجھے ملے بغیر چلے گئے۔ انہوں نے دوسرے روز بھی یہی کیا کہ مجھے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کے پاس بٹھائے رکھا اور ملاقات نہ کی مگر تیسرے روز انہوں نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا اور بڑی شفقت سے پیش آئے اور کہنے لگے کہ بیٹا! میں نے آپ کا داخلہ پہلے ہی روز کروادیا تھا مگر مجھے محسوس ہوا تھا کہ 'you were speaking from a high pedestal' (آپ کی باتوں میں تکبر ظاہر ہو رہا تھا) اس لیے میں نے آپ کو احساس دلایا ہے کہ زندگی اتنی آسان نہیں ہے۔

میں نے کالج کے دنوں میں گھر کی بجائے نیو ہوسٹل میں قیام کیا۔ کالج کے نیو ہوسٹل میں میری زندگی کا بہترین وقت گزرا۔ میرے ساتھ پڑھنے والوں میں ہمایوں اختر، خواجہ خیر الدّین کے بیٹے خواجہ القمہ، شیخ انور، نثار وارثی، سمیع سعید، اخلاق تارڑ، حرریاحی گردیزی، آصف سعید خان کھوسہ، مقبول حسین قریشی، لطافت علی شاہ اور سیّد ناصر علی شامل تھے۔ گورنمنٹ کالج ،لاہور کے نیو ہوسٹل کے کمرے میں میرے علاوہ جاوید محمود، طارق فیروز اور نور شاہ بھی رہائش پذیر تھے۔ آگے چل کر جاوید محمود اور طارق فیروز نے سی ایس ایس* کا امتحان پاس کرلیا اور آجکل وفاقی حکومت میں جوائنٹ سیکرٹری تعینات ہیں جبکہ نور شاہ بطورِ انجینئر واپڈا میں تعینات ہیں۔ ہم نے اس کمرے کو اس قدر صاف ستھرا رکھا کہ صفائی کی وجہ سے اُس کمرے کو دوسرا انعام ملا۔

نیو ہوسٹل میں میرا زیادہ وقت لطافت علی کے ساتھ گزرتا تھا۔ میں چھٹی کے دن کبھی کبھار قیصر زمان قریشی کے ہاں گلبرگ جاتا تو وہ میری فرمائش پر میرے لیے عمدہ کھانے بنواتے اور مجھے گھر کی کمی محسوس نہ ہونے دیتے تھے۔ لطافت علی کے والد سیّد ولائیت علی شاہ سابق

* Civil Superior Services (CSS)

سیٹلمنٹ کمشنر اور اُن کے چچا سید عنایت علی شاہ سابق ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس تھے۔ اُن کے ہمارے خاندان کے ساتھ دیرینہ مراسم تھے۔ اُن کے ایک بزرگ سیّد غلام محمد شاہ، والد اور دادا کے ساتھ ایم ایل اے رہ چکے تھے۔ لطافت علی نہایت خوش لباس تھے، لاہور کے پٹمینز * سے سوٹ سلوایا کرتے تھے۔

جب میں گورنمنٹ کالج میں زیرِ تعلیم تھا تو اکثر چھٹیوں میں لاہور سے ملتان کے لیے ریل کار میں سفر کرتا تھا۔ جب پہلی مرتبہ میں نے ریل کار سے سفر کیا تو میں نے ایک قلی سے سیٹ دلوانے پر رقم دینے کا وعدہ کرلیا۔ ریل کار لاہور سے چلتی تھی، شیڈ سے نکلنے سے قبل قلی ٹرین میں موجود ہوتے اور اپنے اپنے گاہک کی ضرورت کا خیال رکھ رہے ہوتے تھے۔ جب ٹرین پلیٹ فارم پر رُکی تو میرے قلی نے مجھ سے سوٹ کیس لے کر ایک سیٹ پر پھینک دیا۔ دوسرے قلی نے وہاں سے اٹھا کر دوسری طرف پلیٹ فارم پر دے مارا۔ یہ سلسلہ کچھ دیر بعد یوں ختم ہوگیا کہ سوٹ کیس ٹوٹ گیا اور سامان پلیٹ فارم پر بکھر گیا۔ ساتھ ہی قلی نے سیٹ دِلوائے بغیر اپنی رقم کا مطالبہ شروع کر دیا کیونکہ اُس کے خیال میں مَیں نے نشست لینے میں تیزی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ سو، مجھے کھڑے ہوکر ملتان تک سفر کرنا پڑا۔ جب میں 1986ء میں محمد خان جونیجو کی کابینہ میں ریلوے کا وفاقی وزیر بنا تو ریل کار کو منسٹر ٹرین قرار دے دیا گیا۔

میں نے بطورِ طالب علم پہلی مرتبہ والد کو خط لکھا اور جب پتہ تحریر کرنے لگا تو احساس ہوا کہ میرے گھر کا کوئی نام نہیں ہے۔ ملتان میں ہمارے گھر کے ایک طرف چچا رحمت حسین کا گھر 'الرحمت' اور دوسری طرف تایا مخدوم شوکت حسین کا گھر 'شوکتِ حیدری' ہے۔ میں نے بہت سوچ بچار کے بعد خود ہی اپنے گھر کا نام 'گیلانی ہاؤس' رکھ دیا اور پتہ تحریر کرنے کے بعد والد کو خط ارسال کر دیا۔ اُن دنوں گھروں کے نمبر وغیرہ نہیں ہوتے تھے بلکہ گھروں کے نام رکھے جاتے تھے۔ مجھے توقع تھی کہ والد میری اس کاوش پر خوش ہوں گے کہ جو نام وہ خود نہیں رکھ سکے' وہ میں نے رکھ دیا۔ اس کے برعکس انہوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ مگر اتفاق دیکھیے کہ بڑے عرصے بعد اس گھر کے عقب میں میری پھوپھی کے نام سے منسوب کالونی کا نام 'گیلانی کالونی' اور سڑک کا نام 'غوث الاعظم روڈ' رکھ دیا گیا۔

* Pitman's tailors

ہمارے دوست حبیب اللہ خان پہوڑ کا تعلق کبیر والا، خانیوال سے تھا۔ وہ ہمارے گھرانے کے عقیدت مند تھے اور کبھی کبھار مجھے دوستوں کے ہمراہ انٹر کانٹیننٹل ہوٹل، لاہور میں دعوت دیتے تھے۔ وہ اس ہوٹل میں شعبۂ ضیافت کے انچارج بھی تھے۔ اُن دِنوں وہاں ڈسکو بھی ہوتا تھا۔ انہوں نے پہلی مرتبہ جب ہمیں ڈسکو کی دعوت دی تو مجھے اُس وقت شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا جب ٹائی نہ ہونے کی وجہ سے مجھے ہال میں جانے سے روک دیا گیا۔ حبیب اللہ نے فوری طور پر اپنی ٹائی اُتار کر مجھے پہنائی اور خود ہال میں لے گئے۔ اس طرح میں نے ڈسکو دیکھا۔

میں نے گورنمنٹ کالج، لاہور میں فارسی بول چال کی کلاسز کا اجراء کروایا۔ خانۂ فرہنگ، ایران کے ڈائریکٹر رشید فرزانہ پور نے ان کلاسز کا اجراء کیا۔ میرے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔ کالج کے اساتذہ میں پروفیسر خالد خان میرے انگلش لٹریچر کے اُستاد تھے اور وہ مجھے بہت پسند کرتے تھے۔ ان دنوں پروفیسر اجمل خان ہمارے پرنسپل تھے۔ گورنمنٹ کالج ایک معیاری تعلیمی ادارہ تھا۔ کالج کا ماحول خاصا سخت ہوتا تھا، خصوصاً ہوسٹل کا۔ ہوسٹل میں اقامتی طلبہ کے والدین ان سے چھٹیوں میں فوری طور پر گھر واپس آنے کا نہ صرف مطالبہ کرتے بلکہ انہیں لے جانے کے لیے خود بھی لاہور کے کئی چکر لگاتے تھے۔ مجھے ماہانہ خرچ کے لیے صرف دو سو پچھتر روپے ملتے تھے جس میں ٹیوشن، میس، لانڈری اور دیگر اخراجات پورے کرنے ہوتے تھے۔ یہ رقم اتنی کم ہوتی تھی کہ ذرا سی بے احتیاطی سے مہینے کا باقی عرصہ ادھار پر گزارنا پڑتا تھا۔ نیو ہوسٹل کے قریب چائے کے دو سٹالز تھے جن کو ہم 'انٹر کانٹیننٹل' اور 'ہلٹن' کہتے تھے۔ اگر کوئی مہمان آجاتا تو ہم اسے چائے اور کولڈ ڈرنک کے لیے وہاں لے جاتے تھے۔ وہاں ہمارا کھاتہ چلتا تھا جو بہت بڑی سہولت تھی۔

ہم گورنمنٹ کالج میں دورانِ تعلیم دوستوں کے ساتھ فالودہ کھانے پرانی انارکلی اور دودھ پینے کے لیے بھاٹی گیٹ کا رخ کرتے تھے۔ میں اتنا دُبلا پتلا تھا کہ دودھ والا مجھے پہلوان جی کہہ کر پکارتا تھا۔ ایک مرتبہ تیز رفتاری کے باعث لطافت علی کی کار ایچی سن کالج کے سامنے الٹ گئی۔ دوسرے دِن انگریزی اخبار 'دی سَن' میں اُس الٹی ہوئی کار کی تصویر شائع ہوئی تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے یہ تصویر اپنے تمام دوستوں کو دکھائی۔ ہمارا گروپ انگریزی اخبار 'پاکستان ٹائمز' کے مستقل کالم 'In and Around Lahore' کا ہر روز مطالعہ کرتا تھا جس میں اُس دن شہر میں

ہونے والی تمام اہم تقریبات کی تفصیل ہوتی تھی۔ ہم چند تقریبات کا انتخاب کرتے اور پھر اُن میں بن بلائے مہمان کی طرح شریک ہوجاتے۔ لاہور کی یادیں آج بھی ماحول کو معطّر کر دیتی ہیں۔ مجھے لاہور کے بارے میں شبنم شکیل کا یہ شعر اکثر یاد آتا ہے کہ۔

لاہور پیچھے رہ گیا ہم باوفا مگر
اس شہرِ بے مثال سے آگے نہیں گئے

میں نے گورنمنٹ کالج، لاہور سے بی اے پاس کرنے کے بعد 1974ء میں ایم اے صحافت کے لیے پنجاب یونیورسٹی، لاہور میں داخلہ لے لیا کیونکہ مجھے شعبۂ صحافت میں خاص دلچسپی تھی۔ انگلش میڈیم کے گروپ میں فوزیہ، عطیہ محمود، ناہید اور میاں ثناء اللہ شامل تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد میاں ثناء اللہ اور فوزیہ کی شادی ہوگئی، آج کل دونوں دفترِ خارجہ میں تعینات ہیں۔ اس وقت عطیہ محمود مراکش میں سفیر ہیں۔ میں، میاں ثناء اللہ اور فوزیہ کو آخری مرتبہ 1995ء میں اپنے دورۂ چین کے دوران ملا تھا۔ جہاں وہ تعینات تھے اور سفارت خانے کی طرف سے خصوصی طور پر میرے ساتھ ڈیوٹی پر مامور تھے۔

ایم اے صحافت میں میرے تحقیقی مقالے کا موضوع تھا:

" The opinion of foreign students, studying in Punjab University about the Lahore English Press. "

اس سلسلے میں مجھے کئی غیر ملکی طلبہ اور طالبات سے ملاقات کا موقعہ ملا۔ جن میں سے زیادہ تر کا تعلق پنجاب یونیورسٹی، کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، فاطمہ جناح میڈیکل کالج، لاہور کالج برائے خواتین اور گورنمنٹ کالج، لاہور سے تھا۔

میں پنجاب یونیورسٹی میں دورانِ تعلیم بہت کچھ کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے پنجاب یونیورسٹی لاکالج میں شام کی کلاسز میں بھی داخلہ لے لیا اور ساتھ ہی فرانسیسی زبان بھی سیکھنے لگا۔ یہ زبان مجھے فارسی اور سرائیکی کی طرح نفیس اور میٹھی لگتی ہے۔ میرے فرانسیسی کے ٹیچر کہا کرتے تھے:

"I wonder how people convey their feelings to someone without knowing French."

ترجمہ: مجھے تعجب ہوتا ہے کہ لوگ فرانسیسی جانے بغیر کسی سے اپنے جذبات کا اظہار کیسے کرتے ہیں۔

میں نے این سی سی* کی تربیت بھی لی جس میں مجھے کمپنی کمانڈر کا عہدہ ملا۔ اُس زمانے میں طلبہ وطالبات اکٹھے ہی تربیت لیتے تھے۔ این سی سی کی پاسنگ آؤٹ پریڈ کی تقریب میں مَیں نے اپنے والد کو خصوصی طور پر مدعو کیا۔ انہوں نے وہ تمام تقریب اپنی کار میں بیٹھ کر دیکھی۔

میں پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس کے ہوسٹل نمبر تین میں رہتا تھا جبکہ ہوسٹل نمبر چار میں بی۔ایڈ اور ایم ایڈ کے طلبہ بھی رہتے تھے۔ اسی ہوسٹل میں بجلی کا مین سوئچ بورڈ تھا۔ عجیب بات تھی کہ خواہ کسی بھی وجہ سے بجلی چلی جاتی تو تمام ہوسٹلوں سے اساتذہ کے خلاف نعرے بازی ہوتی۔

شعبۂ صحافت میں میرے اَساتذہ میں محترم پروفیسر وارث میر، محترم مسکین علی حجازی، محترم فاروق نثار اور محترم ڈاکٹر عبدالسّلام خورشید شامل تھے۔ یہ تمام اساتذہ نہایت ہی بردبار، وضعدار اور علم کی روشنی سے منور اپنے اپنے شعبے میں مکمل مہارت رکھتے تھے۔ میرے یونیورسٹی کے دوستوں میں افتخار حسین بلوچ، شفاعت مصطفیٰ، ذوالفقار علی، جاوید علی، منصور علی، قیصر قریشی، طارق کھوکھر اور لطافت علی شامل تھے۔

جب میں ایم اے صحافت کا طالبِ علم تھا تو میری مولانا سیّد ابواعلیٰ مودودی سے ملاقات پیر صاحب پگاڑو کے ہمراہ منصورہ میں ہوئی۔ اُن دِنوں پاکستان نیشنل الائنس (پی این اے) کی تحریک چل رہی تھی۔ وہ کم گو اور شیریں سخن تھے۔

یونیورسٹی کے زمانے میں موسیقی کے کئی پروگرام ہوا کرتے تھے۔ کچھ پروگرام سٹوڈنٹس یونین کی اَفراتفری کی نذر ہو جاتے تھے۔ اُن محفلوں کی کچھ یادیں آج بھی میرے دل میں زندہ ہیں۔ میں ایم اے کے آخری سال میں ہوسٹل سے اپنے گھر گلبرگ' لاہور منتقل ہو گیا۔ میرے ہمراہ اس گھر میں شجاع آباد سے ذوالفقار علی شاہ اور ملتان سے ڈاکٹر طارق کھوکھر بھی رہائش پذیر تھے۔ ذوالفقار علی نے ذاتی کار اور ملازم رکھا ہوا تھا اور طارق کھوکھر کے پاس بھی کار تھی۔ طارق کھوکھر خاصے خوش خوراک تھے اور اپنے لیے ملتان سے کھانے کی اَشیاء لاتے اور ہم

* National Cadet Corps (NCC)

سے چھپا کر رکھتے تھے۔ جن میں پنجیری، چُوری اور ملتانی سوہن حلوہ وغیرہ ہوتا تھا۔ اُن کی چوری

اس طرح پکڑی گئی کہ اُن اشیاء کے پیچھے الماری میں چوہے آ گئے۔ ہم نے الماری کی تلاشی لی تو وہ تمام اشیاء وہاں سے برآمد ہوئیں جو وہ چھپ چھپ کر کھایا کرتے تھے۔

چچا رحمت حسین کے بیٹے حَسن رضا اور خالو پیر صاحب پگاڑو کے بڑے بیٹے صبغت اللہ عرف راجہ سائیں کی باراتیں اکٹھی ماموں سیّد حَسن محمود کے ہاں جمال الدین والی گئیں۔ جب دونوں باراتیں وہاں پہنچیں تو اُنہیں اطلاع دی گئی کہ خالو پیر صاحب پگاڑو اور نانی محترمہ کے مطابق نکاح کے لیے یہ گھڑی نیک نہیں ہے، لہٰذا دونوں باراتوں کو رات کے لیے ٹھہرا دیا گیا۔ ہمیں بہت پریشانی ہوئی کیونکہ ہم اضافی کپڑوں کے بغیر بارات کے ساتھ ملتان سے آئے ہوئے تھے اور دوسرے چچا رحمت حسین نے اَگلے دن اپنے بیٹے کی دعوتِ ولیمہ کا اہتمام اپنے گھر ملتان میں کر رکھا تھا۔ دو دِن کے انتظار کے بعد ہمیں خوشخبری سنائی گئی کہ آج کی گھڑی نکاح کے لیے نیک اور درست ہے۔ دونوں دولہوں کا نکاح ماموں کی بیٹیوں کے ساتھ پڑھایا گیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ بظاہر نیک گھڑیوں میں ہونے والے ان دونوں نکاحوں کا انجام ازدواجی زندگی میں ناکامی کی صورت میں ہوا۔

میں اپنے چچا زاد بھائیوں و برادرانِ نسبتی سیّد وجاہت حسین اور سیّد ابرار حسین کے ہمراہ ایک دعوت پر ساہیوال گیا۔ مریدین نے ہماری شب بسری کے لیے ایک حویلی میں انتظام کیا ہوا تھا۔ میں نیند میں بہت ہلکی آہٹ سے بھی اُٹھ جاتا ہوں۔ آدھی رات کے قریب مجھے رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ خواتین کو رونے سے روکا جا رہا تھا کہ کہیں ہماری آنکھ نہ کھل جائے۔ میں نے سیّد وجاہت حسین اور سیّد ابرار حسین کی طرف دیکھا تو وہ گہری نیند سو رہے تھے۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ میزبان نے ہمارے لیے ناشتے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ اُس نے اَدب سے التجا کی کہ ہمارے گھر کی ایک بزرگ خاتون رات کو چل بسی ہیں، اُن کا جنازہ تیار ہے اور اُن کی وصیت تھی کہ نمازِ جنازہ میرے پیر ہی ادا کریں۔ ہم سب نے اس خاتون کا نمازِ جنازہ ادا کیا۔ آج میرے دونوں بہنوئی مخدوم سیّد وجاہت حسین اور مخدوم سیّد ابرار حسین اپنی اپنی درگاہوں کے گدی نشیں ہیں۔

والد کی دِلی خواہش تھی کہ میں جوانی کے آغاز ہی میں شادی کر لوں مگر میں بضد تھا کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہی اس بارے میں سوچوں گا۔ والد نے میرا موقف تسلیم کر لیا۔ جب میں

ایم اے کا امتحان دے رہا تھا تو والد نے مجھ سے پوچھا کہ پرچوں کے درمیان لمبا وقفہ کب ہو گا؟ وقفہ بتانے پر انہوں نے جو وجہ بتائی وہ میرے لیے حیرانی کا باعث تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ میں نے شادی کے لیے تعلیم مکمل کرنے کی جو شرط رکھی تھی وہ پوری ہو چکی ہے۔ میں نے اُن کی اس جلد بازی کو اُن کی سادگی اور معصومیت سمجھا اور ہاں کر دی۔ پھر لاہور میں پیر سیّد اسرار حسین شاہ بخاری کی بیٹی سے میرا نکاح کر دیا گیا۔

میرے نکاح سے ایک روز قبل بہنوں نے لاہور میں ڈھولک کی تقریب رکھی ہوئی تھی، میں اس تقریب کے سلسلے میں اپنے ماموں اور ممانی بیگم عذرا حسن محمود کے پاس اُن کی بیٹیوں کی اس محفل میں شرکت کے لیے اجازت لینے گیا۔ میں ماموں کا فیورٹ بھانجا تھا، اس لیے انہوں نے خوشی سے اجازت دے دی۔ تقریب ختم ہونے کے بعد میں اپنی ماموں زاد بہنوں کو اُن کے گھر چھوڑنے گیا اور اُن کا شکریہ ادا کیا۔ وہ گھر کے اندر چلی گئیں، میں نے ابھی کار واپس موڑی ہی تھی کہ مجھے گھر کے اندر سے رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں خوفزدہ ہوتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ ممانی وفات پا چکی ہیں اور ماموں سیّد حسن محمود تنہا اُن کے سرہانے کھڑے قرآنِ کریم کی تلاوت کر رہے ہیں۔ چند گھنٹے پہلے جب میں اپنی ماموں زاد بہنوں کو لے کر گیا تھا تو وہ بالکل تندرست و توانا تھیں۔ اُن کی بے وقت موت نے مجھے خاصا افسردہ کر دیا۔

9 اگست 1978ء بمطابق 3 رمضان المبارک کو والد خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اُس وقت میں سمجھا کہ والد کو میری شادی کی جلدی کیوں تھی۔ والد کی وفات میری زندگی کا گہرا صدمہ تھا جس نے میری زندگی کو یکسر تبدیل کر دیا اور مجھے سنجیدہ بنا دیا۔ مجھے فراغت کا وہ دورانیہ بھی میسر نہ آ سکا جو نوجوانوں کو تعلیم مکمل کرنے کے بعد میسر آتا ہے۔

مجھے اُن کی رحلت کے بعد کا ایک واقعہ یاد ہے جس نے میری زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ والد کا مینیجر ملک صادق سندیلہ میرے پاس کسی کام کے سلسلے میں آیا۔ والد کی وفات کے بعد اس کا پہلا کام تھا اس لیے میں نے اس کو یہی تاثر دیا کہ میں بھی عوام کے کام کروا سکتا ہوں۔ دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ اُس کا کام ڈی آئی جی پولیس، ملتان غلام اصغر خان سے ہے۔ میں نے اُس سے کام کے متعلق پوچھا تو اُس نے کہا کہ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں، راستے میں بتا دوں گا۔ وہ خاصا سمجھدار تھا، وہ تفصیل بتانا نہیں بلکہ خود میرے ساتھ ڈی آئی جی کے پاس

جانا چاہتا تھا تاکہ تمام کیس خود بتا سکے کیونکہ اُن دنوں سیاستدانوں کی ایک عادت تھی کہ وہ سائل کو ساتھ لے کر نہیں جاتے تھے بلکہ وہ خود دفتر کے اندر متعلقہ افسر سے ملاقات کر کے آجاتے اور باہر آکر کہہ دیتے کہ میں نے تمہارا کام کہہ دیا ہے۔ اگر کام ہو جائے تو ٹھیک ورنہ کہتے کہ میں نے تو کہہ دیا تھا، باقی تمہاری قسمت۔ جب میں ڈی آئی جی کے دفتر پہنچا تو میں نے اپنے نام کی چٹ اَندر بھیجی۔ انہوں نے بلالیا، مجھے بڑی شفقت سے ملے اور دریافت کیا کہ مخدوم صاحب! آپ کا آنا کیسے ہوا؟ میں نے اُن سے کہا کہ میرے مینیجر کا کام ہے اس سلسلے میں آیا ہوں۔ اُنہوں نے کہا کہ آپ حکم کریں۔ اُس پر میں نے اپنے مینیجر سے کہا کہ تم بتاؤ کہ تمہارا کیا کام ہے؟ اُس نے بتانا شروع کر دیا جس پر ڈی آئی جی غصے سے بولے کہ تم چپ کرو۔ اور میری طرف دیکھ کر بڑی شفقت سے کہا کہ مخدوم صاحب! فرمائیں آپ کا کام کیا ہے؟ اس پر میں نے کیا کہنا تھا۔ میں چپ ہو گیا جس پر مینیجر بیچارا بڑی ہمت کر کے دوبارہ کیس سمجھانے کی کوشش کرنے ہی لگا تو وہ گرجدار آواز میں بولے کہ تم خاموش رہو اور باہر نکل جاؤ۔

اُس کے جانے کے بعد انہوں نے مجھے بڑے پیار سے سمجھایا کہ دیکھیں! آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس آدمی کا کام کیا ہے اور کیا وہ جائز بھی ہے یا نہیں، اُس کے باوجود آپ اس کے ساتھ چل پڑے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ آپ گھر تشریف لے جائیں اور اس سے دریافت کریں کہ اس کا کام کیا ہے، اگر آپ خود مطمئن ہوں کہ یہ کام جائز ہے تو مجھے صرف فون پر کہہ دیں، اس کا کام ہو جائے گا۔ مجھے بے حد شرمندگی ہوئی کہ میں کیس کی تیاری کیے بغیر ہی اُس کے ساتھ چل پڑا۔ اُس دن کے بعد سے آج تک میں نے کسی کا کام کروانا ہو تو پہلے تفصیل سے ہوم ورک کرتا ہوں۔ والد کی وفات کے چھ ماہ بعد چچا حامد رضا نے مجھے قائل کیا کہ میری شادی' جو والد کی وفات کی وجہ سے ملتوی ہوئی تھی، کے لیے نئی تاریخ طے کر لیں، لہٰذا 29 / اپریل 1979ء کو میری شادی ہوئی اور دوسرے روز' گیلانی ہاؤس' ملتان میں ولیمہ ہوا۔ دعوتِ ولیمہ میں پیر صاحب پگاڑو، مولانا مفتی محمود، نوابزادہ نصر اللہ خان، محمد خان جونیجو اور مخدوم زادہ سیّد حسن محمود کے علاوہ کئی اہم شخصیات نے شرکت کی۔

باب سوم

جنرل ضیاءُالحق کا دورِ حکومت (1977ء-1985ء)

1970ء کے عام انتخابات کے نتیجے میں مشرقی پاکستان سے عوامی لیگ اور مغربی پاکستان سے پاکستان پیپلز پارٹی نے بھاری اکثریت حاصل کی۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد ملک کی باگ ڈور پیپلز پارٹی کے سربراہ ذوالفقار علی بھٹو کو سونپ دی گئی۔

ذوالفقار علی بھٹو ایک عہد ساز شخصیت تھے۔ وہ یونیورسٹی آف سدرن کیلی فورنیا، لاس اینجلس میں 1947ء سے 1949ء تک زیرِ تعلیم رہے، انہوں نے یونیورسٹی آف کیلی فورنیا، بارکلے سے 1950ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی اور یونیورسٹی آف آکسفورڈ، برطانیہ سے ایم اے کی ڈگری 1953ء میں حاصل کی۔ اسی سال انہوں نے لنکنز اِن، لندن سے بارایٹ لا کی۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز وکالت سے اور اپنی سیاسی زندگی کی ابتداء اقوامِ متحدہ کے وفد میں بطورِ رکن شمولیت سے کی۔ ذوالفقار علی بھٹو عام انتخابات کے ذریعے پہلے منتخب وزیرِ اعظم بنے۔ تعلیم یافتہ اور ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہترین مقرر بھی تھے۔ اپنے سیاسی کیریئر کے دوران وہ وفاقی وزیر اور اُمورِ خارجہ رہے اور انہوں نے اس دوران انقلابی اقدامات کیے۔ وزارتِ عظمیٰ کے عہدے تک پہنچنا اُن کی کامیاب شخصیت کی علامت ہے۔ کہنہ مشق سیاستدان ہونے کے باعث ملکی سیاست کے ساتھ ساتھ عالمی سیاست پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ قائداعظمؒ کے بعد انہیں سب سے بڑا رہنما مانا جاتا ہے۔ سیاسی اُفق پر اُن کی قد آور شخصیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

بھٹو صاحب نے 1967ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی جو اس وقت کے مروّجہ

سیاسی نظام کے خلاف کھلی بغاوت تھی۔ انہوں نے عوام کو اظہارِ رائے کی آزادی، اعتماد، مقام اور حیثیت دے کر انہیں اُن کی طاقت سے روشناس کروایا۔ پہلی مرتبہ 'قوت کا سرچشمہ عوام ہے' کا تصور پیش کیا جس سے عوام کو عزتِ نفس ملی جو اُن کے بحیثیت عوامی قائد کارہائے نمایاں ہیں۔ بھٹو صاحب نے ملک میں سیاسی ترقی کا عمل آگے بڑھا کر جمہوریت کی بنیاد رکھ دی۔ جب انہیں اقتدار ملا تو انہوں نے ملک کو متحد رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بلوچستان کو صوبے کا درجہ دینے کے ساتھ ساتھ آزاد کشمیر کو خود مختار حیثیت دی اور شمالی علاقہ جات میں اصلاحات نافذ کر کے وہاں کے عوام کو بنیادی حقوق فراہم کیے۔ بھٹو صاحب نے ایسے تاریخی کام کیے جو ملک و قوم کی ترقی اور خوشحالی کی ضمانت بنے۔ ملک کو اسلام کا قلعہ تسلیم کروایا۔ عالمِ اسلام کا تشخص اُجاگر کرنے، مسلم بلاک کے قیام اور اسلامک ورلڈ بینک کے قیام کے لیے اسلامی سربراہی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ غریب اور محکوم طبقے کی خوشحالی اور تحفظ کے لیے زرعی اصلاحات (Land Reforms) اور سول سروسز اصلاحات (Civil Services Reforms) نافذ کیں۔ اپنی پارٹی کے نعرے ''روٹی، کپڑا اور مکان'' کو عملی جامہ پہناتے ہوئے غریب عوام کے لیے 5 مرلہ سکیم کا اجراء کیا۔ انہوں نے مزدور یونینوں کو بحال کیا اور انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن کے چارٹر پر دستخط کیے۔ بھٹو صاحب کے دورِ حکومت میں تیل کے نئے ذخائر دریافت کروائے گئے۔ ملک کو دفاعی لحاظ سے مضبوط اور ناقابلِ تسخیر بنانے کے لیے ایٹمی پروگرام کا آغاز کیا۔ کامرہ ایروناٹیکل اور ہیوی میکینکل کمپلیکس کی تعمیر کروائی۔ 1971ء کی جنگ کے بعد نوے ہزار جنگی قیدیوں کو رہا کروانا اور ہندوستان سے پانچ ہزار مربع میل رقبہ واگذار کروانا اُن کی سفارتی سطح پر بڑی کامیابیاں ہیں۔ انہوں نے نازک ترین حالات میں اقوامِ متحدہ کے سامنے پاکستان کا مؤقف جس جرأت سے پیش کیا اُس سے نہ صرف اُن کی اپنی شخصیت بلکہ پاکستان کی حیثیت اور قدر و منزلت میں مزید اضافہ ہوا۔ پاکستان کو عالمی منڈیوں تک رسائی دلوانے کے لیے پورٹ قاسم، سٹیل مل اور شاہراہِ قراقرم جیسے بڑے منصوبے تعمیر کروائے۔ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ ملک میں قابلِ عمل اور قابلِ قبول 1973ء کا متفقہ آئین تشکیل دینا ہے۔

وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے 1977ء میں قبل از وقت عام انتخابات کا اعلان کر دیا جس پر حزبِ اختلاف کی تمام جماعتوں نے متحد ہو کر پاکستان قومی اتحاد تشکیل دیا۔ پاکستان قومی

اتحاد نے قومی اسمبلی کے انتخابی نتائج کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے صوبائی اسمبلی۔ انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔حکومت کے خلاف ملک بھر میں تحریک شروع کر دی۔حکومت اور قومی اتحاد کے درمیان مذاکرات ہوئے۔اس سے پہلے کہ حکومت اور حزبِ اختلاف کے درمیان معاہدہ طے پاتا جنرل ضیاءُالحق نے بھٹو حکومت برطرف کر کے قومی اسمبلی تحلیل کر دی۔ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا اور خود چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بن گئے۔بھٹو صاحب کو گرفتار کر کے اُن پر مقدمہ چلایا گیا اور 4راپریل 1979ء کو انہیں پھانسی دے دی گئی۔اُن کو پھانسی دینا نہ صرف ملک بلکہ عدلیہ کی تاریخ میں بھی ایک سیاہ باب کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔اُن کو پھانسی دینے کا فیصلہ اَز خود متنازعہ تھا کہ فیصلہ کرنے والے جج بھی متفق نہ تھے۔اس بارے میں جسٹس نسیم حسن شاہ جو فیصلہ کرنے والے ججوں میں شامل تھے کا بیان کہ اس فیصلے کے لیے حکومت کا سخت دباؤ تھا ایک واضح ثبوت ہے کہ بھٹو کو قتل کیا گیا۔اُن کے قتل سے پیدا ہونے والا خلاپُر نہیں کیا جا سکتا لہٰذا اس مقدمے کی دوبارہ سماعت کی جانی چاہیے۔

ملکی حالات سنبھالنے اور کاروبارِ حکومت چلانے کے لیے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاءُالحق نے فیصلہ کیا کہ ایک ایسی حکومت تشکیل دی جائے جس میں پاکستان قومی اتحاد کی فعال جماعتوں کی نمائندگی ہو۔وفاقی کابینہ میں شمولیت کے لیے مسلم لیگ سے پانچ نام مانگے گئے تو پارٹی نے محمد خان جونیجو،چوہدری ظہورالٰہی،میاں زاہد سرفراز،نواب عبدالغفور خان ہوتی اور خواجہ محمد صفدر کو نامزد کیا۔جنرل ضیاءُالحق اور قومی اتحاد کا ساتھ زیادہ دیر نہ چل سکا اور انہوں نے وزارتیں چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔مسلم لیگی وزراء میں سے محمد خان جونیجو ہی بااصول نکلے جنہوں نے وزارت چھوڑ دی۔دورانِ اسیری 2004ء چیئرمین مسلم لیگ (نواز گروپ) راجہ محمد ظفر الحق، جاوید ہاشمی سے ملاقات کے لیے سنٹرل جیل اڈیالہ،راولپنڈی آئے۔اس موقعہ پر انہوں نے مجھ سے بھی ملاقات کی۔دورانِ ملاقات میں نے ان وزراء کے بارے میں تصدیق چاہی تو انہوں نے میرے ساتھ اتفاق کیا اور مزید بتایا کہ وہ خود اور فدا محمد خان مسلم لیگ کے کوٹے سے وزیر نہیں تھے بلکہ انہیں ذاتی حیثیت سے وزیر بنایا گیا تھا جبکہ مسلم لیگ کی طرف سے یہی پانچ وزراء بنائے گئے تھے۔

جنرل ضیاءُالحق نے 1979ء میں بلدیاتی انتخابات کا اعلان کر دیا ملک بھر کی طرح ضلع

ملتان میں بھی مختلف انتخابی اتحاد بن گئے۔ان انتخابات میں چیئر مین ضلع کونسل،ملتان کے عہدے کے لیے چچا حامد رضا اور سیّد فخر امام کے درمیان مقابلہ تھا،دونوں کو برابر یعنی چھبیس چھبیس ووٹ ملے۔فیصلہ قرعہ اندازی کے ذریعے چچا کے حق میں ہوگیا جس پر سیّد فخر امام نے مخدوم جاوید ہاشمی کی مدد سے ہائی کورٹ کے جج جسٹس مشتاق سے چھٹی والے دِن حکمِ امتناعی حاصل کر کے حلف برداری کی تقریب رکوادی۔بعد میں عدالتِ عالیہ کے فیصلے پر یہ انتخابات کالعدم قرار دے دیے گئے۔اس طرح چچا حامد رضا چیئر مین ضلع کونسل،ملتان نہ بن سکے۔سبب دراصل یہ تھا کہ ان انتخابات میں ضلع کونسل،ملتان کی نشست کے لیے ملک محمد اسحاق بُچّہ کا مقابلہ ملک اللہ یار مہے سے ہوا جس پر ملک اللہ یار کامیاب ہو گئے۔اسحاق بُچّہ نے ملک اللہ یار کے خلاف عدالت سے رجوع کیا کہ انتخابی مہم کے دوران انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کا انتخابی نشان استعمال کیا تھا۔عدالت نے حکمِ امتناعی جاری کر دیا لیکن اس کے باوجود جب ضلع کونسل کے چیئر مین کا انتخاب ہوا تو ملک اللہ یار، چچا حامد رضا کے تجویز کنندہ بن گئے۔اس واقعہ کی تصدیق دورانِ اسیری جاوید ہاشمی اور میری ملاقات پر آئے ہوئے میرے ہی حلقے سے ایم پی اے اسحاق بُچّہ نے بھی کی۔جب 2 مئی 1979ء کو میرے سسر پیر اسرار حسین شاہ نے میری شادی کے بعد میرے لیے سندیلیانوالی، پیر محل میں استقبالیہ دیا تو اُس میں سابق صدر چوہدری فضل الٰہی نے مجھے کہا کہ حامد رضا گیلانی کو چاہیے تھا کہ وہ خود چیئر مین ضلع کونسل کا انتخاب نہ لڑتے،سیّد فخر امام تو ابھی سیاست میں متعارف ہو رہے تھے جبکہ آپ کے چچا وفاقی وزیر جیسے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ چکے تھے،انہیں یہ رِسک نہیں لینا چاہیے تھا،اگر قرعہ اُن کے خلاف نکلتا تو اُن کے سیاسی کیریئر پر بُرا اثر پڑتا۔

یہ دور سیاسی مدّ وجزر کا دور تھا۔بھٹو حکومت کے خلاف جدوجہد کرنے والا سیاسی جماعتوں کا اتحاد پاکستان قومی اتحاد ابھی میدان میں تھا۔ملک کے نامور سیاسی مدبرین اور منجھے ہوئے سیاستدان میدانِ سیاست میں تھے اور مجھے سیاسی کیریئر کے آغاز ہی میں نازک اور اہم فیصلہ کرنا تھا۔چچا حامد رضا جو مختصر عرصے کے لیے وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی کابینہ میں وزیرِ صنعت اور کینیا میں سفیر تعینات رہ چکے تھے، اپنے دوست ملک اکرم خان بوسن کے ہمراہ میرے گھر آئے اور کہنے لگے کہ جب میں برطانیہ بار ایٹ لا کرنے گیا ہوا تھا تو اس وقت آپ کے والد وفاقی وزیرِ مملکت تھے، ملک میں پہلا مارشل لا جنرل اَیوب خان نے لگایا تو مجھے آپ کے والد

نے اپنے حلقۂ انتخاب لودھراں سے قومی اسمبلی کی نشست طشتری میں رکھ کر دی، وہ نہ صرف میرے بھائی تھے بلکہ میرے آئیڈیل بھی تھے۔ چچا نے مزید کہا کہ مجھے آپ کے والد کی گراں قدر خدمات کے نتیجے میں قومی اسمبلی کے انتخاب میں مغربی پاکستان سے نواب آف کالا باغ کے بعد سب سے زیادہ ووٹ ملے اور دوسری مرتبہ ایم این اے بلا مقابلہ کامیاب ہوا۔ انہوں نے کہا کہ آج میں آپ کے پاس چل کر آیا ہوں کہ آپ پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر کے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز کریں، پیپلز پارٹی کے چیئر مین ذوالفقار علی بھٹو کی بھی یہی خواہش ہے کہ میں آپ کو پیپلز پارٹی میں شمولیت کے لیے آمادہ کروں۔ والد کی وفات کو بمشکل دو تین روز ہوئے تھے، میں نے اُن سے والد کی قل خوانی تک مہلت چاہی۔ اسی دوران ماموں حسن محمود بھی ملتان تشریف لائے اور مجھے مسلم لیگ میں شمولیت کی دعوت دی۔ میں نے اُنہیں بھی وہی جواب دیا۔ میں نے اپنے سیاسی مستقبل کے بارے میں والد کے دوستوں اور چچا رحمت حسین، جو کہ والد کے قریبی ساتھی بھی تھے، سے مشاورت کی۔ ان کی متفقہ رائے تھی کہ والد کی مسلم لیگ کے لیے گرانقدر خدمات اور اُن کے مقام کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مجھے اپنی سیاست کی ابتداء مسلم لیگ ہی سے کرنی چاہیے۔

والد کی قل خوانی کے موقعہ پر میری دستار بندی سجادہ نشین دربار پیر پیراں موسیٰ پاک شہیدؒ تایا مخدوم سیّد شوکت حسین گیلانی نے کی۔ اس تقریب میں ملک کی سرکردہ شخصیات نے شرکت کی جن میں سجادہ نشین دربار جمال الدین والی مخدوم الملک سیّد غلام میراں شاہ، پیر صاحب پگاڑو، سجادہ نشین دربار اُوچ شریفؒ مخدوم سیّد شمس الدین گیلانی، سجادہ نشین دربار حضرت بہاؤالدین زکریاؒ مخدوم سجاد حسین قریشی، سجادہ نشین دربار پیر مکھڈ اٹک پیر سیّد صفی الدین شاہ گیلانی، سجادہ نشین دربار پیر قتالؒ جلال پور پیروالا دیوان سیّد غلام عباس بخاری، سجادہ نشین دربار قطبیہؒ سندیلیانوالی پیر سیّد اسرار حسین شاہ بخاری، سجادہ نشین دربار حجرہ شاہ مقیمؒ اوکاڑہ پیر سیّد اعجاز علی شاہ گیلانی، مخدوم زادہ سیّد حامد رضا گیلانی، مخدوم زادہ سیّد حسن محمود، سیّد سلیم نواز گردیزی اور ریلوے کے وفاقی وزیر محمد خان جونیجو شامل تھے۔

والد نے بھرپور سیاسی زندگی گزاری اور عوامی فلاح و بہبود کے حوالے سے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ وہ میدانِ سیاست میں اس خلا کو پُر کرنے کے لیے اُترے جو اُن کے

والد مخدوم سیّد غلام مصطفٰے شاہ اور چچا سیّد محمد رضا شاہ کی یکے بعد دیگرے رحلت سے پیدا ہوا تھا۔ ضلع کونسل اور کارپوریشن ملتان کی باگ ڈور ایک عرصے سے ہمارے خاندان کے پاس تھی۔ قومی وصوبائی اسمبلی کی نشستوں کے علاوہ کئی ایک وزارتوں کے قلمدان بھی ہمارے خاندان کے پاس ہوتے تھے۔ والد کی رحلت کے بعد میدانِ سیاست کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آن پڑی۔ تاریخ اپنے آپ کو دُوہرا رہی تھی، میرے لئے یہ کڑا امتحان اور فیصلے کی مشکل گھڑی تھی۔

قل خوانی کے اختتام پر میں نے پیر صاحب پگاڑو اور سیّد حَسن محمود کو اپنے مسلم لیگ میں شامل ہونے کے فیصلے سے آگاہ کیا۔ پیر صاحب پگاڑو نے بطورِ صدر مسلم لیگ مجھے مسلم لیگ کی سنٹرل ورکنگ کمیٹی کا رکن نامزد کر دیا جو میرے لیے اعزاز تھا۔ والد طویل عرصے کے بعد اس عہدے تک پہنچے اور میں نے اس مقام سے سیاسی زندگی کی ابتداء کی۔

مسلم لیگ کی سنٹرل ورکنگ کمیٹی میں دیگر اراکین کے علاوہ پیر صاحب پگاڑو، ملک محمد قاسم، ایس ایم ظفر، گوہر ایوب خان، خواجہ خیر الدین، تاج محمد جمالی، نواب عبدالغفور خان ہوتی، فدا محمد خان، چوہدری ظہور الٰہی، راجہ محمد ظفر الحق، چوہدری محمد حسین چٹھہ، خواجہ محمد صفدر، میاں زاہد سرفراز، رانا خداداد خان، محمد خان جونیجو، مخدوم زادہ سیّد حسن محمود، میاں غلام حیدر وائیں، سیّد تسنیم نواز گردیزی، مولوی عرفان احمد انصاری، زین نورانی، میر نبی بخش زہری، سردار عبدالقیوم خان، میاں صلاح الدین، رانا محمد اشرف، اقبال کاسترو، سلمٰی احمد، شاہین عتیق الرحمٰن اور ریحانہ علیم مشہدی شامل تھیں۔

جن دنوں میں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی، پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ سیاسی طور پر خاصی کمزور ہو چکی تھی۔ ملتان میں مسلم لیگ کی پہچان مولوی عرفان انصاری ایڈووکیٹ تھے۔ وہ قائداعظمؒ جیسا لباس، کالی شیروانی اور جناح کیپ پہن کر سائیکل پر سوار ضلع کچہری جایا کرتے تھے۔ قائداعظمؒ کی برسی ہو یا یوم آزادی، وہ عزیز ہوٹل کے قریب اپنے گھر میں تقریب کا اہتمام ضرور کرتے تھے۔ ملتان میں پارٹی کے ایک اور پُر خلوص اور سرگرم کارکن رشید احمد نیازی تھے جن کا تعلق شعبۂ صحافت سے تھا۔ وہ ہفت روزہ اخبار 'صدائے وقت' نکالتے اور مسلم لیگ کا بہت پرچار کرتے تھے۔ اس اخبار میں اکثر میرا تذکرہ بھی ہوتا تھا۔ نازو بگھیلا مسلم لیگ کا پرچم تھامے سارا دن سڑکوں پر گھومتے تھے۔ خواتین میں بیگم زبیدہ جعفری مسلم لیگ کی روحِ رواں تھیں۔

والد کی وفات کے بعد تایا مخدوم شوکت حسین صدر انجمنِ اسلامیہ، ملتان کی زیرِ صدارت مجلسِ عاملہ کا اجلاس ہوا۔ جس میں والد کی ادارے کے لیے گرانقدر خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا اور مجھے انجمن کا نائب صدر منتخب کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور اس طرح میں بلا مقابلہ نائب صدر منتخب ہو گیا۔ والد کی رائے اس ادارے کے اہم فیصلوں کے لیے خاص اہمیت رکھتی تھی۔ ہر سال انجمن کے زیرِ انتظام عید میلاد النبیؐ کے موقعہ پر ملتان میں جلسہ وجلوس کی قیادت کا فیصلہ بھی وہی کرتے تھے۔ والد کی مشاورت سے سابق گورنر جنرل غلام محمد اور خواجہ ناظم الدّین، سابق وزرائے اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان، آئی آئی چندریگر، حسین شہید سہروردی اور ملک فیروز خان نون اور سابق سپیکر قومی اسمبلی فضل قادر چوہدری کے علاوہ کئی وفاقی وصوبائی وزراء نے بھی ان تقریبات کی صدارت کی۔

1979ء میں انجمنِ اسلامیہ ملتان کے اجلاس میں عید میلاد النبیؐ کے موقعہ پر مہمانِ خصوصی کے متعلق رائے لی گئی تو میں نے وفاقی وزیر ریلوے محمد خان جونیجو کا نام تجویز کیا۔ ارکان کی اکثریت نے میری تجویز سے اتفاق کیا، فیصلہ ہوا کہ میں خود اسلام آباد جا کر جونیجو صاحب کو جلسہ وجلوس کی صدارت کے لیے مدعو کروں۔ میں نے جونیجو صاحب کو دعوت دی جسے انہوں نے قبول کر لیا۔ انجمنِ اسلامیہ کے اجلاس میں جونیجو صاحب کے دعوت نامے کی منظوری کے حوالے سے رپورٹ پیش کی گئی۔ مجھے اس موقعہ پر معلوم ہوا کہ تایا مخدوم شوکت حسین کے بیٹے سیّد تنویر الحسن نے اپنی طرف سے وزیرِ مملکت جاوید ہاشمی کو بھی جلسہ وجلوس کی قیادت کے لیے دعوت دی ہے۔ اب مسئلہ پیدا ہو گیا کہ اس کا کیا حل نکالا جائے؟ میں نے کہا کہ اس میں پریشانی والی کوئی بات نہیں ہے بلکہ خوشی کی بات ہے کہ دونوں وزراء کی آمد سے رونق دوبالا ہو جائے گی۔ اس طرح میری تجویز پر اتفاق ہو گیا اور معاملہ بڑی خوش اسلوبی سے طے پا گیا۔ دونوں وزراء نے تقریب میں شرکت کر کے رونق بخشی۔ بعد میں محمد خان جونیجو وزیرِ اعظم اور مسلم لیگ کے صدر بنے اور آج جاوید ہاشمی مسلم لیگ (نواز گروپ) کے قائم مقام صدر ہیں۔

قومی اتحاد کی حکومت سے علیحدگی کے بعد جنرل ضیاءُ الحق کے مشیروں نے انہیں انتخابات سے بچنے کے لیے مشورہ دیا کہ قومی اسمبلی کے متبادل مجلسِ شوریٰ قائم کر کے اُمورِ مملکت چلائے جائیں۔ 24/دسمبر 1981ء کو حکومت نے ہر حلقۂ انتخاب سے بااثر افرد کو نامزد کر کے مجلسِ

شوریٰ بنادی۔ حسبِ روایت بڑی سیاسی جماعتوں کو توڑنے کی کوشش کی گئی۔ اُس وقت مسلم لیگ کے صدر پیر صاحب پگاڑو اپنے آپ کو جنرل ہیڈکوارٹرز (جی ایچ کیو) کا آدمی کہلواتے تھے۔ اس لیے حکومت نے اُن سے بھی مجلسِ شوریٰ کے لیے نام تجویز کرنے کو کہا۔ انہوں نے اپنی پارٹی کے جن لوگوں کو نامزد کیا اُن میں ملتان سے میرا نام شامل تھا۔ ضلع ملتان سے حکومت نے مخدوم سجاد حسین قریشی، دیوان غلام عباس بخاری، سیّد احمد نواز شاہ گردیزی، خورشید خان کانجو، نفیس احمد انصاری، الحاج شیخ محمد رشید، خان دلاور خان کھچی، میجر (ر) آفتاب احمد خان ڈاہا، میاں غلام حیدر وائیں، خواجہ محمد یوسف، شیخ امداد حسین، ڈاکٹر خاور علی شاہ، چوہدری عبدالستار، بیگم فرخ مختار اور بیگم مولوی محمد فیضان کو نامزد کیا۔

کہروڑ پکا، لودھراں کے محمد صدیق خان کانجو میرے دوست تھے۔ کہروڑ پکا میں ان کے مخالفین میں سے ایک شخص کا قتل ہوگیا۔ رکن مجلسِ شوریٰ خورشید خان کانجو مقتول پارٹی کی حمایت کررہے تھے۔ اُن کا سیاسی طور پر سیّد فخر امام سے تعلق تھا۔ اُس وقت سیّد فخر امام نا صرف وفاقی وزیر بلدیات و دیہی ترقی تھے بلکہ چیئرمین ضلع کونسل، ملتان بھی تھے۔ میں نے موقع پر پہنچ کر حالات کا جائزہ لیا اور اسسٹنٹ کمشنر، لودھراں منیر اکبر سے ملاقات کی مگر صدیق کانجو پر مارشل لا کے تحت قتل کا مقدمہ درج کردیا گیا۔

میں صدیق کانجو کو لے کر اسلام آباد چلا گیا جہاں ہم دونوں گورنمنٹ ہوسٹل کے کمرے میں اکٹھے رہے۔ اس دوران میں نے اُن کی راجہ محمد ظفر الحق سے بھی ملاقات کروائی، وہ بھی صدیق کانجو کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ میں نے صدیق کانجو کی گورنر پنجاب جنرل جیلانی سے بھی ملاقات کروائی۔ جب پنجاب اسمبلی لاہور میں گورنر پنجاب، ملتان ڈویژن کے اراکینِ مجلسِ شوریٰ کے اجلاس کی صدارت کررہے تھے تو خورشید کانجو نے کہروڑ پکا قتل کیس میں ملوث افراد کی گرفتاری عمل میں نہ لانے کا مسئلہ اُٹھایا۔ گورنر نے فوراً کہا کہ تم کیا چاہتے ہو کہ میں تمہارے کزن کو پھانسی پر لٹکادوں؟ جس پر وہ خاموش ہوگئے۔ میں نے دیگر دوستوں کے تعاون سے گورنر پنجاب سے یہ مقدمہ ختم کروایا اور یوں صدیق کانجو کی جان بخشی ہوئی۔

میں چچا رحمت حسین کے ہمراہ چوہدری عباس علی کی شادی میں شرکت کے لیے لاہور جارہا تھا کہ اُوکاڑہ کے قریب میری، میرے بہنوئی مخدوم وجاہت حسین اور ہمشیرہ سے ملاقات

ہوگئی۔ انہوں نے ماموں اقبال محمود کے قتل کی افسوس ناک خبر سنائی۔ ان کے قتل کی خبر سن کر بہت دکھ ہوا۔ ہم وہیں سے اکٹھے رحیم یار خان کے لیے روانہ ہوگئے اور ماموں کی نمازِ جنازہ میں شرکت کی۔ ان کے دوستوں میں جہانگیر خان ترین، صدیق کانجو، دیوان عاشق حسین، نور بھابھہ، مشتاق شاہ کھگہ اور آغا تراب علی عرف چکی شامل تھے۔ انہوں نے اپنے والد کا کاروبار مکمل طور پر سنبھال رکھا تھا۔ ہم جب بھی جمال الدّین والی جاتے تو انہی کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ اتنا بڑا سانحہ تھا کہ نانا غم سے نڈھال ہوگئے۔ میں نمازِ جنازہ کے بعد نانا کے ہمراہ حویلی کی طرف جا رہا تھا کہ وہ اچانک گرنے لگے۔ میں نے فوراً انہیں سنبھالنے کی کوشش کی تو انہوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے دور کر دیا۔ حویلی کا دروازہ بند ہونے کے بعد انہوں نے اس بات کی وضاحت یوں کی کہ میرے دشمن دیکھ رہے تھے کہ آج غلام میراں مر گیا ہے، اس لیے میں نے تمہارا سہارا لینے سے انکار کر دیا تا کہ صفِ دشمناں کو خبر ہو سکے کہ غلام میراں ابھی زندہ ہے۔ اگر چہ وہ مضبوط شخصیت کے مالک تھے مگر بیٹے کے قتل نے اُنہیں اعصابی طور پر کمزور کر دیا تھا۔

ماموں اقبال محمود نہایت ہی غریب پرور شخص تھے۔ میری اُن سے آخری ملاقات بہاولپور میں پھوپھا احمد نواز گردیزی کی نمازِ جنازہ کے موقعہ پر ہوئی تھی۔ وہ مجھے خاصے پریشان دکھائی دیے کیونکہ چند لوگوں نے نانا اور اُن کے درمیان غلط فہمی پیدا کروادی تھی جو بعد میں دور ہو گئی۔ اس موقعہ پر ماموں نے کہا تھا کہ مجھے اس وقت سے خوف آ رہا ہے کہ خدانخواستہ میرے والد کو اگر کچھ ہوگیا تو یہ صدمہ میرے لیے برداشت کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ مجھے ان کی باتوں سے محسوس ہوا کہ انہیں اپنے والد سے کتنا عشق تھا۔ اُنہیں کہاں معلوم تھا کہ وہ اپنے والد سے پہلے ہی زندگی کی بازی ہار جائیں گے اور یہ صدمہ برداشت کرنا والدین کے لیے بہت بڑا امتحان ہوگا۔

میری نانی، ماموں اقبال محمود کے دوستوں میں سے صدیق کانجو کو پسند کرتی تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ وہ میرے بالُو (اقبال) کی شکل کا ہے۔ آج صدیق کانجو بھی دنیا میں نہیں رہا۔

15 اپریل 1982ء کو چچا رحمت حسین کا انتقال ہوگیا۔ وہ والد کے دوست اور غمگسار ساتھی تھے۔ والد کی وفات کے بعد وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے تھے اور تقریبات میں بہت کم جاتے تھے۔ وہ نہایت سادہ، نیک نیت، مخلص، مردم شناس اور نظم وضبط کا پیکر تھے۔ مشکل ترین ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے نبھاتے تھے۔ سیاست میں اُنہیں بڑے بڑے معرکوں کا سامنا کرنا

پڑا لیکن انہیں اللہ تعالیٰ نے اکثر کامیابی سے نوازا۔ دو مرتبہ ایم پی اے منتخب ہوئے۔ انہوں نے 1954ء میں تایا ولائیت حسین کی وفات کے بعد اُن کی جگہ ایم ایل اے کی نشست سے ضمنی انتخاب میں ملک عطاء اللہ کی زرِضمانت ضبط کروائی اور دوسری مرتبہ صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان کی نشست پر بلا مقابلہ کامیاب ہوئے۔ انہوں نے چیئرمین ڈسٹرکٹ بورڈ، ملتان کے انتخاب میں سیّد فخر امام کے چچا پیر سیّد نو بہار شاہ کو شکست دی۔ انہوں نے قومی اتحاد کی تحریک میں حصہ لیا اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔

میرے وفاقی اور صوبائی وزراء سے اچھے مراسم تھے، خصوصاً وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات راجہ محمد ظفر الحق اور پنجاب کے وزیرِ خزانہ نواز شریف کے ساتھ۔ جب 1982ء میں تحصیل لیہ کو ضلع کا درجہ دیا گیا تو اُس کی افتتاحی تقریب میں راجہ ظفر الحق مجھے خاص طور پر اپنے ساتھ لے گئے۔ اس کے علاوہ بھی راجہ صاحب اور میں نے غلام حیدر وائیں کی دعوت پر اکٹھے میاں چنوں کا دورہ کیا۔

جنرل ضیاءُ الحق ایک جلسۂ عام میں شرکت کے لیے ڈیرہ غازی خان گئے۔ اس سے ایک رات قبل میں اور غلام حیدر وائیں وہاں پہنچے تو ہمیں قیام کے لیے ایک معمولی سے ہوٹل میں جگہ ملی۔ وائیں صاحب مسلم لیگ کے محنتی کارکن تھے، اُنہوں نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے عہدیداروں کو مدعو کیا ہوا تھا اور وہ تمام وقت اُن کے مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔ دوسرے روز جلسہ کے دوران زبردست آندھی چلی اور طوفان آ گیا جس سے ہزاروں لوگ شامیانوں کے نیچے دب گئے، جلسہ درہم برہم ہو گیا، کھانے کی پکی ہوئی دیگیں اُلٹ گئیں۔ چھوٹا شہر ہونے کے ناطے ڈیرہ غازی خان کی تمام دکانیں اور ہوٹل کھانے پینے کی اشیاء سے خالی ہو گئے۔ اکثر احباب کو کھانے کے لیے کچھ نہ ملا۔ میرے لیے غلام حیدر وائیں نے ہوٹل میں کھڑے ہو کر خود کھانا بنوایا۔

1983ء میں بلدیاتی انتخابات کے اعلان کے ساتھ ہی ملک بھر کی طرح ملتان میں بھی نئی سیاسی صف بندی شروع ہو گئی۔ چچا حامد رضا نے اپنے روایتی حریف مخدوم سجاد حسین قریشی سے اتحاد کر لیا۔ بوسن خاندان کی بھی قریشی خاندان کے ساتھ چچا کی وجہ سے مصالحت ہو گئی۔ میرے لیے خاصی پریشانی تھی کیونکہ میرا تعلق مسلم لیگ سے تھا جس میں میرے ساتھی پیر ثناء اللہ بودلہ اور

غلام حیدر روائیں بھی شامل تھے۔ بودلہ صاحب کا مقامی طور پر پیر شجاعت حسنین قریشی سے اختلاف تھا۔ مجھ سے غلام حیدر روائیں نے کہا کہ اگر آپ قریشی گروپ سے مصالحت نہ کریں تو ہم آپ کو اُن کے مقابلے میں زیادہ ووٹ دلوائیں گے۔ گیلانی گروپ نے غلام حیدر روائیں کی تجویز سے اتفاق نہ کیا اور وہ سیاسی طور پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے۔ غلام حیدر روائیں اکثر کہا کرتے تھے کہ ہم آپ کے شامیانے اور دریاں بچھانے والے کارکنوں میں سے ہیں۔

میں نے ضلع کونسل، ملتان کی نشست جو کہ تین یونین کونسل شیر شاہ، حامد پور اور کھوکھر پر مشتمل تھی، سے انتخاب میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ سیّد تنویر الحسن نے بھی خواہش ظاہر کی کہ وہ بھی اسی حلقے سے انتخاب میں حصہ لینا چاہتے ہیں۔ اس دوران میری ملاقات چچا حامد رضا سے ہوئی۔ اس ملاقات کے دوران اُن کے پرانے گھر 'الرضا' میں اچانک چھت کا پنکھا گرنے سے اُن کے دفتر کی میز کا شیشہ ٹوٹ گیا، پنکھے کے پر بکھر گئے اور ہم بال بال بچ گئے۔ چچا نے کہا کہ شیشہ ٹوٹنا نیک شگون ہے لہٰذا آپ انتخاب جیت جائیں گے۔ مزید کہا کہ اگر آپ ضلع کونسل کے انتخاب میں حصہ لینا چاہتے ہیں تو سیّد تنویر الحسن اس شرط پر آپ کے مدِ مقابل نہیں آئیں گے کہ عام انتخابات میں آپ اُمیدوار نہیں ہوں گے بلکہ میں خود اور سیّد تنویر الحسن حصہ لیں گے۔ میرے نزدیک یہ ایک موزوں تجویز تھی جسے میں نے تسلیم کر لیا اور یوں گیلانی خاندان کا مکمل اتحاد ہو گیا اور میں بلدیاتی انتخاب میں کود پڑا۔

سابق وزیرِ اعلیٰ پنجاب صادق حسین قریشی کے گھر 'وائٹ ہاؤس' ملتان میں ایک اہم اجلاس ہوا، جس میں مخدوم عنایت علی شاہ، سجادہ نشیں دربار حضرت شیر شاہؒ، مخدوم علمدار حسین (میرے والد کے ہم نام)، سیّد احسن شاہ اور پیر شجاعت حسنین قریشی شریک ہوئے۔ انہوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ میرے مدِ مقابل مخدوم عنایت علی شاہ کی حمایت کی جائے تاکہ میں ضلع کونسل کی بنیادی نشست پر شکست کھا جاؤں کیونکہ اُس وقت چیئرمین بننے کے لیے رکن ضلع کونسل ہونا ضروری تھا۔ میرے مدِ مقابل دوسرے اُمیدوار ملک سلیم اصغر کھوکھر تھے جن کو کھوکھر خاندان اور سابق ایم پی اے سیّد ناظم حسین کی مکمل حمایت حاصل تھی۔

دورانِ انتخاب ہمارے 'گیلانی قریشی اتحاد' کے باوجود شاہ محمود کے بہنوئی سیّد احسن شاہ نے میری مخالفت شروع کر دی۔ میں نے احتجاجاً اپنے بہنوئی مخدوم وجاہت حسین کو جاوید

ہاشمی کے بھائی مختار ہاشمی کے حق میں غیر مشروط طور پر جلسہ کرنے کے لیے بھیج دیا۔ ماضی میں جاوید ہاشمی کا تعلق گیلانی گروپ سے ہونے کے باوجود گیلانی قریشی اتحاد کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے۔ اس حلقے میں شاہ محمود اپنے سیاسی کیریئر کے آغاز ہی میں شکست کھا گئے۔

میرے سسر پیر اسرار حسین کی دوستی میرے مدِ مقابل اُمیدوار مخدوم عنایت علی کے بہنوئی سیّد علی رضا سے تھی۔ اُن دونوں کا تعلق ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ سے تھا اور اُن کا مقامی طور پر سیاسی اتحاد بھی تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ میں کمزور اُمیدوار ہوں اور انتخاب ہار جاؤں گا۔ وہ دونوں اکٹھے میرے پاس آئے اور مجھے مخدوم عنایت علی شاہ کے مقابلے سے دستبردار ہونے کے لیے کہا۔ میں نے اُنہیں قائل کرنے کی بے حد کوشش کی کہ میں کمزور امیدوار نہیں ہوں مگر وہ نہ مانے، لہٰذا میں نے دستبردار ہونے سے معذرت کر لی۔ اُس وقت پیر صاحب کو مایوسی ہوئی مگر چند دنوں بعد نتیجہ نکلا تو اُن کی توقعات کے برعکس میں بھاری اکثریت سے ضلع کونسل کی نشست پر کامیاب ہو گیا۔ انتخابی لحاظ سے یہ میری پہلی کامیابی تھی۔

رکن ضلع کونسل پیر ریاض حسین قریشی نے ہماری حمایت کا اعلان کر دیا اور کہا کہ میں آپ کی حمایت ذاتی حیثیت میں کر رہا ہوں۔ انہوں نے مزید کہا کہ شاہ محمود ضلع کونسل کے انتخاب میں شکست کی وجہ سے خاصے دلبرداشتہ ہیں، لہٰذا آپ مخدوم سجاد حسین اور شاہ محمود کے پاس جائیں اور میرا ووٹ مانگیں۔

اس واقعہ سے قبل میں نے اپنے چچازاد بھائی مخدوم وجاہت حسین کے سجادہ نشیں بننے پر مخدوم سجاد حسین کے ہمراہ حضرت بہاؤ الدّین زکریاؒ کی درگاہ پر حاضری دی تھی۔ والد کی زندگی میں مَیں کبھی مخدوم سجاد حسین قریشی کے گھر نہیں گیا تھا۔ سیاسی طور پر یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں چچا حامد رضا کے ہمراہ اُن کے گھر 'باب القریش' ملتان گیا۔ ہم نے مخدوم سجاد حسین اور شاہ محمود سے ریاض قریشی کا ووٹ مانگا۔ اُن کے گھر میں ایک دلچسپ واقعہ اس وقت پیش آیا جب قریشی گروپ کے معتمد ساتھی پیر سیّد رضی شاہ گردیزی نے ڈرائنگ روم کے دروازے کو ٹھوکر مار کر زور سے کھولا جس کی آواز سے ہم سب چونک گئے، انہوں نے بھرپور احتجاج کیا کہ ریاض قریشی کا ووٹ گیلانی گروپ کو نہیں جانا چاہیے۔ گردیزی صاحب نے مزید کہا کہ وہ آئندہ اس گھر میں قدم نہیں رکھیں گے اور یہ کہہ کر وہ وہاں سے رخصت ہو گئے۔ اس موقعہ پر چچا حامد رضا نے برجستہ کہا:

"So short and so sweet."۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد گردیزی صاحب مخدوم سجاد حسین کے گھر نہیں گئے۔

گیلانی گروپ نے مجھے چیئرمین ضلع کونسل اور ملک مشتاق احمد لانگ کو نائب چیئرمین کے عہدے کے لیے نامزد کر دیا۔ اس فیصلے کی وجہ سے دیوان عاشق حسین نے فخر امام گروپ میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ ہمارا گروپ عملاً ٹوٹ گیا، انتخاب جیتنا مشکل ہو گیا اور ہم تمام خصوصی نشستیں بھی ہار گئے۔ ہم نے دیوان عاشق کا مطالبہ مانتے ہوئے نائب چیئرمین کے لیے اپنا اُمیدوار تبدیل کر دیا اور مہر ظفر احمد ہراج کا نام تجویز کیا مگر اس کے باوجود دیوان عاشق ہماری حمایت کے لیے رضامند نہ ہوئے۔ دیوان غلام عباس نے نہایت بردباری کے ساتھ ایک تجویز اپنے صاحبزادے کے سامنے رکھی کہ ہم دو ناموں یعنی سیّد یوسف رضا اور سیّد فخر امام کے لیے قرآن پاک پر قرعہ اندازی کر لیتے ہیں جس کے نام کا قرعہ نکلے گا شجاع آباد کا 'سیّد گروپ' اس کی بھرپور حمایت کرے گا۔ اس گروپ میں سابق اراکینِ صوبائی اسمبلی دیوان غلام عباس بخاری اور پیر صدر الدّین شاہ کے علاوہ سابق رکن ضلع کونسل، ملتان پیر فخر الدّین شاہ نمایاں تھے۔

شیر شاہ کے سجادہ نشیں سے پرچی اس دعا کے ساتھ نکلوائی گئی کہ ان دونوں اُمیدواروں میں سے جو بھی ملک وقوم کے لیے بہتر ہو اس کی پرچی نکلے۔ بڑے دیوان صاحب نے مجھے کہا کہ میرا دل کہہ رہا ہے کہ آپ ہی کی پرچی نکلے گی۔ جب پرچی اٹھائی گئی تو قرعہ میرے نام نکلا۔ اس طرح 'سیّد گروپ' بشمول دیوان عاشق نے نہ صرف مجھے ووٹ دیا بلکہ میری بھرپور حمایت بھی کی۔ بڑے دیوان صاحب نے اپنے بیٹے دیوان عاشق کو نصیحت کی کہ اَب یوسف رضا کا ساتھ نہ چھوڑنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ دیوان عاشق کو میں اُن کی نفاست کی بنا پر Flower of the Desert (صحرا کا پھول) کہتا ہوں۔ ذوالفقار علی بھٹو نواب شاہ، سندھ سے ایم پی اے ظفر علی شاہ کو اُن کی نفیس شخصیت کی بنا پر اکثر اس نام سے پکارتے تھے۔ بعد میں وہ وفاقی وزیرِ صنعت اور ڈپٹی سپیکر قومی اسمبلی رہے۔ ان انتخابات میں میرے ایک حامی رکن میجر (ر) افضل خان ڈاہا کے خلاف فخر امام گروپ نے عدالت سے حکم امتناعی لے لیا۔ سیّد تصدق حسین جیلانی (موجودہ جج سپریم کورٹ) اور سردار آصف سعید خان کھوسہ (موجودہ جج ہائی کورٹ) اُن دنوں ملتان میں وکالت کرتے تھے۔ اُن کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کی بدولت افضل خان ڈاہا کے خلاف حکم امتناعی خارج

کروایا گیا۔

چیئرمین ضلع کونسل، ملتان کا انتخاب بڑا کانٹے دار تھا۔ جب نتیجہ نکلا تو میں دو ووٹوں کی برتری سے جیت گیا۔ اس فتح پر عوام نے مجھے کندھوں پر اٹھا لیا۔ وائس چیئرمین کے لیے مہر ظفر احمد ہراج بھی کامیاب ہو گئے۔

چیئرمین ضلع کونسل منتخب ہونے پر مجھے گورنر جیلانی نے فون پر مبارکباد دی۔ ساتھ ہی انہوں نے دریافت کیا کہ سیّد فخر امام نے وزارت سے استعفیٰ دیا ہے یا نہیں؟ میں نے جواب دیا کہ مجھے معلوم نہیں۔ جس پر گورنر برجستہ بولے کہ اگر انہوں نے استعفیٰ نہیں دیا تو ہم از خود لے لیں گے جیسے ہم نے مانیکا سے لیا تھا۔ غلام محمد مانیکا صوبائی وزیر بلدیات تھے اور چیئرمین ضلع کونسل، ساہیوال کا انتخاب ہار گئے تھے۔ سیّد فخر امام نے وفاقی وزارت کے عہدے سے استعفیٰ دے کر سیاست میں ایک جدّت پیدا کی۔ ان کا یہ فیصلہ اصولوں کی پاسداری کا مظہر ہے۔

ضلع ملتان اِس وقت کے تین اضلاع ملتان، لودھراں اور خانیوال پر مشتمل تھا جس میں بے پناہ مسائل تھے اور میں ناتجربہ کار۔ سیّد فخر امام 1979ء میں وفاقی وزیر بلدیات و دیہی ترقی کے علاوہ چیئرمین ضلع کونسل بھی تھے۔ وہ شکست کھانے کے بعد قائدِ حزبِ اختلاف ضلع کونسل، ملتان بن گئے۔ اُس دور میں کئی نشیب و فراز آئے، کئی لوگوں کے کام ہوئے اور کچھ لوگوں کے کام نہ ہو سکے مگر میں اپنے آپ کو بطور چیئرمین اس لیے کامیاب تصور کرتا ہوں کہ جب دوبارہ 1986ء میں دو اضلاع ملتان اور خانیوال کے ضلع کونسل کے انتخاب ہوئے تو دونوں اضلاع میں میرا ہی گروپ کامیاب ہوا۔

1981ء میں مجھے وفاقی کونسل کا رکن نامزد کر دیا گیا۔ بعد ازاں میں چیئرمین ضلع کونسل، ملتان منتخب ہو گیا اور بطورِ چیئرمین ضلع کونسل بلحاظِ عہدہ صوبائی کونسل کا رکن بھی بن گیا۔ صوبائی اسمبلی کا اجلاس گورنر جیلانی کی زیرِ صدارت ہوا۔ جس میں مَیں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ دنیا میں بہت سے مخیّر حضرات نے ٹرسٹ، سکول، ہسپتال وغیرہ بنوائے ہیں جنہیں اُن کے نام سے نسبت دی گئی ہے جو اُن کی خدمات کا اعتراف ہیں، اسی طرح میرے خاندان کی کاوشوں سے رضا ہال، نشتر کالج و ہسپتال اور گیلانی لا کالج، ملتان پایہ تکمیل کو پہنچے۔ میں نے تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اُن کے نام تبدیل کر دیے گئے ہیں، لہٰذا اُن حضرات کو مایوس کرنے کی بجائے حوصلہ افزائی کرنی

چاہیے تاکہ زیادہ سے زیادہ فلاحی کام ہو سکیں۔

گورنر جیلانی نے میرے مطالبے پر رضا ہال اور گیلانی لا کالج، ملتان کے نام بحال کرنے کے احکامات جاری کر دیے اور نشتر ہسپتال، ملتان میں میرے والد کے نصب شدہ سنگِ بنیاد کو دوبارہ نصب کرنے اور ساتھ ہی والد کا پورٹریٹ اناٹمی بلاک میں آویزاں کرنے کے احکام جاری کیے۔ اس سے قبل رضا ہال کا نام تبدیل کر کے پیپلز ہال اور گیلانی لا کالج کا نام گورنمنٹ لا کالج کر دیا گیا تھا حالانکہ یہ منصوبے میرے خاندان کی انتھک کاوشوں کا نتیجہ تھے اور اسی نسبت سے ان کے نام رکھے گئے تھے۔

میں نے بطور چیئرمین ضلع کونسل، ملتان 'کھیتوں سے منڈی تک' سکیم کے تحت ایشیائی ترقیاتی بینک* کی امداد سے ایک سو کلومیٹر سڑکیں تعمیر کروائیں۔ ملتان انڈسٹریل اسٹیٹ کو شیر شاہ بائی پاس اور مظفر آباد ہائی وے سے منسلک کروادیا۔ لودھراں پبلک سکول اور ملتان پبلک سکول کے قیام میں خصوصی دلچسپی لی۔ ملتان پبلک سکول کے لیے ضلع کونسل سے زمین بھی دلوائی، ابتدائی کام کا آغاز کروایا اور رابطہ سڑک بھی دی۔ سڑکوں، بجلی اور سیوریج کی کئی نئی سکیموں کو مکمل کروایا۔ ملتان سٹیڈیم کے لیے ضلع کونسل سے زمین کا بندوبست و ابتدائی کام کروایا اور حکومت سے خصوصی طور پر زرعی کالج، انجینئرنگ کالج، ملتان اور شوگر مل میاں چنوں جیسے منصوبے منظور کروائے۔ اس کے علاوہ سڑکوں اور بجلی کے لیے پچاس کروڑ روپے کی گرانٹ دلوائی، کئی بیروزگار اور مستحق لوگوں کو روزگار فراہم کیا گیا۔

تقریباً نصف صدی بعد ای پی مون برطانیہ سے ملتان آئے اور اُن خاندانوں اور افراد سے ملاقات کی جن سے اُن کا تعلق رہا تھا جس میں گیلانی خاندان بھی شامل تھا۔ کسی نے اُن سے دریافت کیا کہ آپ نے اپنے روایتی حریف گیلانی خاندان (تفصیلات صفحہ 26) میں کیا تبدیلی دیکھی؟ انہوں نے جواب دیا:

"The only change I've seen amongst Gilanis is that they've started smoking."

ترجمہ: میں نے گیلانیوں میں صرف ایک تبدیلی دیکھی ہے کہ انہوں نے سگریٹ نوشی شروع کر دی ہے۔ تاہم انہیں معلوم نہیں تھا کہ گیلانی خاندان کے مجھ سمیت کئی افراد اَب بھی سگریٹ نوشی نہیں کرتے۔

---

* Asian Development Bank (ADB)

ایم پی اے غلام قاسم بوسن کے ہمراہ شاخ مدینہ، ملتان کی ایک سڑک کے افتتاح کے موقعہ پر جلسے سے خطاب کرتے ہوئے میں نے کہا کہ یتیم وہ نہیں جس کے ماں باپ نہیں بلکہ وہ ہے جس کے پاس علم نہیں۔ غلام قاسم بوسن کم تعلیم یافتہ تھے، انہوں نے سمجھا کہ شاید میں ان پر تنقید کر رہا ہوں۔ انہوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یتیم وہ نہیں جس کے پاس علم نہیں بلکہ وہ ہے جس کے سجن (دوست) نہیں۔ آج وہ دنیا میں نہیں ہیں مگر اُن کی بات زندہ ہے اور مجھے بائیس برس بعد اُس بات کی قدر شدت سے محسوس ہو رہی ہے کیونکہ میں اس وقت سنٹرل جیل اڈیالہ، راولپنڈی میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہا ہوں اور مجھے ملنے کے لیے کئی دوست آتے ہیں جن کی وجہ سے میرے حوصلے بلند ہیں۔

1984ء میں جنرل ضیاءُالحق نے صدراتی ریفرنڈم کا اعلان کیا اور ساتھ ہی ہر ڈویژنل ہیڈ کوارٹر پر بلدیاتی اداروں کے ذریعے مہم شروع کر دی۔ ریفرنڈم کے جلسۂ عام سے قبل میری دعوت پر نواز شریف، ملتان تشریف لائے۔ میں نے انہیں ضلع کونسل سے خطاب کرنے کی دعوت دی جو انہوں نے قبول کر لی۔ میں نے اپنے گھر میں اُن کے اعزاز میں ظہرانے کا اہتمام بھی کیا۔ یوں پہلی مرتبہ وہ میرے گھر 'گیلانی ہاؤس' ملتان آئے ۔ میں میاں صاحب کو مخدوم سجاد حسین، سیّد احسن شاہ، سیّد عباس اکبر شاہ عرف مونی شاہ، حاجی عرفان خان ڈاہا، سردار اللہ یار ہراج اور صدیق کانجو کے پاس لے کر گیا۔ جب میں میاں صاحب کو صدیق کانجو کے پاس کہروڑ پکا لے گیا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ کیوں ان کو ہر جگہ ساتھ لے کر پھر رہے ہیں؟ میں نے کہا کہ میری خواہش ہے کہ یہ مستقبل کے وزیرِ اعلیٰ پنجاب ہوں۔ انہوں نے طنزاً کہا کہ آپ کے چچا حامد رضا، ملک اللہ یار کھنڈا کو وزیرِ اعلیٰ بنانا چاہتے ہیں اور آپ نواز شریف کو، بہتر ہو گا آپ چچا بھتیجا کسی ایک اُمیدوار پر متفق ہو جائیں۔

گیلانی گروپ کے مخالفین نے گورنر جیلانی سے شکایت کی کہ نواز شریف کا ملتان میں ایک ہی گروپ کی طرف جھکاؤ ہے جس کے نتیجہ میں اس وقت کے صوبائی وزیر بریگیڈئر غضنفر کو ملتان ڈویژن کے سیاسی عمائدین سے رابطہ کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ بریگیڈئر صاحب سابق گورنر پنجاب نواب مشتاق احمد گورمانی کے داماد تھے اور اُن کے مقامی طور پر صادق حسین قریشی اور سیّد فخر امام سے تعلقات تھے۔ ریفرنڈم کے انتظامات کمشنر ملتان فریدالدّین شیخ کی زیرِ نگرانی

شروع ہو گئے۔ مجھے کمشنر ملتان نے پہلے سے لکھی ہوئی تقریر دی جو مجھے سپاس نامہ کے طور پر پڑھنی تھی۔ میں نے اَز سرِ نو دو صفحات پر مشتمل نئی تقریر تیار کی۔ میں نے جلسہ عام کے موقعہ پر جنرل ضیاءُالحق کی موجودگی میں کہا کہ جنرل صاحب! آپ نے ملک کی باگ ڈور سنبھالتے وقت قوم سے نوے دن کے اندر عام انتخابات کروانے کا وعدہ کیا تھا، آج اس جلسۂ عام میں قوم سے کیا ہوا اپنا وعدہ پورا کریں اور انتخابات کا اعلان کریں۔ قلعہ کہنہ قاسم باغ کا سٹیڈیم تالیوں سے گونج اٹھا، کمشنر ملتان کی حالت قابلِ دید تھی۔

میں نے اپنے سپاس نامہ میں انتخابات کے مطالبے کے علاوہ ملتان میں انجینئرنگ کالج، زرعی کالج، شوگر مل، بجلی و سڑکوں کے لیے خصوصی فنڈز کا مطالبہ بھی کیا، میری تقریر سے گورنر پنجاب خفا ہو گئے۔ انہوں نے جلسے کے دوران جنرل ضیاءُالحق کے کان میں کوئی بات کی۔ اُسی لمحے اذان ہو گئی، چند لمحوں کے لیے احتراماً جلسے کی کارروائی روک دی گئی۔ اس دوران گورنر جیلانی، جنرل ضیاءُالحق کو پنڈال کی طرف لے کر چل پڑے۔ پنڈال میں نواب صادق حسین، سیّد فخر امام اور جاوید ہاشمی اگلی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جنرل ضیاءُالحق، نواب صادق حسین اور سیّد فخر امام کو اپنے ہمراہ سٹیج پر لے کر واپس آ گئے۔ اس موقعہ پر گورنر پنجاب نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ کو کیسا لگ رہا ہے کہ ہم نے آپ کو بیلنس کر دیا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہم نے آپ کو ابھی کئی اور سرپرائز دینے ہیں۔

آخر کار وہ گھڑی آ گئی جس کا سب کو بڑی شدت سے انتظار تھا کہ جنرل ضیاءُالحق میری تقریر کا جواب کیا دیں گے۔ جنرل ضیاءُالحق نے اپنی تقریر کی ابتداء یوں کی کہ یہ شہر گیلانیوں، جیلانیوں اور خاکوانیوں کا ہے۔ یاد رہے کہ اس وقت غلام قاسم خان خاکوانی میئر تھے۔ انہوں نے مزید کہا کہ یوسف رضا نے ملتان کے لیے انجینئرنگ کالج، زرعی کالج، شوگر مل، سڑکوں اور بجلی کے لیے فنڈز مانگے ہیں، میں اُن کے مطالبات منظور کرتا ہوں۔ عوام نے بھرپور تالیوں سے اس کا خیر مقدم کیا۔ اسی دوران گورنر جیلانی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ اب آپ سرپرائز سنیں۔ اُسی وقت جنرل ضیاءُالحق نے اپنی تقریر کے دوران کہا کہ میں آج خانیوال کو ضلع کا درجہ دینے کا اعلان کرتا ہوں۔ عوام سمجھ گئے کہ اب یوسف رضا کا ضلع کونسل، ملتان کے چیئرمین کا عہدہ ختم ہو گیا کیونکہ نئے ضلع کے قیام کے بعد اب اَز سرِ نو دونوں اضلاع میں چیئرمین کا

انتخاب ہوگا۔عوام نے جلسے کے اختتام پر مجھے کندھوں پر اُٹھالیا۔وہاں نواز شریف سمیت صوبائی وزراء کی کثیر تعداد بھی موجود تھی۔

جلسے کے اختتام پر جب میری ملاقات چچا حامد رضا سے ہوئی تو انہوں نے میری تقریر پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔اسی دوران میرے لیے گورنر جیلانی کا فون آیا، چچا نے یہ تاثر لیا کہ شاید گورنر تقریر کے بارے میں باز پُرس کرنا چاہتے ہیں۔انہوں نے مجھے کہا کہ آپ چاہیں تو تنہائی میں فون سن لیں۔میں نے جواب دیا کہ آپ کی موجودگی ہی میں بات کروں گا۔

گورنر جیلانی نے کہا کہ گیلانی صاحب! آپ کی تقریر سے عوام کو یہ تاثر ملا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ نہیں ہیں، آپ کے اس اقدام سے ریفرنڈم کے نتائج پر منفی اثر پڑے گا، لہٰذا آپ اس تاثر کو زائل کرنے کے لیے ہمارا ساتھ دیں۔انہوں نے تجویز دی کہ جنرل سروپ خان (جو اُس وقت ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر، ملتان تھے اور بعد میں گورنر پنجاب بھی رہے) آپ سے رابطہ کریں گے اور آپ کے ساتھ مل کر ضلع کا دورہ کریں گے۔جب میں نے چچا حامد رضا کو اس گفتگو سے مطلع کیا تو انہوں نے متاثر ہوتے ہوئے کہا کہ ہم آپ کو underestimate کر رہے تھے، آپ نے جس جرأت اور حوصلے کا مظاہرہ کیا ہے اُس سے ہمارے خاندان کا وقار مزید بلند ہوا ہے۔

میں نے ریفرنڈم کے روز ضلع ملتان کا دورہ کیا۔ابتداء رکن ضلع کونسل سید فخر الدین شاہ کے پولنگ سٹیشن شجاع آباد سے کی۔وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس پولنگ سٹیشن پر ووٹر لسٹ سے زیادہ ووٹ ڈالے جا چکے ہیں۔میرے کہنے پر اسسٹنٹ کمشنر شجاع آباد نے زیادہ ڈالے گئے ووٹ نکلوانے کا حکم دے دیا۔ریفرنڈم کے دوران ملک کے دیگر حصوں میں بھی اسی طرح ووٹ کا استعمال ہوا۔

شام ڈھلے نتیجے کا اعلان ہوا تو جنرل ضیاءُالحق پانچ سال کے لیے صدرِ مملکت منتخب ہو گئے۔اس ریفرنڈم سے جنرل ضیاءُالحق ایک متنازعہ شخصیت بن کر اُبھرے کیونکہ قوم ریفرنڈم کے سوال اور اس کے نتائج پر تقسیم ہو چکی تھی۔ریفرنڈم کے ووٹ کا متن درج ذیل تھا:

کیا آپ اسلام چاہتے ہیں؟

اگر آپ اسلام چاہتے ہیں تو آئندہ پانچ سال کے لیے ضیاءُالحق صدر رہوں گے۔

ہاں ____ نہیں ____

1985ء میں غیر جماعتی بنیادوں پر عام انتخابات کا اعلان ہو گیا۔ میں نے اس سلسلے میں اپنے گھر 'گیلانی ہاؤس' ملتان میں گیلانی گروپ کا ایک غیر رسمی اجلاس بلایا جس میں باقی چیدہ ارکان کے علاوہ چچا حامد رضا بھی شامل تھے۔ میں نے انہیں بلدیاتی انتخابات کے موقعے پر کیا ہوا اپنا وعدہ یاد کروایا جس کے تحت وہ اور میرے کزن سیّد تنویر الحسن عام انتخابات میں حصہ لیں گے۔ چچا نے کہا کہ انہیں فوج انتخابات میں حصہ نہیں لینے دے گی، لہٰذا میں ہی اُن کے حلقۂ انتخاب این اے 114 سے حصہ لوں۔ مگر چند دنوں بعد فوج نے انہیں اجازت دے دی تو انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ میں حلقہ این اے 116 سے انتخاب میں حصہ لوں۔ مگر اسی نشست کے لیے سیّد تنویر الحسن بھی خواہش مند تھے، لہٰذا میں نے یہ نشست اُن کے لیے چھوڑ دی۔ کچھ دنوں بعد چچا حامد رضا نے مجھ سے مشورہ کرتے ہوئے کہا کہ حلقہ 120 مخدوم رشید، جہانیاں ہمارے خاندان کی مضبوط نشست ہے، آپ اس حلقے سے جاوید ہاشمی کا مقابلہ کریں۔ میں نے اُن سے کہا کہ ہمارا خاندان پہلے ہی قومی اسمبلی کی دو نشستوں پر انتخاب میں حصہ لے رہا ہے، ہمیں اپنی تمام تر توجہ ان دو نشستوں پر مرکوز رکھنی چاہیے اور تیسری نشست سے انتخاب نہیں لڑنا چاہیے۔ مگر وہ بضد تھے کہ میں انتخاب میں حصہ ضرور لوں۔ میں نے اس سلسلے میں مخدوم سجاد حسین اور چوہدری اسلم رندھاوا سے بھی مشاورت کی۔ مخدوم صاحب بذاتِ خود انتخاب میں حصہ نہیں لینا چاہتے تھے بلکہ وہ صوبائی اسمبلی کی نشست پر اپنے بیٹے شاہ محمود کو سیاست میں متعارف کروانا چاہتے تھے، لہٰذا ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ قومی اسمبلی کی نشست پر میں خود اور صوبائی اسمبلی کی نشست حلقہ مخدوم رشید سے شاہ محمود اور حلقہ جہانیاں سے چوہدری اسلم رندھاوا حصہ لیں گے اور چوہدری عبدالرحمٰن ولہلہ کو انتخاب کے بعد سینٹ میں ایڈجسٹ کریں گے۔ اس موقعہ پر مخدوم سجاد حسین نے اپنے خلوص کا اعتبار دلواتے ہوئے کہا کہ قومی اسمبلی کا انتخاب صوبائی اسمبلی سے پہلے ہوگا جس کے نتائج سے آپ کو علم ہو جائے گا کہ ہم آپ سے کتنے مخلص ہیں۔ لیکن کسی نے چچا حامد رضا کو کہا کہ اس تجویز سے قریشی خاندان ناخوش ہے کہ گیلانی تین تین نشستوں سے قومی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لے رہے ہیں اور ہمیں ایک نشست بھی نہیں دے رہے۔ چچا نے جب مجھ سے اس بارے میں رائے لی تو میں نے انتخابات میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کیا۔ مخدوم سجاد حسین نے صوبائی اسمبلی کی نشست پر حسبِ وعدہ شاہ محمود کو انتخاب میں کھڑا کر دیا اور خود قومی اسمبلی کی نشست کے لیے نہ لڑے۔ این اے 120 سے

عبدالرحمٰن والہلہ نے انتخاب میں حصہ لیا مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

انتخاب کے لیے درخواستیں جمع کروانے کی آخری تاریخ سے ایک روز قبل چچا نے مجھے بے حد مجبور کیا کہ میں اپنی درخواست قومی اسمبلی کی نشست لودھراں کے لیے جمع کرواؤں۔ میں نے اُن سے معذرت چاہی مگر وہ نہ مانے۔ اُن دنوں درخواست دیتے وقت حلقۂ انتخاب سے تقریباً پچاس افراد بطور تجویز و تائید کنندہ درکار ہوتے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کو کہاں سے ڈھونڈوں گا۔ مگر اُن کے اصرار پر میں نے لودھراں سے انتخاب میں حصہ لینے کی حامی بھر لی۔

لودھراں سے دادا مخدوم غلام مصطفےٰ شاہ 1946ء میں اور والد 1951ء میں ایم ایل اے رہے تھے۔ جبکہ اس حلقے سے 1964ء میں چچا حامد رضا بلا مقابلہ ایم این اے منتخب ہوئے تھے۔ اس بات کو اکیس برس بیت گئے تھے۔ میرے لیے یہ حلقہ بالکل نیا تھا اور بطور چیئرمین ضلع کونسل اس حلقے سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑنا خاصا خطرناک بھی تھا اور ہارنے کی صورت میں شرمندگی کا باعث بھی۔ بہرحال میں نے درخواست جمع کروادی۔

میرے پاس لودھراں میں انتخابی مہم چلانے کے لیے کسی مناسب رہائش کا بندوبست نہ تھا، اس لیے میں نے ایک ماہ کی ایڈوانس رقم جمع کروا کے لودھراں میں ضلع کونسل کے ریسٹ ہاؤس میں ایک کمرہ بُک کروایا مگر اسسٹنٹ کمشنر لودھراں' جنید اقبال کے مشورے پر میں نے کمرے کی بکنگ منسوخ کروادی تا کہ کہیں آئندہ مجھ پر سرکاری وسائل کے استعمال کا ریفرنس نہ بن جائے۔ اس مقصد کے لیے میں نے کچھ عرصہ ڈاکٹر محمد اُمیر کے اندرون شہر واقع، پرانے گھر میں رہائش رکھی اور بعد ازاں منڈھالی موڑ پر میاں مجید جھنڈیر کے ڈیرے کو انتخابی کیمپ کے طور پر استعمال کیا۔ میرے لیے سب سے مشکل مرحلہ صوبائی اسمبلی کے اُمیدواروں کا چناؤ تھا۔ میں نے جندوڈے خان بلوچ اور مجید جھنڈیر کو صوبائی اسمبلی کے لیے اپنا اُمیدوار نامزد کر دیا جو دونوں میرے اراکین ضلع کونسل تھے۔ ان انتخابات میں میرے مقابلے میں سیّد نصر الدّین شاہ اور نواب ظفر اللہ خان (جو پاکستان قومی اتحاد کے ٹکٹ پر 1977ء کے انتخاب میں حصہ لے چکے تھے) میدان میں تھے۔

مجھے انتخابی مہم کے دوران معلوم ہوا کہ جمعیت العلماءِ اسلام، لودھراں کے صدر مولوی

محمد میاں گرفتار ہیں۔لودھراں کے عوام نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں اُن کی رہائی کے حق میں بیان دوں۔میں نے اُن کے حق میں بھرپور پریس کانفرنس کی، وہ کچھ دنوں بعد رہا ہو گئے اور انہوں نے میری حمایت کا اعلان کر دیا۔میں نے چند روز بعد لودھراں بار سے بھی خطاب کیا تو وکلا کی خاصی تعداد نے میرا ساتھ دیا۔اُن دنوں نہروں کی بندش کے باعث پانی کی سخت قلت تھی۔میں نے نہریں کھلوادیں اور جس دن نہروں میں پانی آیا عوام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے برملا کہنا شروع کر دیا کہ ہمارا ووٹ اُس کی امانت ہے جس کی بدولت ہمارے کھیت سیراب ہوئے ہیں۔

میرے اس انتخاب میں جندوڈے خان بلوچ، صدیق خان بلوچ، میاں اسلم جھنڈیر، میاں مجید جھنڈیر اور ڈاکٹر محمد امیر نے بڑی مدد کی۔میرے حلقۂ انتخاب میں ان کا بے پناہ اثر و رسوخ تھا۔میں نے انتخابی مہم کے دوران اپنی تقریروں میں پیشین گوئی کی کہ اس ملک کے وزیرِ اعظم محمد خان جونیجو، وزیرِ اعلیٰ پنجاب نواز شریف اور ریلوے کا وفاقی وزیر میں خود ہوں گا۔خدا کی قدرت دیکھیے کہ پھر ایسا ہی ہوا۔میرے دوست ڈاکٹر محمد اَمیر اور اُن کے بیٹے محمد طاہر غنی (جو عام انتخابات 2002ء میں مسلم لیگ (نواز گروپ) کے صوبائی اسمبلی کے اُمیدوار تھے)۔آج بھی لودھراں کی اکثر محفلوں میں اس بات کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں۔

میرے مخالفین نے انتخاب سے قبل میرے خلاف پروپیگنڈہ مہم تیز کر دی۔گیلانی خاندان پر تنقید کی کہ انہوں نے لودھراں کو اپنی انتخابی کالونی سمجھ رکھا ہے۔کچھ مخالفین نے جعلی ویڈیو تیار کروائی جس کی حقیقت یہ تھی کہ میرے کزن سیّد غلام یزدانی گیلانی (جو بعد میں میونسپل کارپوریشن، ملتان کے رکن رہے اور اب مسلم لیگ (ق) میں شامل ہیں) کی شادی کے موقعہ پر فلمسٹار گوری نے روایتی رقص پیش کیا جسے خاندان کے تمام افراد بشمول خواتین نے دیکھا۔شادی کے موقعہ پر تیار کی گئی اس ویڈیو کو ڈب کر کے غلط تاثر دینے کی کوشش کی گئی اور سینکڑوں کیسٹ تیار کروا کے میرے حلقے میں دکھائے گئے اور اُس کی کاپیاں صدر ضیاءُ الحق اور گورنر جیلانی کو بھی بھجوائی گئیں۔میرے حلقۂ انتخاب میں واقع چک ہمتہ میں میری پوزیشن خاصی کمزور تھی۔جب میں وہاں انتخابی جلسے کے لیے گیا تو میرے کارکنوں نے میرے کارناموں کے بارے میں تقاریر کیں جس پر وہاں موجود لوگوں نے طنزاً کہا کہ ہم پہلے ہی ان کے بڑے بڑے کارنامے دیکھ چکے ہیں۔میں نے انتخابی مہم میں لوگوں کو بہت منظم طریقے سے متحرک کیا جس سے وہ میرے قریب

آتے گئے۔

میں انتخابی مہم کی آخری رات تقریباً تین بجے اپنے انتخابی کیمپ منڈ ھالی موڑ، لودھراں پہنچا تو وہاں میری اہلیہ موجود تھیں۔ میں پریشان ہو گیا کہ وہ لاہور سے یہاں خیریت سے آئی ہوں۔ معلوم ہوا کہ وہ میری حوصلہ افزائی کے لیے آئی ہیں کیونکہ ان کے خالہ زاد بھائی پرویز اصغر جیلانی 'گورنر ہاؤس' میں تعینات تھے اور اُن کی رپورٹ کے مطابق میں انتخاب ہار رہا تھا۔ میں نے اپنی اہلیہ کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا اور کہا کہ اللہ خیر کرے گا، آپ ملتان جا کر جشن کا اہتمام کریں۔ انتخاب کا نتیجہ آیا تو ربّ العزت کے فضل و کرم سے میں اور جندوڈے خان بلوچ بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گئے مگر افسوس کہ میاں مجید جھنڈیر انتخاب ہار گئے۔

جاوید ہاشمی ایم این اے منتخب ہو گئے۔ قومی اسمبلی کے انتخاب کے دو روز بعد اسی حلقے سے صوبائی اسمبلی کی نشست پر جاوید ہاشمی اور شاہ محمود کے درمیان مقابلہ تھا۔ قومی اسمبلی کے لیے جاوید ہاشمی کی کامیابی کی وجہ سے مخدوم سجاد حسین خاصے دلبرداشتہ تھے۔ میں نے اُن سے وعدہ کیا کہ میں انتخاب کے دن لودھراں کی بجائے شاہ محمود کے حلقۂ انتخاب میں رہوں گا۔ میں نے حسبِ وعدہ اپنا وقت شاہ محمود کے حلقے میں گزارا۔ اس نشست پر شاہ محمود کامیاب ہو گئے۔ جاوید ہاشمی نے مجھ سے اس بات کا سرسری ذکر 2004ء میں سنٹرل جیل اڈیالہ، راولپنڈی میں دورانِ اسیری بعد نمازِ عید الفطر کیا۔

گیلانی گروپ کے بیشتر اُمیدوار کامیاب ہو گئے جن میں چچا حامد رضا اور میں بھی شامل تھا مگر افسوس سیّد تنویر الحسن چار سو ووٹوں سے انتخاب ہار گئے ورنہ گیلانی خاندان کے ایک ہی ضلع سے تین افراد ایم این اے ہوتے۔ انتخابات کے بعد حالات کا جائزہ لینے اور مستقبل کا لائحہ عمل طے کرنے کے لیے گیلانی گروپ کا ایک اہم اجلاس ہوا جس میں چچا حامد رضا، مخدوم سجاد حسین، غلام قاسم خان خاکوانی، اکرم خان بوسن، دیوان غلام عباس، سیّد تنویر الحسن اور صدیق کانجو کے علاوہ میں بھی شامل تھا۔ گروپ نے سینٹ کی عام نشست کے لیے اکرم خان بوسن اور ٹیکنوکریٹ کی نشست پر مخدوم سجاد حسین کو نامزد کیا تو اس پر شدید احتجاج ہوا کیونکہ قریشی گروپ کا موقف تھا کہ 'مشائخ' ٹیکنوکریٹ کے زُمرے میں نہیں آتے، لہٰذا انہیں عام نشست پر ٹکٹ دیا جائے۔ خواتین کے لیے صوبائی اسمبلی کی مخصوص نشست پر مسز فردوس شاہ کے نام کا اعلان کر دیا

گیا۔اس کے علاوہ اکرم خان بوسن کے بڑے بیٹے اسلم خان بوسن کو چیئر مین مارکیٹ کمیٹی، ملتان کے عہدے کے لیے نامزد کیا گیا۔ان نامزدگیوں سے گیلانی گروپ میں غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں جنہیں کم کرنے اور اتحاد قائم رکھنے کے لیے میں نے ملک وریام بوسن کو چیئر مین مارکیٹ کمیٹی نامزد کر دیا جس سے فِضا قدرے بہتر ہو گئی۔وریام بوسن کی نامزدگی کی وجہ سے بوسن خاندان مجھ سے اختلاف کر گیا۔انہوں نے میرے اور چچا کے درمیان غلط فہمی کو ہوا دیتے ہوئے چچا سے کہا کہ میں نے سینٹ کی نشست کے لیے کچھ ووٹ اکرم خان بوسن کی بجائے مخدوم سجاد حسین کو اور خواتین کی نشست پر مسز فردوس شاہ کی بجائے شاہدہ یاسمین ملک کو دلوائے ہیں حالانکہ میں نے انہیں گیلانی گروپ کی دوسری ترجیح (second preference) کے ووٹ دلوائے تھے اور ٹیکنوکریٹ کی نشست پر وسیم سجاد کی مدد کی جس پر وہ کامیاب بھی ہوئے۔اس انتخاب میں سیّد عباس اکبر عرف مونی شاہ (موجودہ سجادہ نشیں و ٹاؤن ناظم شیر شاہ) نے میرا ابھرپور ساتھ دیا جس طرح انہوں نے ضلع کونسل، ملتان کے انتخاب 1983ء میں ساتھ دیا تھا۔

چچا حامد رضا نہایت ہی حساس اور زود رنج طبیعت کے حامل تھے۔انہیں ان تلخیوں کا احساس اُس وقت تو نہ ہوا مگر جب نتائج سامنے آئے تو اکرم خان بوسن اور مخدوم سجاد حسین بمشکل سینیٹر منتخب ہو سکے اور خاطر خواہ ووٹ ہونے کے باوجود صوبائی اسمبلی کے لیے خواتین کی مخصوص نشست پر مسز فردوس شاہ انتخاب ہار گئیں جبکہ شاہدہ یاسمین ملک انتخاب جیت گئیں۔چچا مجھ سے میرا مئوقف سنے بغیر اپنے مشیروں کی باتوں میں آ گئے جس سے مجھے خاصی مایوسی ہوئی۔چند دنوں بعد 'گورنر ہاؤس' میں اراکین قومی و صوبائی اسمبلی کے اعزاز میں گورنر جیلانی نے استقبالیہ دیا۔ وہاں میرے کزن تسنیم نواز گردیزی سے میری ملاقات ہوئی۔گفتگو کے دوران اُنہیں میرے اور چچا کے مابین غلط فہمی کا علم ہوا۔وہ مجھے ساتھ لے کر ماموں سیّد حسن محمود کے گھر 'مخدوم ہاؤس' گئے۔ وہاں پر خالو پیر صاحب پگاڑو اور ماموں سید حسن محمود سے میری الگ الگ تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں۔ انہوں نے مجھے اپنی سرپرستی کی یقین دہانی کروائی۔انہوں نے میرے ساتھ کیا ہوا وعدہ خوب نبھایا اور میری مسلسل رہنمائی کرتے رہے۔ میں نے سیاست میں پیر صاحب پگاڑو، ماموں سیّد حسن محمود اور چچا حامد رضا سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

❀ ❀ ❀

باب چہارم

محمد خان جونیجو کا دورِ حکومت (1985ء۔1988ء)

1985ء کے عام انتخابات میں منتخب ہونے والے اراکینِ قومی اسمبلی کی تقریب حلف برداری، پرانے وزیرِ اعظم سیکریٹریٹ اسلام آباد (سٹیٹ بینک بلڈنگ) میں ہوئی۔ محمد خان جونیجو نے مجھے اسمبلی ہال میں کہا کہ صدر ضیاءُالحق اَراکینِ قومی اسمبلی سے رائے لینا چاہتے ہیں کہ الٰہی بخش سومرو، میر ظفر اللہ خان جمالی اور مجھ میں سے کس کو وزیرِ اعظم ہونا چاہیے؟ لہٰذا آپ میری اراکینِ قومی اسمبلی سے ملاقات کروائیں۔ میں نے جونیجو صاحب کو دیگر اَراکین کے علاوہ خصوصی طور پر جنوبی پنجاب کے اراکینِ قومی اسمبلی سے بھی ملوایا۔

میں اُسی شام پیر صاحب پگاڑو کے پاس ملاقات کے لیے گیا تو اُس وقت وہاں سابق چیئرمین مجلسِ شوریٰ خواجہ محمد صفدر پہلے ہی سے موجود تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ صدر ضیاءُالحق کا وہی پیغام لے کر آئے ہوئے ہیں جو مجھے جونیجو صاحب دِن کو دے چکے تھے۔ انہیں پیر صاحب پگاڑو نے جواب دیا کہ اگر سندھ سے کوئی وزیرِ اعظم ہوگا تو وہ صرف محمد خان جونیجو ہی ہوں گے، اگر باقی صوبوں میں سے کسی اور کو وزیرِ اعظم بنانا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ یہ پیغام لے کر خواجہ صاحب ایوانِ صدر روانہ ہو گئے۔ اُن کے جانے کے بعد پیر صاحب نے کہا کہ اَب صدر صاحب محمد خان جونیجو ہی کو وزیرِ اعظم بنائیں گے۔

دوسرے روز صدر ضیاءُالحق نے اراکینِ قومی اسمبلی کو ایوانِ صدر مدعو کیا۔ اُن کی آمد

سے قبل وزارتِ عظمٰی کے تینوں اُمیدوار اپنی انتخابی مہم میں مصروف رہے۔ صدر ضیاءُ الحق نے اپنی آمد پر گفتگو کا آغاز اس طرح کیا کہ آج میں آپ سب کی رائے لینا چاہتا تھا کہ وزیرِ اعظم کس کو ہونا چاہیے؟ مگر میں چاہتا ہوں کہ وزیرِ اعظم کے چناؤ کے لیے ایوان کو تقسیم نہ کیا جائے، لہٰذا میں نے ایک ہی نام پر اکتفا کیا ہے، آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ڈھیلا ڈھالا ہے، کمزور ہے مگر اُن پر کوئی اس حوالے سے انگلی نہیں اٹھا سکتا کہ وہ کرپٹ ہے، وہ نام محمد خان جونیجو کا ہے۔ چند لمحوں کے لیے سناٹا چھا گیا اور اُس کے بعد جونیجو صاحب کو اَراکینِ اسمبلی نے مبارکباد دینے کے لیے گھیر لیا۔

محمد خان جونیجو مدبّر، منتظم، کم گو، خوش پوش اور پُر اعتماد وزیرِ اعظم تھے۔ انہوں نے اپنی کابینہ کے دو وفاقی وزراء کو بدعنوانی کی بنیاد پر سبکدوش کیا اور ایک گورنر سے محض اس بنیاد پر استعفیٰ طلب کیا کہ اُن کا بیٹا منشیات کے مقدمے میں ملوث تھا۔

انہوں نے وزیرِ اعظم نامزد ہونے پر وفاقی کابینہ تشکیل دینے کے لیے اراکینِ اسمبلی سے ملاقاتیں شروع کر دیں۔ میں اپنی ذاتی مصروفیت کے باعث انہیں ملے بغیر لاہور چلا گیا۔ چند روز بعد مجھے وزیرِ اعظم نے اسلام آباد مدعو کیا۔ میں حسبِ پروگرام اسلام آباد روانہ ہوا۔ ائرپورٹ پر مجھے لینے کے لیے میرے دوست چوہدری خضر حیات جو محکمہ مردم شماری میں گریڈ17 کے افسر تھے، آئے ہوئے تھے۔ راستے میں انہوں نے کہا کہ آج کل جو اراکینِ پارلیمینٹ اسمبلی اسلام آباد پہنچ رہے ہیں اُن کے وزیر بننے کے قوی امکانات ہیں۔ اُنہوں نے مجھ سے وعدہ لیا کہ اگر میں وزیر بن گیا تو اُنہیں اپنا پرائیویٹ سیکرٹری مقرر کروں گا۔ میں وزیرِ اعظم سے ملاقات کے لیے 'وزیرِ اعظم ہاؤس' راولپنڈی پہنچا تو وہاں پہلے ہی سے حاجی محمد حنیف طیّب، حامد ناصر چٹھہ اور غلام محمد مانیکا موجود تھے۔ جب وزیرِ اعظم کو میری آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ خود اپنے دفتر کے دروازے پر آئے اور مجھے کہا:

"I will only take two minutes. You know my family and I know yours. We have included you in the Federal Cabinet. Please! keep it discreet and leave your contact information with my Military Secretary."

ترجمہ: میں صرف دو منٹ لوں گا، آپ میرے خاندان کو جانتے ہیں اور میں آپ

کے، ہم نے آپ کو وفاقی کابینہ میں شامل کر لیا ہے، براہِ کرم اسے خفیہ رکھیں اور اپنا رابطہ میرے ملٹری سیکرٹری کے پاس چھوڑ دیں۔

انہوں نے مزید کہا کہ آپ کو مبارک ہو۔

میں وزیرِ اعظم سے مل کر آیا تو خضر حیات سے کہا کہ آپ کی نوکری پکی۔ میں وزیرِ اعظم سے ملاقات کے دوران اپنے محکمے کے بارے میں دریافت نہ کر سکا۔ میں نے صدیق کانجو کو حلف برداری کی تقریب میں شرکت کی خصوصی دعوت دی۔ میں اور صدیق کانجو رات کے کھانے کے بعد آفیسرز ہوسٹل، اسلام آباد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ وفاقی سیکرٹری مسعود نبی نور ایک لکھی ہوئی تقریر میرے پاس لائے اور بتایا کہ مجھے کل سیف گیمز، سپورٹس کمپلیکس، اسلام آباد میں یہ سپاسنامہ پیش کرنا ہے۔ اس تقریب کے مہمانِ خصوصی صدر ضیاءُالحق تھے۔ ہم نے اس بات سے اندازہ لگایا کہ میرا محکمہ سپورٹس ہوگا۔

دوسرے روز کابینہ نے حلف اٹھایا جس میں اسلم خٹک، سلیم سیف اللہ خان، عبدالغفور خان ہوتی، خاقان عباسی، نور حیات نون، حامد ناصر چٹھہ، صاحبزادہ یعقوب علی خان، محی الدّین بلوچ، قاضی عبدالمجید عابد، بیگم عطیہ عنایت اللہ، حاجی محمد حنیف طیب، اقبال احمد خان، ظفر علی شاہ، ڈاکٹر محبوب الحق، سید قاسم شاہ، مقصود خان لغاری اور غلام محمد مانیکا کے علاوہ میں بھی شامل تھا۔ کابینہ کی تقریبِ حلف برداری کے بعد کابینہ کا غیر رسمی اجلاس ہوا جس میں وزراء نے اپنی رہائش کا مسئلہ اٹھایا۔ وزیرِ اعظم نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا کہ آپ اِن کا خیال رکھیں۔ اس ہدایت سے معلوم ہوا کہ میری وزارت ہاؤسنگ و تعمیرات ہے نہ کہ سپورٹس اور یہ کہ مسعود نبی نور کسی غلط فہمی کی بنا پر تقریر میرے پاس لے آئے تھے، انہیں شاید اپنے وزیر کا علم نہیں تھا۔

سابق وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے دورِ اقتدار کے آخری دنوں میں وزراء کی کاروں پر قومی پرچم نہ لہرانے کی پابندی عائد کر دی تھی۔ کیونکہ اُن دنوں حکومت کے خلاف قومی اتحاد تحریک چلا رہی تھی اور خدشہ تھا کہ گاڑی پر پرچم دیکھ کر لوگ مشتعل نہ ہو جائیں۔ کابینہ کے غیر رسمی اجلاس کے بعد میں نے وزیرِ اعظم سے وزراء کی کاروں پر پاکستان کا پرچم لہرانے کی اجازت طلب کی۔ انہوں نے فوراً وفاقی وزراء کو اجازت دے دی۔ کچھ عرصہ بعد وزرائے مملکت

اور صوبائی وزراء کو بھی اجازت مل گئی۔

وزارت کا منصب سنبھالنے پر مجھے ایڈیشنل سیکرٹری انچارج عبدالرحیم مسعود نے محکمے کے بارے میں بریفنگ دیتے ہوئے اسلام آباد میں گھروں کی قلت کا خاص طور پر تذکرہ کیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ آپ پر عوام اور منتخب نمائندوں کا سرکاری ملازمین کے لیے گھروں کی الاٹمنٹ کے بارے میں بڑا دباؤ ہوگا' اس لیے آپ کو بہت محتاط رویّہ اختیار کرنا پڑے گا۔ اسی لمحے وزیرِ اعظم کا فون آ گیا۔ انہوں نے مجھے سابق وزیر دفاع میر علی احمد تالپور کے گھر کو ڈی ہائر* کرنے کے لیے کہا۔ میں نے اُن سے بریفنگ کی روشنی میں معذرت کر لی۔ میرے ساتھ بیٹھے ایڈیشنل سیکرٹری کو جب معلوم ہوا کہ فون وزیرِ اعظم کا تھا تو وہ خاصے پریشان ہوئے کہ ان کے لیے یہ جواب مناسب نہیں ہے۔ عبدالرحیم مسعود نے کہا کہ میری بریفنگ تو عوام کے حوالے سے تھی نہ کہ وزیرِ اعظم کے لیے۔ میں نے جواب دیا کہ میرے ذہن میں سب کے لیے ایک ہی معیار ہے ،اس لیے میرا یہی جواب بنتا تھا۔ عبدالرحیم مسعود نے کہا کہ میں نے بھٹو صاحب کے معتمد ساتھی حیات محمد خان شیر پاؤ کے ساتھ بھی کچھ عرصہ کام کیا تھا، آپ کا انداز اُن سے ملتا جلتا ہے، لہٰذا میری پیشین گوئی ہے کہ آپ بہت ترقی کریں گے۔

وزارت سنبھالنے کے چند روز بعد میرے پیش رو الٰہی بخش سومرو میرے دفتر آئے اور مجھ سے شکایت کی کہ مجھے اس محکمے کا قلمدان چھوڑے ابھی دو چار روز ہی گزرے ہیں کہ یہاں کے عملے نے آنکھیں پھیر لی ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے ایک خاتون ڈپٹی سیکرٹری کے گھر کی الاٹمنٹ کے لیے بھی کہا۔ میں نے عبدالرحیم مسعود کو ہدایت کی کہ وہ الٰہی بخش سومرو کے کیے ہوئے تمام سابقہ احکامات پر فوری عملدرآمد کریں۔

میں وفاقی وزیر بننے کے بعد پہلی مرتبہ بذریعہ ٹرین اپنے حلقۂ انتخاب لودھراں پہنچا تو عوام نے میرا ریلوے سٹیشن پر بھرپور استقبال کیا۔ ریلوے سٹیشن پر ایم این اے صدیق کانجو، ایم پی اے جندوڈے خان بلوچ، شاہ محمد جوئیہ، ملک طیب اعوان، دیوان عاشق اور اراکینِ ضلع کونسل ملتان میں سے حبیب سلطان بُھٹہ، جہانگیر سلطان بُھٹہ، اقبال خان کانجو، محمد حسین رڈ، اظہر خان جوئیہ، سجاد خان جوئیہ، میاں مجید جھنڈیر، ملک شفیع کنوں، اکبر لنگاہ، سکندر شاہ گردیزی، چوہدری

* کرائے کا معاہدہ منسوخ کرنا۔

ضابطے خان، علی رضا شاہ کے علاوہ شیخ امان اللہ، صوفی نذر حسین، دولہے خان بلوچ، میاں اسلم جھنڈیر، ڈاکٹر محمد امیر، محمد رضا شاہ عرف رضائے شاہ، پیر اقبال شاہ، پیر کرم شاہ قریشی، سرور خان لودھی، مولوی محمد میاں، رانا مقصود احمد ایڈووکیٹ، منظور احمد ایڈووکیٹ، حاجی نذر دھمریہ، رشید دھمرایہ اور اقبال فاروقی کے علاوہ سینکڑوں کارکن موجود تھے۔ اسسٹنٹ کمشنر لودھراں جنید اقبال میگافون اٹھائے اوور ہیڈ برج (overhead bridge) پار کرنے والے کارکنوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔

مجھ سے قبل میرے والد لودھراں کے حلقے سے پہلی مرتبہ منتخب ہو کر وفاقی وزیرِ مملکت برائے توانائی و تعمیرات اور صوبائی وزیر بلدیات رہ چکے تھے۔ اُن کے بعد سیکرٹری جنرل پیپلز پارٹی سیّد ناصر علی رضوی وفاقی وزیر برائے ہاؤسنگ و تعمیرات رہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ اسی حلقۂ انتخاب سے منتخب ہونے والا تیسرا شخص میں تھا جو وفاقی وزیر بنا اور میرے پاس بھی وزارت ہاؤسنگ و تعمیرات کا قلمدان تھا۔

جونیجو صاحب غیر جماعتی انتخابات کے ذریعے وزارتِ عظمیٰ تک پہنچے تھے۔ انہوں نے حلف اٹھانے کے فوراً بعد ایوان سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''جمہوریت اور مارشل لا ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔'' انہوں نے سیاسی پارٹی بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے صدر ضیاءُالحق نے بلایا اور کہا کہ مجھ پر کوئی دباؤ نہیں تھا کہ میں انتخابات کرواتا، میں نے اَز خود انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر کروائے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ اسی طرح پارلیمنٹ کو چلایا جائے اور پارلیمانی کمیٹیوں کو موثر بنایا جائے، وزیرِ اعظم غیر جماعتی ایوان کو جماعتی بنانا چاہتے ہیں جو میرے پروگرام کا حصہ نہیں ہے، آپ انہیں قائل کریں کہ وہ اپنی پارٹی نہ بنائیں۔ میں نے وزیرِ اعظم سے ملاقات کر کے صدر کا پیغام پہنچایا تو انہوں نے جواب دیا کہ صدر صاحب تو چاہیں گے کہ ہم اُن کے مرہونِ منت رہیں مگر پارلیمانی طرزِ حکومت کا تصور سیاسی پارٹیوں کے بغیر ممکن نہیں، ہم پارٹی بنا کر ایوان کو موثر بنانا چاہتے ہیں۔

وزیرِ اعظم نے مسلم لیگ کی تشکیل نو کے لیے راولپنڈی میں 'وزیرِ اعظم ہاؤس' کے آڈیٹوریم میں پارلیمانی پارٹی کا ہنگامی اجلاس طلب کیا جس میں صدر ضیاءُالحق، وزیرِ اعظم محمد خان جونیجو اور مسلم لیگ کے صدر پیر صاحب پگاڑو نے خصوصی طور پر شرکت کی۔ وزیرِ اعظم نے خطاب

کرتے ہوئے کہا کہ میں پیر صاحب پگاڑو کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرے لیے مسلم لیگ کی صدارت چھوڑ دی ہے۔ صدر ضیاء الحق نے کہا کہ اس وقت ملک میں کوئی سیاسی جماعت نہیں ہے، سب سماجی تنظیمیں ہیں، وزیرِ اعظم کی خواہش ہے کہ ہم غیر جماعتی ایوان کو جماعتی بنائیں، مجھے اُن سے اتفاق کرنا پڑ رہا ہے۔ پیر صاحب پگاڑو نے اپنے مخصوص انداز میں خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہم محنت کم اور پرافٹ زیادہ لینے کے عادی ہیں، اب فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ یہ پرافٹ آپ (صدر) دیں گے یا وزیرِ اعظم؟ پیر صاحب پگاڑو نے مزید کہا کہ صدر صاحب کا خیال ہے کہ ملک میں سماجی تنظیمیں ہیں نہ کہ سیاسی جماعتیں، میں ان سے اتفاق نہیں کرتا، اس محفل میں خواتین بھی تشریف فرما ہیں، میں بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے سیاسی جماعتوں کے ساتھ جو کیا، اس میں ہم نے بڑی مشکل سے اپنی عزت بچائی ہے، وہی سیاسی جماعت جسے آپ سماجی تنظیم کا نام دے رہے ہیں، آج آپ کو اس کی ضرورت پڑ گئی ہے۔

وزیرِ اعظم نے چاروں صوبوں کا دورہ کر کے مسلم لیگ کی رکنیت سازی مہم کا آغاز کیا۔ اس سلسلے میں 'گورنر ہاؤس' پنجاب میں صوبے کے مختلف ڈویژنوں سے تعلق رکھنے والے اراکینِ قومی اسمبلی کی وزیرِ اعظم سے ملاقات کروائی گئی۔ سب سے پہلے جنوبی پنجاب سے بہاولپور، ملتان اور ڈیرہ غازی خان ڈویژن کے اراکین وزیرِ اعظم سے ملے۔ اس تقریب میں گورنر جیلانی اور وزیرِ اعلیٰ نواز شریف بھی شریک تھے۔

ایک دلچسپ واقعہ اُس وقت پیش آیا جب مجھے وزیرِ اعظم نے کہا کہ آپ بہاولپور ڈویژن کے اراکینِ قومی اسمبلی کو دستخط کے لیے رکنیت سازی فارم مہیا کریں۔ میں نے سب کو فارم پیش کر دیا۔ اُن میں تسنیم نواز گردیزی، نواب صلاح الدّین عباسی، مخدوم سیّد احمد عالم انور، رئیس شبیر احمد، عبدالستار لالیکا، سیّد محمد احمد، بیگم عشرت اشرف اور میاں ممتاز جچہ قابلِ ذکر تھے۔ بیگم عشرت اشرف کے سوا باقی سب نے دستخط کرنے کے لیے مہلت طلب کی۔ غالباً اُن کا وزیرِ اعلیٰ پنجاب سے طے ہو چکا تھا کہ جب تک وہ مسلم لیگ کے رکنیت سازی فارم پر دستخط نہیں کرتے، کوئی دوسرا رکن بھی دستخط نہیں کرے گا۔ اس تقریب میں نواز شریف نے وزیرِ اعظم سے اپنے تحفظات کے بارے میں علیحدگی میں بھی بات کی۔

اس تقریب کے بعد وزیرِ اعظم اپنے خصوصی طیارے میں اسلام آباد کے لیے روانہ

ہوئے تو میں ان کے ہمراہ تھا۔ انہوں نے راستے میں تسنیم نواز گردیزی کے رویّے پر برہمی کا اظہار کیا۔ وزیرِ اعظم نے کہا کہ میں پیر صاحب پگاڑو اور آپ کے ساتھ اُن کی عزیز داری کے باعث انہیں اپنے خاندان کا فرد سمجھتا تھا، مجھے اُن سے اس قسم کے جواب کی توقع نہیں تھی، انہوں نے نواز شریف کے کہنے پر دستخط نہیں کیے، وہ تو ایک خاتون رُکن بیگم عشرت اشرف کے معیار کے بھی نہیں، اَب میں دیکھوں گا کہ انہیں نواز شریف کیسے وزیر بنوائیں گے؟ میں انہیں مسلسل قائل کرتا رہا کہ وہ اُن کے بارے میں نرم رویّہ اپنائیں مگر ان کا غصہ کم ہونے میں تقریباً ایک سال لگ گیا اور پھر کہیں انہوں نے تسنیم نواز کو اپنی کابینہ میں بطورِ وزیرِ مملکت شامل کیا۔ دورانِ پرواز میں نے ان سے دریافت کیا کہ نواز شریف نے آپ سے علیحدگی میں کیا گفتگو کی تھی؟ انہوں نے جواب دیا کہ میاں صاحب نے اپنی خواہش کا اظہار اس طرح کیا کہ انہیں مسلم لیگ پنجاب کا صدر بنا کر بطورِ وزیرِ اعلیٰ پنجاب مدّت پوری کرنے دی جائے۔ میں نے مزید دریافت کیا کہ آپ نے ان کے تحفظات کا کیا جواب دیا؟ انہوں نے کہا کہ میں نے اتفاق کر لیا کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ صدر ضیاءُ الحق نہیں چاہتے کہ میں پارٹی بناؤں۔

ریفرنڈم کے دوران صدر ضیاءُ الحق نے ملتان کی تحصیل خانیوال کو ضلع کا درجہ دینے کا اعلان کیا تھا مگر 1985ء کے عام انتخابات کی وجہ سے دونوں اضلاع ملتان اور خانیوال میں ضلع کونسل کے ضمنی انتخابات ملتوی کر دیے گئے۔ ماضی میں ضلع کونسل، ملتان میں گیلانی گروپ کی اکثریت خانیوال کے اراکین ضلع کونسل کی بدولت تھی۔ گیلانی گروپ کے پاس ضلع کونسل، ملتان میں فخر امام گروپ سے کم ووٹ تھے۔ اُن میں سے بھی ایک رکن مبارک بُھٹہ پر فوجداری مقدمہ چل رہا تھا، اسی لیے ہمیں انتخاب جیتنے کے لیے بڑی دشواریوں کا سامنا تھا۔ اُن دنوں مبارک بُھٹہ اسلام آباد میں میرے پاس ہی رہ رہے تھے۔ میں نے پیر صاحب گولڑہ شریف سیّد غلام معین الدّین گیلانی المعروف بڑے لالہ جی سے رابطہ کیا، وہ میرے ساتھ بہت شفقت فرماتے تھے۔ وہ اَز خود سیاست میں نہیں تھے مگر جب بھی میری ذات کا مسئلہ آیا تو انہوں نے خاندان کے ایک بزرگ کی حیثیت سے میرا ساتھ دیا۔ میں اُن کی شفقتوں اور دعاؤں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ بڑے لالہ جی سے میں نے اپنے سیاسی حریف رکن ضلع کونسل، ملتان پیر نصر الدّین شاہ کا ووٹ مانگا۔ نصر الدّین شاہ، بڑے لالہ جی سے بیعت تھے۔ میں نے انہیں 1985ء کے عام

انتخابات میں لودھراں سے قومی اسمبلی کی نشست پر شکست دی تھی۔ بڑے لالہ جی نے میرے ساتھ اُن کے ووٹ کی حامی بھر لی۔ میں نے بڑے لالہ جی سے گزارش کی کہ اگر نصر الدّین شاہ مجھے ووٹ دینے پر آمادہ ہو جائیں تو وہ انتخاب کے دن آپ کے پاس موجود رہیں اور ووٹ دینے ملتان نہ آئیں کیونکہ ملتان کے تین اراکین ضلع کونسل نے میرے ساتھ دیوان عاشق کی چیئر مین ضلع کونسل کے عہدے کے لیے حمایت کی حامی اس شرط پر بھر لی ہے کہ نصر الدّین شاہ انتخاب سے غیر حاضر رہیں۔ بڑے لالہ جی نے میری تجویز سے اتفاق کیا اور نصر الدّین شاہ کو اپنے پاس ٹھہرالیا۔

مبارک بُھٹہ کو میں انتخاب کے دن اپنے ہمراہ اسلام آباد سے ہوائی جہاز کے ذریعے ملتان لے آیا۔ پنجاب حکومت نے ائرپورٹ پر پولیس کی بھاری نفری تعینات کر رکھی تھی جو مبارک بھٹہ کو گرفتار کرنا چاہتی تھی۔ میں اُنہیں اپنے ہمراہ لے کر 'رضاہال' ملتان پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد فخر امام گروپ کے اَراکین بھی 'رضاہال' پہنچ گئے۔

1983ء میں سیّد فخر امام نے چیئرمین ضلع کونسل کی نشست پر ناکام ہونے کے بعد وفاقی وزارت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اَب مجھ پر اَراکین ضلع کونسل بشمول پریس نے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ میں بھی مستعفی ہو جاؤں کیونکہ میں بھی اُس وقت وفاقی وزیر تھا۔ میں نے اُن سے سوال کیا کہ کیا سیّد فخر امام نے استعفیٰ ہارنے کے بعد دیا تھا یا پہلے؟ انہوں نے جواب دیا کہ سیّد فخر امام نے استعفیٰ ہارنے کے بعد دیا تھا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں بھی ہارنے کے بعد استعفیٰ دے دوں گا۔ میرے مخالفین نے مبارک بھٹہ سے کہا کہ وزیر صاحب نے تمہیں اسی دن کے لیے پالا تھا، لہٰذا ووٹ کے بعد تمہاری قربانی ہوگی۔ نتیجہ نکلا تو ہمیں چار ووٹوں کی برتری حاصل تھی:

؎ تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پر تماشہ نہ ہوا

اب نگاہوں کا مرکز مبارک بُھٹہ تھے۔ بہت سے لوگ ان کی گرفتاری کے منتظر تھے مگر شجاع آباد سے میرے دوست ذوالفقار علی شاہ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق مبارک۔ بُھٹہ کو بڑی پھرتی کے ساتھ اپنی کار میں بٹھا کر لے گئے اور عدالت میں پیش کر دیا جو چند قدموں

کے فاصلے پر تھی۔ عدالت سے اُن کی ضمانت ہوگئی۔

نئے ضلع خانیوال میں گیلانی گروپ کی اکثریت ہراج اور ڈاہا گروپ کی وجہ سے تھی جو دونوں چیئر مین ضلع کونسل کے اُمیدوار بن گئے۔ مجھے خدشہ تھا کہ ہم اکثریت کے باوجود اس وجہ سے کہیں انتخاب ہار نہ جائیں۔ میں نے ضلع کونسل کے تمام اراکین سے حلف لیا کہ وہ میرے فیصلے کی پابندی کریں گے۔ میں نے چیئر مین ضلع کونسل، خانیوال کے لیے پیر عارف زمان قریشی اور وائس چیئر مین کے لیے راجہ خضر حیات کا نام تجویز کیا۔ میری تجویز کامیاب رہی، ہم دونوں اضلاع ملتان اور خانیوال میں بھاری اکثریت سے جیت گئے۔

میں نے بڑے لالہ جی اور اپنے دوست سیّد معین الحق گیلانی کو گولڑہ شریف فون کر کے یہ خوشخبری سنائی تو وہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے مجھے دلچسپ بات بتائی کہ رات کو نصر الدّین شاہ گولڑہ شریف سے چلے گئے تھے، رات ہم نے آپ کو اس لیے نہیں بتایا تھا کہ کہیں آپ پریشان نہ ہو جائیں۔ ہم نے اپنی ٹیمیں ریلوے سٹیشن، بس اڈوں اور دوستوں کے ہاں بھجوائیں۔ آخر کار اکرام اللہ نیازی نے انہیں میانوالی سٹیشن پر ملتان جانے والی ٹرین مہر ایکسپریس میں تلاش کر لیا اور وہ انہیں لے کر واپس گولڑہ شریف پہنچ گئے۔ بڑے لالہ جی نے مزید بتایا کہ میں نے اُن سے دریافت کیا کہ آپ کو ہمیں بتائے بغیر جانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ نصر الدّین شاہ نے کہا کہ اگر میں ملتان نہ بھی جاتا تو بھی گیلانی گروپ کامیاب نہیں ہو سکتا تھا مگر جب بڑے لالہ جی نے انہیں گیلانی گروپ کی کامیابی کی خبر سنائی تو وہ بہت پریشان ہوئے۔

صدر ضیاءُ الحق اور گورنر جیلانی نے ریفرنڈم کے موقعہ پر قلعہ کہنہ قاسم باغ سٹیڈیم، ملتان میں میری سخت تقریر کی پاداش میں ضلع ملتان کی تحصیل خانیوال کو ضلع کا درجہ دینے کا اعلان کیا تھا۔ مجھے دی گئی یہ سزا اُن کے کام نہ آ سکی، اس کے برعکس ملتان اور خانیوال سے میرے ہی نامزد کردہ اُمیدوار بطورِ چیئر مین ضلع کونسل کامیاب ہوگئے۔ وزیرِ اعظم نے میری اس شاندار کامیابی کو سراہتے ہوئے مجھے وزارتِ ریلوے کا قلمدان سونپ دیا۔ اُس وقت نواب عبدالغفور خان ہوتی ریلوے کے وفاقی وزیر تھے جو پہلے میرے والد اور بعد میں میرے ساتھ مسلم لیگ کی سنٹرل ورکنگ کمیٹی کے رکن رہ چکے تھے۔ اُنہیں وزارتِ ریلوے کے عوض گورنر سرحد بنا دیا گیا۔

جونیجو صاحب کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ ہر مسئلے پر اپنے ساتھیوں سے مشاورت

کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھ سے گورنر پنجاب نامزد کرنے کے لیے رائے طلب کی کہ مخدوم سجاد حسین قریشی بطور گورنر پنجاب کیسے رہیں گے؟ میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ اُن کے متعلق فیصلہ کر چکے ہیں؟ انہوں نے کہا: " It's almost decided. " (اس کا فیصلہ تقریباً ہو چکا ہے)۔ میں نے کہا کہ اگر آپ فیصلہ کر ہی چکے ہیں تو پھر میری رائے کیوں لینا چاہتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا:

" If you feel very strongly about him, then I can reverse my decision."

ترجمہ: اگر آپ اُن کے بارے میں تحفظات رکھتے ہیں تو میں اپنے فیصلے کو واپس لے سکتا ہوں۔

اس جواب پر میں نے کہا کہ میرا مخدوم سجاد حسین کے ساتھ سیاسی اتحاد ہے اور ہم ایک دوسرے کے حلیف رہ چکے ہیں۔ میں نے مزید کہا کہ آپ کو یاد ہوگا کہ کچھ دن پہلے مخدوم سجاد حسین اور اُن کے بیٹے شاہ محمود نے 'گورنر ہاؤس' لاہور میں آپ سے ملاقات کر کے مجھے وفاقی وزیر بنانے کے لیے سفارش کی تھی، لہٰذا اگر آپ اُنہیں گورنر پنجاب بنانا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ وزیرِ اعظم نے کہا کہ آپ آج ہی مخدوم صاحب سے ملاقات کریں اور میرے ساتھ اپنی ملاقات کا حوالہ دیتے ہوئے کہیں کہ آپ کو گورنر پنجاب بنانے کے لیے میں نے بھی وزیرِ اعظم سے سفارش کی ہے۔

میں لاہور گیا اور شاہ محمود سے اُن کی رہائش گاہ پر ملاقات کی۔ وہاں اُن کی ہمشیرہ مسز احمد قریشی سے بھی ملاقات ہوگئی۔ ان سے میری اہلیہ کی دوستی بہت پرانی ہے۔ میں نے انہیں خوشخبری دی کہ آپ کے والد گورنر پنجاب بن رہے ہیں۔ وہ بے تکلفی سے بولیں کہ انہوں نے مودی (شاہ محمود) کو صوبائی وزیر نہیں بنایا تو بابا کو گورنر کیسے بنائیں گے؟ اسی دوران وہاں صدر ضیاءُ الحق اور گورنر جیلانی بھی بغیر پروٹوکول پہنچ گئے۔ انہوں نے مخدوم صاحب کے ساتھ ملاقات کی اور گورنر پنجاب کے عہدے کی پیشکش کی جو انہوں نے قبول کر لی۔

وزیرِ اعظم نے ایک موقعہ پر مجھ سے مشورہ کیا کہ سیّد فخر امام کی جگہ سپیکر قومی اسمبلی کسے ہونا چاہیے؟ ساتھ ہی طنزاً کہا کہ اُن کی بیگم نہیں چاہتیں کہ وہ سپیکر رہیں۔ دراصل قومی اسمبلی میں بیگم سیّدہ عابدہ حسین حزبِ اختلاف میں فعال کردار ادا کر رہی تھیں جس سے وزیرِ اعظم ناخوش

تھے۔ میں نے سپیکر کے لیے حامد ناصر چٹھہ کا نام تجویز کیا۔ جس پر وزیرِ اعظم نے اپنے کچھ تحفظات کا اظہار کیا تاہم انہوں نے کہا کہ اس بارے میں دیگر اراکینِ قومی اسمبلی سے بھی رائے لیں گے۔ اسی دوران وزیرِ اعظم نے اراکینِ قومی اسمبلی سے رائے طلب کی تو اکثریت نے اُن کے حق میں رائے دی۔ سیّد فخر امام کے خلاف تحریکِ عدمِ اعتماد کامیاب ہو گئی اور اُن کی جگہ حامد ناصر چٹھہ قومی اسمبلی کے سپیکر منتخب ہو گئے۔ وہ بطور سپیکر کامیاب رہے۔ جب وزیرِ اعظم کے نواز شریف سے تعلقات کشیدہ ہوئے تو اس وقت جن چند رہنماؤں نے محمد خان جونیجو کا ساتھ دیا، اُن میں چٹھہ صاحب پیش پیش تھے۔ وہ موجودہ مسلم لیگ سے پہلے سابق وزیرِ اعظم محمد خان جونیجو کے نام سے منسوب مسلم لیگ (ج) کے سربراہ تھے۔

1985ء میں مجھے وفاقی وزیر ہاؤسنگ و تعمیرات کی حیثیت سے ذمہ داریاں ملیں۔ جب میں پہلی مرتبہ لاہور کے دورے پر آیا تو مجھے 'چمبہ ہاؤس' میں لایا گیا۔ میں کچھ دیر کے لیے تصور میں کھو گیا اور وہ تمام باتیں جو میری اپنے والد سے ہوئی تھیں یاد آ گئیں۔ مجھے اُس خوبصورت عمارت کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر خیال آیا کہ اس کی مرمت کروائی جائے۔ میں نے مشہور انٹیریر ڈیزائنر مسز روبینہ راجہ کو یہ ذمہ داری سونپی، اُن کا تعلق لاہور سے تھا۔ انہوں نے بڑی جانفشانی اور لگن سے اس عمارت کی تزئین و آرائش کی اور مہاگنی لکڑی سے بنے ہوئے فرنیچر کو دوبارہ استعمال کے قابل بنایا۔

جب امریکہ کے سابق صدر رچرڈ نکسن نے پاکستان کا دورہ کیا تو وزیرِ اعظم نے مجھے، حامد ناصر اور مانیکا کو ان کا وزیرِ مہمانداری* مقرر کیا۔ نکسن امریکہ کے دو مرتبہ صدر منتخب ہوئے۔ امریکہ کی تاریخ میں وہ پہلے صدر تھے جنہوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دیا۔ انہوں نے دس کتابیں تصنیف کیں۔ ہم تینوں وزراء اسلام آباد سے خصوصی طیارے کے ذریعے صدر نکسن کے استقبال کے لیے لاہور ائرپورٹ پر پہنچے تو گورنر جیلانی پہلے ہی سے اُن کے استقبال کے لیے ائرپورٹ پر موجود تھے۔ جونہی اُن کی نظر مانیکا صاحب پر پڑی تو انہوں نے کہا کہ آپ نے دورۂ بہاولپور میں پنجاب کے بلدیاتی نظام پر کڑی تنقید کی ہے۔ مانیکا صاحب نے جواب دیا کہ میں نے ایسا کوئی بیان نہیں دیا۔ گورنر نے دوبارہ کہا کہ نہیں! آپ نے بیان دیا ہے۔ اس پر مانیکا صاحب نے دوبارہ جواب دیا کہ میں نے ایسا کوئی بیان نہیں دیا۔ جب گورنر نے تیسری مرتبہ وہی سوال

* Minister in waiting

دُہرایا تو مانیکا صاحب نے پنجابی میں کہا "ہاں! میں بیان دِتا اے جو کرنا جے کرلوؤ"۔ مانیکا صاحب کو پہلے ہی سے گورنر پر غصہ تھا کیونکہ کچھ عرصہ قبل جب وہ بطور صوبائی وزیرِ بلدیات چیئرمین ضلع کونسل، ساہیوال کے انتخاب میں شکست کھا گئے تھے تو گورنر پنجاب نے اُن سے استعفیٰ طلب کر لیا تھا۔ گورنر پنجاب جو اُس وقت بڑے تحکمانہ انداز میں گفتگو کر رہے تھے، مانیکا صاحب کا یہ جواب سن کر خاموش ہو گئے جیسے اُن کے منہ پر قُفل لگ گیا ہو۔

ہم نے صدر نکسن کے ساتھ لاہور میں انتہائی مصروف دن گزارا۔ میں انہیں خصوصی طور پر تاریخی بادشاہی مسجد لے گیا۔ وہ مغلیہ طرزِ تعمیر دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ بادشاہی مسجد کے امام مولانا آزاد نے صدر نکسن کو مسجد کے مختلف حصوں کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔ ہم نے اُن سے پاک امریکہ تعلقات، رِی پبلکن پارٹی اور خصوصی طور پر اُن کی تصانیف پر سیر حاصل گفتگو کی۔

وزیرِ اعظم محمد خان جونیجو اور پیر صاحب پگاڑو کی نواز شریف سے ذہنی ہم آہنگی نہیں تھی۔ صدر ضیاء الحق کو بھی گلہ تھا کہ میاں صاحب سمجھتے ہیں کہ وہ وزیرِ اعلیٰ پنجاب اس لیے ہیں کہ اراکینِ صوبائی اسمبلی کی اکثریت اُن کے ساتھ ہے۔ صدر صاحب اُنہیں یہ بات باور کروانا چاہتے تھے کہ وہ وزیرِ اعلیٰ پنجاب وفاقی حکومت کی وجہ سے ہیں نہ کہ ارکانِ صوبائی اسمبلی کی اکثریت کی بدولت۔ مجھے پیر صاحب پگاڑو نے اپنے پاس بلا کر کہا کہ صدر صاحب نے میری مشاورت سے جونیجو صاحب کو وزیرِ اعظم اور سیّد غوث علی شاہ کو وزیرِ اعلیٰ سندھ بنایا ہے، اس لیے وہ پنجاب کی وزارتِ اعلیٰ آپ کو نہیں دیں گے، آپ پنجاب جائیں اور اپنے آپ کو وزیرِ اعلیٰ پنجاب کے طور پر ظاہر کریں تا کہ ہم پنجاب اسمبلی سے چند مضبوط اراکین اپنے ساتھ شامل کر لیں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ میں ان دنوں وفاقی وزیرِ ریلوے تھا۔ ائرپورٹ اور ریلوے سٹیشن سے آتے جاتے درجنوں اراکینِ صوبائی اسمبلی میرا استقبال کرتے تھے۔ میں نے 'چمبہ ہاؤس' لاہور کو متبادل 'وزیرِ اعلیٰ ہاؤس' بنالیا اور وہاں ریلوے کی اپنی پولیس تعینات کر دی۔ چودھری پرویز الٰہی نواز شریف سے الگ ہو گئے اور ہم نے اُن کے ساتھ مل کر ایک سو دو اراکینِ صوبائی اسمبلی کی حمایت حاصل کر لی۔ جن اراکینِ صوبائی اسمبلی نے ہماری حمایت کی ان میں سردار نصر اللہ خان دریشک، سردار عاشق گوپانگ، ملک اللہ یار کھنڈا، سردار اللہ یار ہراج، مخدوم الطاف، شیخ محمد

یوسف، ملک ارشد حسین میتلا، سیّد ابرار حسین شاہ، سرفراز نواز، چوہدری محمد نواز چوہان، پیر اقبال شاہ (پیر جگّی)، سجاد چیمہ، میاں فضل حق، میاں محمود احمد، میاں محمد آصف، کرنل محمد یامین، رفیق حیدر لغاری، مسز فرحت رفیق خواجہ اور اصغر گھر کی ایم این اے کے گروپ کے علاوہ دیگر اراکین شامل تھے۔

وزیرِ اعلیٰ پنجاب میاں نواز شریف نے صدر، وزیرِ اعظم اور پیر صاحب پگاڑو سے الگ الگ ملاقاتیں کیں۔ ان ملاقاتوں کے بعد صدر صاحب کا بیان آیا کہ نواز شریف کا قلعہ مضبوط ہے۔ دوسرا بیان وزیرِ اعظم کا آیا کہ پنجاب میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ آخری بیان پیر صاحب پگاڑو نے دیا کہ نواز شریف کی بوری میں سوراخ تھا جس کی میں نے سلائی کر دی ہے۔ جب ہم نے پیر صاحب سے اس بات پر احتجاج کیا تو انہوں نے کہا کہ یہ صلح عارضی ہے، نواز شریف کو تبدیل کرنا ہی پڑے گا۔

وفاقی کابینہ کے ایک اجلاس میں وزیرِ اعلیٰ پنجاب نواز شریف نے تجویز پیش کی کہ یومِ آزادی کے موقعہ پر وزیرِ اعظم مینارِ پاکستان، لاہور میں جلسۂ عام سے خطاب کریں۔ وزیرِ اعظم نے کابینہ کی رائے طلب کی تو اکثریت نے اس تجویز سے اتفاق کیا مگر میری رائے مختلف تھی کہ مینارِ پاکستان وہ یادگار ہے جہاں قراردادِ پاکستان پیش کی گئی تھی اور 14 راگست کا دن ہماری آزادی سے منسوب ہے، اس وقت ملک میں مارشل لا ہے، یوم آزادی کے موقعہ پر مینارِ پاکستان پر جلسۂ عام میں عوام حکومت سے اہم اعلان کی توقع رکھتے ہیں۔ وزیرِ اعظم نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ کھل کر بات کریں کہ آپ مجھ سے کس قسم کے پیغام کی توقع رکھتے ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ عوام آپ سے مارشل لا اور ایمرجنسی کے خاتمے کے اعلان کی توقع رکھتے ہیں۔ وزیرِ اعظم نے جواب دینے کی بجائے کابینہ کے ارکان سے مخاطب ہو کر کہا کہ یہ جلسہ نہیں ہوگا۔ وزیرِ اعلیٰ نے میری رائے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ میٹنگ کے بعد میں راولپنڈی سے اسلام آباد واپس چلا گیا۔

چند گھنٹوں بعد وزیرِ اعظم کا فون آیا اور انہوں نے مجھے کہا کہ جلسۂ عام لاہور میں ہوگا، آپ اپنی تیاری مکمل کر لیں۔ جلسۂ عام مینارِ پاکستان پر منعقد ہوا۔ وزیرِ اعظم نے مارشل لا اور ایمرجنسی کے خاتمے کا اعلان کیا۔ گیارہ سال بعد 14 راگست 1997ء کو پاکستان کی گولڈن جوبلی کی

تقریبات کے موقعہ پر نواز شریف کی حکومت نے چودھویں ترمیم پاس کی۔ اس واقعہ کو کالم نگار اسداللہ غالبؔ نے 'روزنامہ جنگ' میں 16/ اگست 1997ء کو اس طرح لکھا:

یوسف رضا گیلانی اور مارشل لا کا خاتمہ

گولڈن جوبلی کا موڈ قوم پر ابھی طاری ہے اور مجھے 14/ اگست 1985ء کی ایک یاد آ رہی ہے جب مینارِ پاکستان کے چبوترے پر کھڑے ہو کر اُس وقت کے وزیرِ اعظم محمد خان جونیجو نے کہا:

''جمہوریت اور مارشل لا ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔''

یہ الفاظ ایک نحیف و ناتواں شخص کے منہ سے نکلے تھے لیکن یہ ابلاغ اور تاثیر سے بھرپور تھے۔ میں اس وقت محمد خان جونیجو کے بالکل پیچھے کھڑا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ مجھے اس وزیرِ اعظم کو سہارا دینا چاہیے جس کے جسم کا بوجھ اُس کی اپنی ٹانگیں سہارنے کے قابل نہ تھیں۔ یہ الفاظ اگلے روز کے اخبارات کی شہ سرخی تھے اور انہوں نے ملکی سیاسی فضا میں ایک بھونچال اور ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔

چند روز قبل نہر لاہور پر واقع کنٹری ہومز کی ایک پرسکون قطار میں یوسف رضا گیلانی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ ماضی کے اوراق تیزی سے پلٹ رہے تھے، کہنے لگے آپ کو معلوم ہے کہ جنرل ضیاءُالحق کے طویل مارشل لا کا خاتمہ کیسے ہوا؟ پھر انہوں نے 14/ اگست 1985ء کے بارے یہ واقعہ سنایا:

محمد خان جونیجو کی کابینہ کا اجلاس منعقد ہو رہا تھا۔ وزیرِ اعظم ہر رکنِ کابینہ سے باری باری پوچھ رہے تھے کہ اُس روز کیا پروگرام بنایا جائے۔ کیا مینارِ پاکستان پر مجوزہ جلسہٴ عام منعقد کیا جائے؟ اس جلسہٴ عام میں کیا تقریر کی جائے؟ کابینہ کے ارکان کی طرف سے مختلف آراء کا اظہار کیا گیا۔ تاہم ہر شخص اس بات پر متفق تھا کہ جلسہ ہونا چاہیے خواہ پیپلز پارٹی بھی اس کے

مقابلے میں لاہور میں جلسہ کیوں نہ کرے۔ میری باری آئی، جونیجو صاحب نے کہا: نوجوان! آپ کی رائے کیا ہے؟ میں نے کہا: جنابِ وزیرِ اعظم! اگر آپ اس روز قوم کو کوئی پیغام دے سکتے ہوں تو جلسہ بھی کر لیں اور تقریر بھی ہونی چاہیے۔ لیکن محض رسمی جلسہ اور رسمی کلمات پر اکتفا کرنا ہے تو بہتر یہ ہوگا کہ یہ پروگرام منسوخ کر دیا جائے۔ کابینہ کے اجلاس میں تقریباً سناٹا چھا گیا۔ یوسف رضا گیلانی سب سے جونیئر رکن تھے۔ اُن کی رائے بھی سب سے مختلف تھی۔ وزیرِ اعظم کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے یہ جلسہ منسوخ کر دیا جائے۔ کابینہ کا اجلاس ملتوی ہو گیا۔ سبھی وزراء اپنے اپنے دفاتر میں چلے گئے۔ یوسف رضا گیلانی کے گرین ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف خود وزیرِ اعظم محمد خان جونیجو تھے۔

انہوں نے کہا: ''جلسے کا پروگرام تبدیل نہیں کیا جا رہا اور تمہاری خواہش اور تجویز کے مطابق میری تقریر میں قوم کے نام پیغام بھی ہوگا۔''

''کیا پیغام؟'' یوسف رضا گیلانی نے جوش سے پوچھا: ''میں نے جنرل ضیاءُ الحق سے بات کر لی ہے۔ انہوں نے پیغام کے متن پر ہاں کر دی ہے۔'' محمد خان جونیجو نے کہا۔

14 راگست 1985ء کو مینارِ پاکستان پر یومِ آزادی کی قومی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ نواز شریف تھے۔ ابھی تک مرکز اور صوبوں میں غیر جماعتی نظام جاری و ساری تھا۔ وزیرِ اعظم اور وزیرِ اعلیٰ کے مابین بہت اچھے تعلقات کار نہیں تھے۔ جلسے کے اہتمام میں بھی حکومتِ پنجاب یا شہریانِ لاہور نے کسی خاص جوش و خروش کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

محمد خان جونیجو سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس چبوترے پر آئے جہاں سے 1940ء کو قراردادِ پاکستان پیش کی گئی تھی۔ اس مقام پر کھڑے ہونے اور تقریر کرنے کے آداب کا تقاضا تھا کہ وزیرِ اعظم رسمی کلمات ادا نہ

کریں۔ محمد خان جونیجو نے آہستہ آہستہ نرم لہجے میں تقریر کی۔ پھر وہ جس قدر اپنی آواز کو بلند کر سکتے تھے اور جتنا بھی جذباتی لہجہ اختیار کر سکتے تھے اُس لب و لہجہ میں انہوں نے دوٹوک اور واضح اعلان کیا:

''جمہوریت اور مارشل لا ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔''

محمد خان جونیجو، اُن کی اسمبلی اور نیا سیاسی نظام جسے وہ جمہوریت قرار دے رہے تھے مارشل لا کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ جن لوگوں نے یہ اعلان سنا انہیں اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ مارشل لا کا بچہ مارشل لا کو آنکھیں دکھا رہا ہے۔ مارشل لا کیسے رخصت ہوگا؟ جمہوریت کیسے آزاد ہوگی؟ اپنی پٹڑی پر واپس چڑھے گی؟ کسی کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا اور دور دور تک اس بات کا شائبہ تک نظر نہیں آ رہا تھا کہ کسی روز مارشل لا کی بساط بھی لپیٹی جا سکتی ہے۔ لیکن ایک وزیرِ اعظم صرف ایک ''بچگانہ'' قسم کے وزیر کے ایما پر بہت بڑا اعلان کر چکا تھا۔

اب 14 راگست 1997ء بھی گزر گیا ہے۔ جمہوریت آزاد ہے۔ اس کے سر پر کسی مارشل لا کا سایہ نہیں۔ وزیرِ اعظم کی کابینہ میں ایک سے بڑھ کر ایک دانشور موجود ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی اپنے لیڈر کو یہ مشورہ نہیں دے سکا کہ پاکستان کی آزادی کی گولڈن جوبلی کے موقعہ پر نصف شب کے لمحے میں پارلیمنٹ کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے قوم کو کوئی ''پیغام'' بھی دیں۔ قوم نے یہ تقریر بھی سنی۔ صبح اٹھ کر ایک اور تقریر سنی۔ سہ پہر کو قائداعظم کے مزار پر بھی تقریر سنی۔ نجانے اور کتنی تقریریں ہوئی ہوں گی۔ اتنی ڈھیر ساری مگر بے مغز، بے جیت اور کسی بھی ''پیغام'' سے عاری تقریر سے بہتر تھا کہ صرف ایک تقریر کی جاتی اور اس میں قوم کو کوئی راہِ عمل دی جاتی۔ کوئی روشنی دکھائی جاتی۔ پاکستان کی گولڈن جوبلی کے موقعہ پر مسلم لیگ اقتدار میں ہے۔

اس جماعت کے اسلاف کو پاکستان بنانے کا اعزاز حاصل ہوا تھا لیکن

انہوں نے ایک جدید، اسلامی، جمہوری، فلاحی، پارلیمانی ریاست کی بنیاد رکھنی تھی۔ اس جماعت کے ایک وزیرِ اعظم محمد خان جونیجو کو یہ توفیق نصیب ہوئی کہ وہ یہ کہہ سکے:

''جمہوریت اور مارشل لا ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔''

لیکن اب یہی جماعت گولڈن جوبلی پر ایک ایسا ''قانونی تحفہ'' بھی دے رہی ہے جسے دنیا کا کوئی فاشسٹ نظام بھی گلے لگانے کو تیار نہیں۔ اس جماعت یا اس کی کابینہ میں کوئی ایک یوسف رضا گیلانی موجود نہیں ہے۔ احسن اقبال بھی خاموش ہے۔ شیخ رشید کی زبان بھی گنگ ہے۔ خواجہ صفدر کا بیٹا کہیں نظر نہیں آتا۔ محمد حسین چٹھہ کا بیٹا بھی چودھویں ترمیم کے بوجھ تلے دبا ہوا۔ کاش ان میں سے کوئی ایک بھی یوسف رضا گیلانی کا سا کردار ادا کرتا۔

وزیرِ اعظم کے معالجوں نے کان میں تکلیف کی وجہ سے انہیں مشورہ دیا کہ وہ چند روز کے لیے ہوائی سفر نہ کریں، لہٰذا وزیرِ اعظم نے بذریعہ ٹرین کراچی جانے کا فیصلہ کیا اور ساتھ ہی بڑے سٹیشنوں پر خطاب کا پروگرام بھی بنالیا، اس پروگرام میں ملتان بھی شامل تھا۔ اس مقصد کے لیے سابق وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے لیے خصوصی طور پر بنائے گئے سیلون پر سفر کرنے کا انتخاب کیا گیا کیونکہ اس میں پبلک ایڈریس سسٹم کا مکمل انتظام تھا۔ میں نے ضلع ملتان سے تعلق رکھنے والے اراکینِ پارلیمنٹ سے رجوع کیا تا کہ وزیرِ اعظم کا ملتان ریلوے سٹیشن پر ایک یادگار اجتماع ہو۔ میں نے ایم پی اے شاہ محمود سے کہا کہ اس سلسلے میں ہم دونوں پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیونکہ میں وفاقی وزیر ہوں اور آپ کے والد گورنر پنجاب۔ اس سلسلے میں دیگر اراکینِ قومی وصوبائی اسمبلی سے بھی رابطہ کیا گیا۔ ہر ایک نے ریلوے سٹیشن پر ہزاروں افراد لانے کی یقین دہانی کروائی۔ جس روز وزیرِ اعظم کی ملتان آمد تھی میں مقررہ وقت سے چند گھنٹے قبل انتظامات کا جائزہ لینے ریلوے سٹیشن پر گیا تو تعجب ہوا کہ وعدہ کرنے والوں میں سے کوئی بھی موجود نہ تھا۔ میں نے ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ ریلوے ملتان میاں محمد عاشق سے مشورہ کیا کہ کیا وزیرِ اعظم کی ٹرین کی ملتان آمد میں کچھ تاخیر کی جا سکتی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اگر وفاقی وزیر ریلوے کی موجودگی

میں وزیرِ اعظم کی ٹرین لیٹ ہو جائے تو یہ بہت بڑی خبر بن جائے گی۔

سوچ بچار کے بعد یہ لائحہ عمل طے کیا گیا کہ ٹرین کو پلیٹ فارم سے گزار کر روکا جائے، تا کہ جب مسافر چائے، پانی اور کھانے وغیرہ کے لیے ٹرین سے باہر آئیں تو پلیٹ فارم پر زیادہ لوگ نظر آئیں۔ محکمہ ریلوے ملتان کے سینکڑوں ملازمین کو بھی پلیٹ فارم پر لایا جائے۔ ہم نے اس منصوبے پر عمل کیا۔ اسی دوران کچھ اراکینِ قومی وصوبائی اسمبلی عوام کے کندھوں پر سوار اپنے ہی حق میں نعرے لگواتے ہوئے ریلوے سٹیشن پہنچ گئے۔ جونہی ٹرین رُکی تو میں صدیق کانجو کے ہمراہ سیلون میں داخل ہو گیا۔ اس دوران صدیق کانجو نے مجھ سے کہا کہ آپ وزیرِ اعظم سے سفارش کریں کہ وہ مجھے اقوامِ متحدہ کے وفد میں شامل کر لیں۔ جب میں نے سفارش کی تو وزیرِ اعظم نے کہا کہ میں وفد تشکیل دے چکا ہوں۔ لیکن میرے اصرار پر انہوں نے صدیق کانجو کا نام بھی وفد میں شامل کرنے کی حامی بھر لی۔

اب وہ گھڑی آ گئی جس کا سب کو انتظار تھا۔ میں جلدی سے سیلون کے دروازے کے آگے کھڑا ہو گیا اور میگا فون خود تھام لیا۔ میں نے وزیرِ اعظم کو اتنی ہی جگہ دی کہ اُنہیں حدِ نگاہ تک لوگ ہی لوگ نظر آئیں۔ بہرحال انہوں نے عوام سے خطاب کیا۔ ہماری ترکیب کامیاب رہی اور ہم شرمندگی سے بچ گئے۔ وزیرِ اعظم نے جلسے کی تعریف کی اور مجھے کہا کہ سائیں! آپ بہت مقبول ہیں۔ لیکن اس بات کی شرمندگی مجھے آج بھی محسوس ہوتی ہے۔

وزیرِ اعلیٰ پنجاب نواز شریف، ایم پی اے ملک شاہ محمد جوئیہ کی دعوت پر کہروڑ پکا تا میلسی سڑک کا افتتاح کرنے لودھراں آئے۔ اس تقریب کا دعوت نامہ مجھے شاہ محمد جوئیہ نے خود اسلام آباد آ کر دیا۔ میں حسبِ پروگرام لودھراں پہنچ گیا۔ میری میاں صاحب سے ملاقات لودھراں ریسٹ ہاؤس میں ہوئی۔ ہم نے سڑک کا افتتاح کرنے کے لیے اکٹھے جلوس کی صورت میں جانا تھا۔ جلوس روانہ ہونے لگا تو پروٹوکول کے مطابق مجھے وزیرِ اعلیٰ کی کار میں بیٹھنا تھا مگر میاں صاحب نے اپنی کار میں وفاقی پارلیمانی سیکرٹری صدیق کانجو اور صوبائی وزیر شاہ محمود کو بٹھا لیا اور میں وہیں کھڑا رہا جس کا وہاں پر موجود دیگر تمام سرکردہ اصحاب نے بھی بُرا منایا۔ جب میں اپنی کار میں افتتاح کے مقام پر پہنچا تو میرے پہنچنے سے پہلے ہی سڑک کا افتتاح ہو چکا تھا۔

مجھے اس تقریب کے بعد جلسہ گاہ میں شاہ محمد جوئیہ نے بتایا کہ ہم نے افتتاحی تختی پر

آپ کا نام بھی تحریر کروایا تھا کیونکہ یہ سڑک ہمیں آپ نے ایشین ڈیویلپمنٹ بینک کے پروگرام 'کھیتوں سے منڈی تک' کے تحت دی تھی۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے وزیرِ اعلیٰ کو بتایا کہ میں لودھراں میں گرلز کالج کے لیے وزیرِ اعظم کی خصوصی گرانٹ سے فنڈز کا انتظام کروا چکا ہوں، آپ اس کالج کے اجراء کا صرف اعلان کر دیں۔ وزیرِ اعلیٰ نے صدیق کانجو کے تو تمام مطالبات منظور کر لیے مگر میرے مطالبے پر لودھراں گرلز کالج کے اجراء کا اعلان نہ کیا۔ لودھراں کے عوام نے اس بات کا بھی بہت بُرا منایا۔ بعد میں جب گرلز کالج، وزیرِ اعظم کی خصوصی گرانٹ سے مکمل ہو گیا تو میں اس کا افتتاح کرنے کے لیے بذریعہ ٹرین لودھراں جا رہا تھا کہ مجھے لودھراں کے مجسٹریٹ سیّد زاہد حسین جیلانی خصوصی طور پر ملے اور مطلع کیا کہ صوبائی حکومت نے محکمہ تعلیم پنجاب کو کالج کی افتتاحی تقریب میں شریک ہونے سے روک دیا ہے۔ میں نے دورہ ملتوی کر دیا مگر بعد میں میرے ہی حلقے میں میری ہی منظور کروائی گئی گرانٹ سے تعمیر ہونے والے گرلز کالج کا افتتاح صدیق کانجو نے کیا۔ مجھے اس طرح کے مسلسل واقعات مسلم لیگ سے دور کرتے گئے، میرا دل مسلم لیگ کی اندرونی سازشوں سے ٹوٹ گیا۔

1986ء میں میاں محمد یٰسین وٹو نے بطور وفاقی وزیرِ خزانہ ملک کا سالانہ بجٹ پیش کیا تو اسے قومی اسمبلی نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پارلیمانی روایات کے مطابق بجٹ کی ناکامی حکومت کی شکست تصور ہوتی ہے۔ وزیرِ اعظم نے فوری طور پر بجٹ میں ترمیم کرنے کا وعدہ کیا۔ چند دنوں بعد اسمبلی میں ترمیم شدہ بجٹ پیش کیا گیا جو خالصتاً سیاسی بنیادوں پر تیار کیا گیا تھا۔ وزیرِ اعظم نے بجٹ کے موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ جرنیل اور بیوروکریٹس بڑی بڑی کاریں استعمال کرتے ہیں، میں اُنھیں سوزوکی ہزار سی سی کاروں میں بٹھاؤں گا۔ انہوں نے وفاقی وزراء کے لیے تیرہ سو سی سی، صدر اور وزیرِ اعظم کے لیے سولہ سو سی سی کاروں کا اعلان کیا۔ یہ احکامات سول و ملٹری افسر شاہی کو بہت ناگوار گزرے۔ اُسی دن سے وزیرِ اعظم کے خلاف محلاتی سازشیں شروع ہو گئیں۔

جونیجو کے دورِ اقتدار میں آئین میں آٹھویں ترمیم پاس کی گئی جو بظاہر صدر اور وزیرِ اعظم کے اختیارات میں توازن پیدا کرنے کے لیے تھی۔ اگر چہ حزبِ اختلاف کی تعداد کم تھی مگر ان کا رویّہ خاصا جارحانہ تھا جس کی وجہ سے انہوں نے حکومت کو زِچ کیا ہوا تھا۔ اس بل پر

اَڑتیس دن بحث ہوئی۔ انہی دنوں مجھے رات تقریباً ایک بجے اطلاع دی گئی کہ کابینہ کا ہنگامی اجلاس ایوانِ صدر طلب کیا گیا ہے۔ اُن دنوں وزراء کے بالعموم کالی شیروانی پہن کر ایوانِ صدر جانے کی رسم تھی۔ میں بھی کالی شیروانی پہن کر رات تقریباً دو بجے ایوانِ صدر پہنچ گیا۔ میں ایوانِ صدر پہنچا تو وزیرِ اعظم پہلے ہی سے موجود تھے۔ میں نے ان سے سوال کیا کہ وزیرِ اعظم صاحب !خیریت تو ہے؟انہوں نے جواب دیا کہ ابھی معلوم ہو جائے گا۔

کابینہ کا اجلاس شروع ہو گیا جس کی صدارت صدر اور وزیرِ اعظم نے اکٹھے کی۔ صدر ضیاء الحق نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ میرے اوپر کوئی دباؤ نہیں تھا کہ میں انتخابات کرواتا مگر آج میرے اختیارات کم کرنے کا سوچا جا رہا ہے جسے میں برداشت نہیں کر سکتا۔ انہوں نے مزید کہا کہ کیا آپ مجھے چوہدری فضل الٰہی بنانا چاہتے ہیں؟ اس پر وزیرِ اعظم نے جواب دیا کہ میں نے پارلیمانی پارٹی اور وفاقی کابینہ کو اعتماد میں لیا ہے، وہ نیشنل سیکورٹی کونسل کی تشکیل اور چند دوسرے نکات ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ وزیرِ اعظم نے نہایت بردباری کے ساتھ پارلیمنٹ کے حقوق کا تحفظ کیا اور میں اس دور کی حزبِ اختلاف کو بھی خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں کہ تعداد میں کم ہونے کے باوجود وہ آمر کے سامنے ڈٹ گئے۔ انہوں نے وزیرِ اعظم اور وزیرِ اعلیٰ کی نامزدگی کی بجائے اکثریت رکھنے والے شخص کو ان عہدوں پر لانے کے لیے آئین میں ترمیم کی۔

میں نے وفاقی وزیر ہاؤسنگ وتعمیرات بننے سے ایک سال قبل بطور چیئرمین ضلع کونسل، ملتان ورکن وفاقی کونسل، انڈونیشیا کا دورہ کیا۔ اس دورے میں وفد کی قیادت چیئرمین مجلس شوریٰ خواجہ محمد صفدر نے کی۔ وفد میں میرے علاوہ میر چاکر خان ڈومکی، رسول بخش تالپور، آزاد بن حیدر اور میاں غلام حیدر وائیں شامل تھے۔ وفد نے جکارتہ، سولو، جاوہ 'بور بودور مندر اور ڈیم (Borbodur Temple and Dam) کا دورہ کیا۔ سولو شہر کے دورے کے دوران ہمیں باتِک فیکٹری (Batik Factory) بھی لے جایا گیا، وہیں مضافات میں ہماری جمالیاتی حِس کی تسکین کے لیے مناظرِ فطرت کا وسیع سلسلہ تھا جبکہ غلام حیدر وائیں فطری حُسن سے بے نیاز، اس بات کا رونا رو رہے تھے کہ کہیں چیئرمین میونسپل کمیٹی، میاں چنوں کے عہدے پر پیر شجاعت حسنین اُن کے خلاف عدم اعتماد نہ کروا دیں۔

دورۂ انڈونیشیا کے موقعہ پر صدر سوہارتو اور کئی وزراء سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ میں منسٹرز انکلیو (وزراء کالونی) سے بہت متاثر ہوا۔ جس میں ایک ہی طرز کے گھر، اُن کا ایک ہی داخلہ پوائنٹ، مشترکہ لان، سوئمنگ پول، ٹینس کورٹ، کلب اور مشترکہ مرمت و سیکورٹی کا نظام تھا۔

میں جب 1985ء میں وفاقی وزیر ہاؤسنگ و تعمیرات بنا اور وفاقی وزراء کے لیے رہائشی سکیم کا مجوزہ نقشہ لے کر وزیرِ اعظم کے پاس گیا، تو انہوں نے اپنے تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ سکیم غیر محفوظ ہے کیونکہ اگر کسی دشمن نے اس کالونی پر بم پھینک دیا تو تمام وزراء ہلاک ہو جائیں گے۔ میں نے کہا کہ اس کے اردگرد کئی اہم عمارتیں ہیں جن میں کشمیر ہاؤس، سرحد ہاؤس، سندھ ہاؤس، بلوچستان ہاؤس اور ہالیڈے ان (موجودہ میریٹ) ہوٹل شامل ہیں۔ جب دوسری مرتبہ میں گھروں کے نقشے منظور کروانے کے لیے وزیرِ اعظم کے پاس گیا تو انہوں نے نقشوں کو اس بنیاد پر تبدیل کرنے کے لیے کہا کہ یہ گھر بہت کشادہ ہیں، ان گھروں کا سائز کم کیا جائے۔ اس طرح اُن کی ہدایت کے مطابق ہم نے موجودہ وزراء کالونی، اسلام آباد کے گھر بنوائے۔

ہاؤسنگ و تعمیرات کی وزارت بہت محنت طلب تھی۔ میں نے اپنے محکمے کے لیے اہم منصوبہ بندی کی اور وسائل کے تجزیے کے لیے چاروں صوبوں کا دورہ کیا۔ میرے دور میں جن قومی عمارات کی تعمیر و توسیع کی گئی اُن میں فلیگ سٹاف ہاؤس، مزارِ قائدؒ کراچی، قائداعظمؒ ریزیڈنسی زیارت، جنرل پوسٹ آفس اور چمبہ ہاؤس لاہور شامل ہیں۔ اُس دور میں بہت سے منصوبے پایۂ تکمیل کو پہنچے ان میں فیصل مسجد، پارلیمنٹ ہاؤس، منسٹرز کالونی، فیڈرل لاجز، گلشن جناح فلیٹس اور پاکستان ورکس ڈیپارٹمنٹ ہیڈ آفس، اسلام آباد شامل ہیں۔ اسی دور میں PEPAC* اور نیشنل کنسٹرکشن کمپنی کے تحت بھی کئی یادگار عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ 'سٹیٹ گیسٹ ہاؤس' کراچی میں تعمیر کروائی گئی ایک خوبصورت مسجد کو دیکھ کر صدر ضیاءُالحق نے تعریف کرتے ہوئے کہا تھا "It's a jewel."۔ موجودہ وزیرِ اعظم ہاؤس اسلام آباد کی تعمیر کے لیے جگہ کا انتخاب بھی میں نے ہی وزیرِ اعظم جونیجو کے ساتھ مل کر کیا تھا۔ پارلیمنٹ بلڈنگ میں جب الائیڈ بینک کی برانچ کھولی گئی تو پہلا اکاؤنٹ (نمبر 1) میں نے کھلوایا۔

* Pakistan Environmental Planning and Architectural Consultant (PEPAC)

وزارتِ ہاؤسنگ و تعمیرات نے گھروں کی الاٹمنٹ کے سلسلے میں بہت سے نئے محکمے الاٹمنٹ کے دائرۂ کار میں شامل کیے جن میں انکم ٹیکس، کسٹمز اور سوئی گیس کے محکمے قابلِ ذکر ہیں۔ ٹاؤن پلاننگ کے نئے طریقے متعارف کروانے کے سلسلے میں کئی کانفرنسوں کا انعقاد کیا گیا۔ گھروں کی تعمیر میں نئی ٹیکنالوجی متعارف کروائی گئی۔ کئی بے روزگاروں کو روزگار فراہم کیا گیا۔ سیکٹر I-9/4 اسلام آباد کے فلیٹس کی تعمیر اسی نئی ٹیکنالوجی کے تحت شروع کروائی گئی۔ وفاقی ملازمین کے لیے گھروں کی تعمیر کی گئی اور کئی مستحقین کو گھر الاٹ کیے گئے۔ اسی سلسلے میں وفاقی کالونی، لاہور کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ اس کے علاوہ فیڈرل گورنمنٹ ایمپلائز ہاؤسنگ فاؤنڈیشن کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے تحت دس سال مدت ملازمت پوری ہونے پر مالکانہ حقوق پر پلاٹ الاٹ کیے گئے۔ ان پلاٹوں پر گھر بنانا لازمی قرار دیا گیا۔ یہ سکیم بہت کامیاب ہوئی اور ہزاروں وفاقی ملازمین نے استفادہ کیا۔ مجوزہ ریلوے سٹیشن اسلام آباد کو سیکٹر I-8 سے گولڑہ منتقل کیا گیا اور اس جگہ سرکاری ملازمین کے لیے اسی سکیم کے تحت گھر بنوائے گئے۔ اسی ادارے کے تحت اس وقت اسلام آباد میں سیکٹر G-13 اور سیکٹر G-14 جیسے بڑے رہائشی منصوبے زیرِ تکمیل ہیں۔ اب اکیس سال بعد پنجاب حکومت نے بھی اسی اصول کو اپناتے ہوئے سرکاری ملازمین کے لیے رہائشی سکیموں کا اعلان کیا ہے۔

سابق وفاقی وزیر کشمیر و شمالی علاقہ جات سیّد قاسم شاہ سے میرے قریبی مراسم تھے۔ جن دنوں میں وفاقی وزیرِ ریلوے تھا اُن دنوں وہ صدر ضیاءُ الحق کے خاصے قریب آ چکے تھے۔ صدر ضیاءُ الحق انہیں ارباب محمد جہانگیر کی جگہ وزیرِ اعلیٰ سرحد بنانا چاہتے تھے۔ ارباب جہانگیر بھی متفق ہو گئے مگر انہوں نے دو دن کی مہلت طلب کی اور اپنے چند دوستوں سے مشاورت کی جن میں پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ نواز شریف بھی شامل تھے۔ اُن سب احباب نے انہیں وزیرِ اعلیٰ کے عہدے سے مستعفی نہ ہونے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے مستعفی ہونے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے سیّد قاسم شاہ وزیرِ اعلیٰ سرحد نہ بن سکے۔

چچا حامد رضا نے مسلم لیگ میں شمولیت کے لیے وزیرِ اعظم جونیجو سے رابطہ کیا، اس وقت چچا نیشنل پیپلز پارٹی (این پی پی) کے نائب صدر اور ایم این اے تھے۔ وزیرِ اعظم نے مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے کہا کہ حامد رضا گیلانی، گورنر پنجاب اور آپ کا تعلق ملتان سے ہے، کیوں نہ

ہم کل افطاری گورنر پنجاب کے ہاں کریں اور آپ کے چچا کی مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان بھی وہیں کردیں۔اس دوران مجھے اس پروگرام کے متعلق چچا کا فون بھی آ گیا۔

میں حسب پروگرام چچا کی رہائش گاہ پر لاہور پہنچ گیا، صدیق کانجو بھی وہاں موجود تھے۔ہم دونوں نے چچا حامد رضا سے کہا کہ حال ہی میں گورنر پنجاب مخدوم سجاد حسین نے ایم پی اے شاہ محمد جوئیہ کی وفات کے بعد ضمنی انتخاب میں اُن کے بیٹے سجاد خان جوئیہ کی مخالفت کی تھی حالانکہ وہ مسلم لیگ کے نامزد اُمیدوار تھے،لہٰذا ہمیں مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان 'گورنر ہاؤس' میں نہیں کرنا چاہیے۔ چچا نے جواب دیا کہ میں وزیرِ اعظم سے وعدہ کر چکا ہوں ۔ ہم حسب پروگرام 'گورنر ہاؤس' پہنچے۔اس تقریب میں گورنر پنجاب نے چچا کی مسلم لیگ میں شمولیت کا خیر مقدم کیا۔

صدیق کانجو اور میں نے وزیرِ اعظم کی موجودگی میں ضمنی انتخاب میں گورنر پنجاب کی طرف سے مسلم لیگ کے نامزد اُمیدوار کی مخالفت کرنے پر احتجاج کیا۔ چچا نے ہم دونوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی ۔ جیسے ہی افطاری کا وقت ہوا اور ہم لان سے اٹھ کر 'گورنر ہاؤس' کے اندر جانے لگے تو وزیرِ اعظم نے میرا ہاتھ تھام کر ساتھ چلنا شروع کر دیا اور کہا کہ آپ ہمارے بڑے ہیں اپنا دِل بڑا کریں۔افطاری کے بعد سیکرٹری جنرل مسلم لیگ اقبال احمد خان نے چچا کو مسلم لیگ کا رکنیت فارم مہیا کیا۔چچا نے ہمارے علاوہ اپنے بیٹے سیّد محمد رضا کی موجودگی میں فارم پر دستخط کیے۔

میں نے فیڈرل لاج،مری کی انسپکشن کے لیے خفیہ دورہ کیا اور اپنی شناخت ظاہر کیے بغیر رات بارہ بجے کے قریب فیڈرل لاج نمبر 5 پہنچ گیا جو جونیئر افسران کے لیے مختص تھی۔اُس وقت موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور کار پارکنگ کے لیے بھی کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں نے اپنے ڈرائیور کو بھیج کر فیڈرل لاج کے عملے سے رہائش کی دستیابی کے بارے میں معلوم کروایا تو وہاں پر موجود عملے نے کہا کہ تمام کمرے بک ہو چکے ہیں۔میرے ڈرائیور نے مجھے بتائے بغیر کچھ رقم اُنہیں دی تو رہائش کے لیے کمرہ مل گیا۔میں تھکا ہوا تھا لہٰذا فوراً سو گیا۔دورہ مری سے چند روز قبل میرے تایا زاد بھائی سیّد طفیل محی الدّین نے میرے پرائیویٹ سیکرٹری کے ذریعے فیڈرل لاج میں کمرہ بک کروایا تھا۔مجھ سے عزیز داری کے سبب وہاں کا عملہ اُن کی خوب خاطر تواضع کر رہا تھا۔

میرے قیام کے بارے میں صبح تک تمام عملے کو معلوم ہو چکا تھا۔ میں رات کو جس کمرے میں قیام پذیر ہوا اُس کی حالت خاصی خراب تھی اور اُس کمرے کے لیے میرے ڈرائیور سے رشوت لینے والے اہلکار بڑے پریشان تھے۔ میرے ردِ عمل کو کم کرنے کے لیے انہوں نے طفیل محی الدّین کی مِنت سماجت کی۔ عملے کو معلوم نہیں تھا کہ ہمارے تعلقات خاصے کشیدہ ہیں۔ طفیل محیٰ الدّین جسامت میں بھاری، باریک آواز اور بھولی طبیعت کے مالک ہیں، وہ عملے کے کہنے پر میرے کمرے میں آ گئے۔ میں نے ٹھنڈ کی وجہ سے اپنے اوپر رضائی اوڑھ رکھی تھی۔ اچانک میرے اوپر ایک بھاری بھرکم چیز آ گری جس سے میری سانس بند ہونے لگی۔ وزن اتنا زیادہ تھا کہ مجھے رضائی سے اپنا منہ نکالنے کے لیے خاصا زور لگانا پڑا۔ مجھے ایک باریک آواز سنائی دی کہ بھائی صاحب! آپ مجھے معاف کر دیں۔ میں بڑی مشکل سے کہہ پایا کہ میں نے آپ کو معاف کیا۔ اُس نے اپنے آپ کو ہٹائے بغیر کہا کہ اب عملے کو بھی معاف کر دیں۔ میں نے کہا کہ میں نے انہیں بھی معاف کیا۔ اگر معاف کرنے میں ذرا سی تاخیر ہو جاتی تو شاید میں اللہ کو پیارا ہو چکا ہوتا۔

خضر حیات کا تعلق ملتان سے ہے اور ہمارے خاندان سے اُن کے دیرینہ تعلقات ہیں۔ جب میں وفاقی کونسل کا رکن اور ضلع کونسل، ملتان کا چیئرمین تھا اور اجلاس میں شرکت کے لیے اسلام آباد جا رہا تھا تو راستے میں میری ملاقات اُن کے بھائیوں چودھری دوست محمد اور چودھری طفیل محمد سے ہوئی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ہم جہلم جا رہے ہیں کیونکہ خضر حیات کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، جس میں وہ اور اُن کی اہلیہ خاصے زخمی ہوئے ہیں۔ یہ سن کر میں جہلم ہسپتال پہنچا تو دیکھا وہ شدید زخمی تھے اور اُن کا کافی خون بہہ چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے فوری خون کا مطالبہ کیا۔ اتفاق سے میرے خون کا گروپ بھی B(+ve) تھا جو خضر حیات کو درکار تھا، اس طرح یہ ضرورت وہیں پوری ہو گئی۔

خضر حیات میرے پرائیویٹ سیکرٹری تھے، میں ایک مرتبہ کسی بات پر اُن سے ناراض ہو گیا تو وہ روٹھ کر چلے گئے۔ چند روز بعد وفاقی کابینہ میں ردّ و بدل ہوا تو مجھے وزارتِ ریلوے کا قلمدان سونپ دیا گیا۔ میں اُنہیں منانے کے لیے اُن کی رہائش گاہ غازی علم الدّین شہید ہوسٹل، اسلام آباد گیا جہاں میں بھی وزارت سے قبل اکثر قیام کیا کرتا تھا۔ ان کی ہمسائیگی میں جسٹس سجاد علی شاہ رہائش پذیر تھے۔ میرا اُن سے تعارف خضر حیات ہی نے کروایا تھا۔ میں نے خضر حیات

سے کہا کہ میں آج ہی ریلوے کا وفاقی وزیر بنا ہوں اور آپ کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔ یہ سن کر وہ جذباتی ہو گئے اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ میرے رویّے سے ناراض نہ ہوا کریں کیونکہ جب سے مجھے آپ نے اپنا خون دیا ہے اس وقت سے مجھے غصہ بہت آنے لگا ہے۔

وزارتِ ریلوے میں لاکھوں ملازمین، سینکڑوں افسران، درجنوں ریلوے یونینز ہیں اس کے اپنے ہسپتال، ریسٹ ہاؤسز، ورکشاپس اور اپنی پولیس ہے۔ It's a state within a state (یہ ریاست کے اندر ایک ریاست ہے)۔ میں نے اپنے دور میں اس محکمے کی کارکردگی بڑھانے کے لیے زیادہ توجہ ریل گاڑیوں کی 'رفتار' پر دی۔ پورے ملک میں ریلوے لائن کی مرمت کروائی گئی اور مین لائینوں پر رکاوٹوں کو ختم کروایا گیا۔ لودھراں تا ملتان اور شیر شاہ تا پیراں غائب ریلوے لائن کو ڈبل کرنے کا حکم دیا گیا۔ رسالپور میں ریلوے انجن بنانے کے کارخانے کی بنیاد رکھی جو ملکی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی دور میں ڈرائی پورٹس کے لیے بھی کام کروایا گیا یہ کام خصوصی طور پر ملتان، سیالکوٹ اور پشاور میں ہوا۔ شالیمار ایکسپریس کے روٹ کو تبدیل کر کے اُسے براستہ ملتان کروایا گیا۔ چناب ایکسپریس کا روٹ تبدیل ہو چکا تھا جسے ملک امجد علی نون جو بعد میں سفیر و ناظم اعلیٰ سرگودھا منتخب ہوئے، کے مطالبے پر عوام کی سہولت کے لیے سابقہ روٹ براستہ بھلوال بحال کروا دیا۔ زکریا ایکسپریس ملتان تا کراچی نئی ٹرین کا افتتاح کیا گیا۔ موسیٰ پاک ایکسپریس کو ائر کنڈیشنڈ کروایا گیا۔ ایک ہی دن میں درجنوں پسنجر ٹرینوں کو ایکسپریس کا درجہ دلوایا گیا۔ کبانہ ریسٹورینٹ، لاہور کے تعاون سے ریلوے میں فاسٹ فوڈ متعارف کروایا گیا۔ کوریا کے ماہرین کے ذریعے ریلوے میں آٹومیٹک سگنلنگ سسٹم نصب کروایا گیا۔ سٹیشنوں پر سٹالز اور وینڈرز کے ذریعے ہزاروں بے روزگار افراد کو روزگار فراہم کیا۔ میں نے کوئٹہ میں محکمہ ریلوے کی طرف سے امراضِ سینہ کے سردار بہادر ہسپتال کا افتتاح کیا۔ کوئٹہ سے زاہدان (ایران) کے لیے ہفتے میں دو مرتبہ ٹرین چلانے کا منصوبہ مکمل کروایا گیا۔ اُسی دور میں سعودی عرب میں حفوف تا دمام ریلوے لائن بچھائی گئی جس سے نہ صرف کئی پاکستانی بے روزگار نوجوانوں کو روزگار ملا بلکہ اس طرح پاکستان ریلوے کو بیرون ملک بھی متعارف کروایا گیا۔ ریلوے ایکٹ میں طویل عرصے کے بعد ترمیم کی گئی۔

سابق وفاقی وزیر راجہ نادر پرویز جو وزارت ہاؤسنگ و تعمیرات کے پارلیمانی سیکرٹری

رہ چکے تھے، کے پُر زور مطالبے پر میں نے خانیوال ایکسپریس (جو فیصل آباد تک آتی تھی) کا روٹ بڑھا کر راولپنڈی تک کروادیا۔ اس فیصلے سے عوام اور کاروباری طبقے کا دیرینہ مطالبہ پورا ہو گیا۔ اس ٹرین کے افتتاح کے موقعہ پر ہمارا تاریخی استقبال ہوا لیکن ٹرانسپورٹرز حضرات کو اس فیصلے سے مایوسی ہوئی۔

محکمہ ریلوے دیگر محکموں کی نسبت زیادہ اراضی کا مالک ہے لیکن بدقسمتی سے بیشتر حصہ ناجائز قابضین کے زیرِ اثر ہے۔ اگر اُسے واگذار کروایا جائے تو ریلوے ملازمین کے لیے رہائشی سکیمیں اور دیگر فلاحی منصوبے بنائے جاسکتے ہیں۔ ٹریفک کے مسائل کا حل صرف اور صرف ریلوے لائن کو ڈبل کرنے میں ہے۔ مختصر عرصے کے لیے ریلوے وزیر رہنے کے سبب میں یہ کام مکمل نہ کرواسکا۔

ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دیے جانے کے بعد اُن کی بیٹی بے نظیر بھٹو طویل جلاوطنی گذار کر 10/اپریل 1986ء کو وطن واپس آئیں تو اُن کا فقید المثال استقبال کیا گیا۔ بے نظیر بھٹو نے ریڈ کلف کالج، امریکہ اور یونیورسٹی آف آکسفورڈ، برطانیہ سے تعلیم حاصل کی۔ وہ پہلی ایشیائی خاتون تھیں جو آکسفورڈ یونین کی صدر منتخب ہوئیں۔ انہیں سیاست خاندانی ورثہ میں ملی۔ اُن کی آمد پر جونیجو حکومت خاصی پریشان تھی۔ کئی منصوبے سوچے گئے مگر وزیرِ اعظم نے فیصلہ کیا کہ بے نظیر بھٹو کی پاکستان آمد کے موقعہ پر کوئی رکاوٹ کھڑی نہ کی جائے۔ لاکھوں لوگوں نے اُن کا فقید المثال استقبال کیا۔ اُس روز میں اور گورنر پنجاب مخدوم سجاد حسین شادی کی ایک تقریب میں شرکت کے لیے اُن کے خصوصی طیارے میں پشاور گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر جہاز ائرپورٹ پر اُترنے لگا تو ہمیں عوام کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر دکھائی دیا۔ اسلام آباد میں جب مسئلہ افغانستان پر گول میز کانفرنس ہوئی تو بے نظیر بھٹو نے بھی شرکت کی جس کی وجہ سے صدر اور وزیرِ اعظم کے اختلافات کی ابتداء ہوئی۔

حسنِ اتفاق ہے کہ مجھے اُسی روز ربّ العزت نے تین جڑواں بیٹوں سے نوازا جن کے نام حیدر، قاسم اور موسیٰ رکھے گئے۔ چند روز بعد کراچی سے ایم این اے مولانا شاہ تراب الحق نے قومی اسمبلی میں نقطۂ اعتراض پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ محکمہ خاندانی منصوبہ بندی کو بند کردینا چاہیے کیونکہ وزراء خود اس پر عمل نہیں کررہے اور اُن کے ہاں بیک وقت تین تین بچوں کی پیدائش

ہو رہی ہے۔ اس بات پر پورا ایوان کشتِ زعفران بن گیا۔ ایوان میں موجود وزیرِ اعظم نے مجھے بلا کر تصدیق چاہی کہ کیا شاہ صاحب کی بات درست ہے؟ میرے ہاں کہنے پر وہ بھی خوب ہنسے۔

ایک مرتبہ وزیرِ اعظم نے مجھے کہا کہ میں وزراء کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہوں۔ اس پر میں نے انہیں مشورہ دیا کہ آپ پارلیمانی پارٹی کا اجلاس طلب کر کے وزراء کی موجودگی میں ارکان پارلیمنٹ سے رائے معلوم کریں۔ انہوں نے اجلاس طلب کرلیا اور اراکینِ پارلیمنٹ سے کہا کہ مجھے آپ کی طرف سے شکایات موصول ہوئی ہیں کہ وزراء آپ کے کام نہیں کر رہے، اگر آپ کو ان سے شکایات ہیں تو کھل کر بیان کریں۔ اس قسم کا اشارہ ہو تو پھر آپ خود سمجھ جائیں کہ انہوں نے وزیروں کا کیا حشر کیا ہوگا۔ ظاہر ہے یہ بات وزیرِ اعظم اس وقت کرتا ہے جب اس نے کابینہ میں ردّوبدل کرنا ہو۔ وزیرِ اعظم کا اشارہ ہی کافی تھا کہ ارکان پارلیمنٹ، وزراء پر برس پڑے اور تابڑ توڑ حملے شروع کر دیے۔ عجیب منظر تھا، جب ہر رکن دل کی بھڑاس نکال لیتا تو آخر میں یہ بات ضرور کرتا کہ صرف ایک وزیر ایسا ہے جو سب کے کام کرتا ہے اور وہ یوسف رضا ہے۔ میری سب سے زیادہ پذیرائی ملتان سے ایم این اے الحاج شیخ محمد رشید نے کی۔ انہوں نے کہا کہ یوسف رضا میرے حریف ہیں، اس کے باوجود انہوں نے میرے کہے بغیر میرے حلقے میں ملازمتیں دی ہیں جس پر میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے سب نے خراجِ تحسین پیش کیا، وہ دن ایسا تھا جیسے 'یوسف ڈے' ہو۔ میرے ساتھ وفاقی وزیر بیگم عطیہ عنایت اللہ تشریف فرما تھیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ لگتا ہے آپ ڈپٹی پرائم منسٹر بن رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ میری رائے آپ سے مختلف ہے آج میری چھٹی ہوگئی ہے اور پھر یہی ہوا۔ چند ہفتوں کے بعد کابینہ میں ردّو بدل ہوا تو میرا نام نہیں تھا۔

1987ء میں پنجاب حکومت نے بلدیاتی انتخابات کا اعلان کر دیا۔ چیئرمین ضلع کونسل، ملتان کے انتخاب میں دیوان عاشق اور شاہ محمود کے درمیان مقابلہ ہوا۔ ان انتخابات سے قبل میری بے نظیر بھٹو سے ملاقات ہو چکی تھی۔ اسی نسبت سے بے نظیر بھٹو نے ملتان میں پیپلز پارٹی کی تنظیم کو ہدایت کی کہ وہ سرکاری اُمیدوار شاہ محمود کے خلاف ووٹ دیں اور میرے گروپ کی حمایت کریں۔ ضلع کونسل، ملتان کے رکن ملک عاصم ڈھیڑ کے علاوہ پیپلز پارٹی کے کسی بھی رکن نے بے نظیر بھٹو کی ہدایت پر عمل نہ کیا۔ نتیجتاً اُس وقت شاہ محمود کو کامیابی حاصل ہوئی مگر ساتھ ہی ساتھ پیپلز پارٹی

ضلع ملتان میں مزید مضبوط اور موثر ہو گئی جس کا نتیجہ 1988ء کے عام انتخابات میں یہ ہوا کہ ضلع بھر میں پیپلز پارٹی بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گئی۔

جن دنوں اوجڑی کیمپ کا حادثہ ہوا میں کیپٹل ڈیویلپمنٹ اتھارٹی (سی ڈی اے) کے آفیسرز ہوسٹل اسلام آباد میں رہائش پذیر تھا اور باتھ روم میں نہا رہا تھا کہ مجھے اچانک دھماکے سنائی دیے۔ میں سمجھا کہ بارش کے ساتھ بادل گرج رہے ہیں، میں مطمئن ہو کر نہاتا رہا۔ جب میں باتھ روم سے باہر آیا تو کمرے میں موجود تمام لوگ جا چکے تھے۔ میں نیچے لابی میں پہنچا تو عجیب کیفیت دیکھی کہ لوگ سیڑھیوں کے نیچے چھپے ہوئے تھے اور خوف سے اُن پر لرزہ طاری تھا۔ میرے دریافت کرنے پر بتایا گیا کہ ہندوستان نے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے۔ میں اپنی کار میں سابق ایم پی اے شیخ خلیل احمد، اُن کے بیٹے شیخ طاہر اور حکیم خضر حیات قریشی کے ہمراہ ایمبیسی روڈ پر نکلا تو راستے میں ہجوم دیکھ کر معلوم ہوا کہ وہاں وفاقی وزیر پیداوار خاقان عباسی شیل لگنے کے سبب ہلاک ہو گئے ہیں جبکہ اُن کا بیٹا شدید زخمی ہے۔ ہم فوراً اُن کے گھر پہنچے۔ وہاں وزیرِ اعظم بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے فوری تحقیقات کا حکم دے دیا۔

پاکستان میں اوجڑی کیمپ کی تباہی کے دس سال بعد ایک مقبول انگریزی اخبار ' The News ' نے ایک رپورٹ شائع کی جس میں لکھا:

> یہ واقعہ پاکستان کی اُس سیاسی حکومت کے خاتمے کا سبب بنا جو کہ صدر جنرل ضیاءُالحق کے مارشل لا کے بعد قیام میں آئی تھی۔ وزیرِ اعظم محمد خان جونیجو کی حکومت جو کہ صدر جنرل ضیاءُالحق کے سائے میں پروان چڑھی تھی اوجڑی کیمپ دھماکوں کے کچھ عرصہ بعد نااہلی کے سبب اختتام پذیر ہوئی۔ اخبار نے مزید لکھا کہ جو تحقیقاتی رپورٹ جونیجو حکومت نے جاری کی تھی وہی اس حکومت کے خاتمے کا سبب بنی۔
>
> 10/اپریل 1988ء کو ایک ملین سے زیادہ آبادی والے جڑواں شہروں اسلام آباد/راولپنڈی کے لوگوں نے اپنی آنکھوں سے موت کو بارود کی شکل میں دیکھا۔ ایک دھماکے نے اوجڑی کیمپ کے ڈپو میں زبردست تباہی مچا دی جس کی وجہ سے گولے اور راکٹ دس میل کے دائرے میں

بربادی مچانے کے لیے برسنے لگے۔ ریڈکراس تنظیم کے مطابق دو دنوں میں ایک ہزار سے زائد لوگ لقمۂ اَجل بنے اور اسی تعداد میں لوگ زخمی اور معذور ہوئے۔

زیادہ تر شہریوں کا یہی ردِعمل تھا کہ شاید بھارت نے حملہ کر دیا ہے۔ یہ واقعہ اُن دنوں ہوا جب افغان تنازعہ عروج پر تھا اور پاکستان چار روز بعد جینوا معاہدے پر دستخط کرنے والا تھا۔ بعض نے یہ ردِعمل ظاہر کیا کہ شاید روس نے حملہ کر کے پاکستان کو سبق سکھایا ہے۔ سب کے ذہنوں میں سوال یہ تھا کہ ہوا کیا ہے؟ حقیقت یہ تھی کہ راولپنڈی کی حدود میں موجود کیمپ تباہ ہو گیا۔ قریب ہونے کی وجہ سے دارالحکومت اسلام آباد بھی اُڑتے ہوئے راکٹوں اور بارُود کی زد میں آ گیا۔ اخبار کی رپورٹ کے مطابق اس کیمپ میں زیادہ تر اسلحہ افغانستان جنگ میں استعمال ہونا تھا۔

اس معاملے کی تحقیق کے لیے حکومت کی طرف سے دو کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ ایک کمیٹی فوجی افسران پر مشتمل تھی جس کی سربراہی حاضر سروس جنرل کر رہا تھا۔ اس کمیٹی کی پیش کردہ تحقیقات اور تجاویز کو نظرانداز کیا گیا کیونکہ اس میں جنرل ضیاءُ الحق کے دستِ راست جنرل اختر عبدالرحمٰن اور دوسرے اعلیٰ فوجی افسران کو معطل کرنے کی تجویز دی گئی تھی۔ اس رپورٹ کو واقعہ کے ایک ہفتہ بعد جاری کیا گیا، جسے رَد کر دیا گیا۔ دوسری کمیٹی جو وزیرِ اعظم محمد خان جونیجو نے تشکیل دی وہ کافی دلچسپ تھی کیونکہ وہ ایک سیاسی انکوائری کمیٹی تھی جو چار وفاقی وزراء پر مشتمل تھی اور جس کی سربراہی ایک وفاقی وزیر کر رہا تھا۔ اس کمیٹی میں خاصا اختلاف رائے پایا جاتا تھا۔ اَراکین اتفاقِ رائے نہ کر سکے کہ اوجڑی حادثے کا اصل ذمہ دار کون تھا؟ کمیٹی کے سربراہ اسلم خٹک نے اپنے الفاظ میں واضح کہا:

"No one was responsible. It was an act of Allah"

(کوئی ذمہ دار نہیں تھا۔ یہ اللہ کی طرف سے ہوا ہے)۔ حالانکہ وزیرِ مملکت

برائے دفاع رانا نعیم محمود جو کہ جونیجو کابینہ کا جیالا اور نڈر سیاستدان تھا، نے non-papers تیار کیے جن پر پانچ میں سے تین ارکان نے دستخط کیے تھے۔ کاغذات میں سینئر جرنیلوں کے کورٹ مارشل کی تجویز دی گئی اور جنرل اختر عبدالرحمٰن کو اس حادثے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔
اکثریت کی رائے یہ ہے کہ انہی non-papers کے عوض جونیجو صاحب کو حکومت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اخبار کی رپورٹ نے ایک اور دلچسپ زاویہ پیش کیا جو اُس وقت کے ایک سینئر فوجی ممبر جنرل حمید گل سے انٹرویو تھا۔ انہوں نے کہا: ''دھماکے سے قبل، پہلے معاہدے میں کہا گیا کہ سوویت یونین اور امریکہ دونوں افغانستان کو اسلحہ کی ترسیل روک دیں گے مگر اوجڑی (دھماکہ) کے بعد امریکہ نے منفی طرز اپنایا اور تسلیم کیا کہ دونوں اطراف سے اسلحہ کی ترسیل جاری رہے گی۔''

محمد خان جونیجو نے اپنے دورِ حکومت میں تعمیرِ وطن پروگرام شروع کیا جو خاصا کامیاب رہا۔ اس پروگرام کے تحت کئی دیہاتوں میں بجلی فراہم کی گئی، کھیت سے منڈیوں تک نئی سڑکیں تعمیر کی گئیں، بڑے شہروں میں سوئی گیس کی فراہمی اور سیوریج کا بندوبست کیا گیا۔ پیپلز پارٹی کے دور میں اسے پیپلز ورکس پروگرام میں تبدیل کر دیا گیا۔

میری پیار علی الانہ کے ساتھ دوستی تھی۔ انہوں نے مجھے قائل کیا کہ میں بے نظیر بھٹو کے ساتھ ملاقات کر کے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کروں۔ میں بھی مسلم لیگ کی قیادت کی طرف سے اپنے ساتھ ہونے والی مسلسل ناانصافیوں کی وجہ سے خاصا دلبرداشتہ ہو چکا تھا۔ حسد کی فضاء اور محلاتی سازشوں کے درمیان کام کرتے رہنا میری طبیعت کے خلاف تھا۔ ان باتوں نے میرے ذہن پر بوجھ ڈالا، بدیں حالات میں نے پیار علی الانہ کی رائے سے اتفاق کر لیا۔ وہ بھٹو خاندان کے خاصے قریب تھے اور ان کے گارجین* بھی رہ چکے تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ میں اس ملاقات سے قبل قومی اسمبلی کی نشست سے استعفیٰ دے دوں کیونکہ اُس وقت پیپلز پارٹی، ایم آر ڈی*

* Guardian

* Movement for Restoration of Democracy (MRD)

کا حصہ تھی اور اگر بے نظیر بھٹو کسی حکومتی رکن سے ملاقات کرتیں تو اُس کا اتحاد پر منفی اثر پڑنے کا اندیشہ تھا۔ میں نے استعفیٰ پر دستخط کر دیے۔ ملاقات کا وقت طے کروا کے وہ مجھے بے نظیر بھٹو کی رہائش گاہ 70 کلفٹن، کراچی لے گئے۔ ہم نے اُن کے ساتھ روزہ افطار کیا۔ گفتگو کے دوران بے نظیر بھٹو نے کہا کہ میری پارٹی ملتان میں خاصی کمزور ہے، بڑے رہنما پارٹی چھوڑ چکے ہیں، مجھے خوشی ہوئی ہے کہ آپ کا تعلق ملتان سے ہے اور آپ پیپلز پارٹی میں شامل ہو رہے ہیں۔ پھر کہنے لگیں کہ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آپ نے قومی اسمبلی کی نشست سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ابھی میں آپ کا استعفیٰ منظور نہیں کرتی، میں صرف آپ کو آزمانا چاہتی تھی، میں آپ کے استعفیٰ کو وزیرِ اعظم کے مستقبل قریب میں ہونے والے دورۂ امریکہ کے دوران استعمال کروں گی۔ انہوں نے مجھے سیکرٹری جنرل پیپلز پارٹی جنرل ٹکا خان اور چیف آرگنائزر پیپلز پارٹی فاروق لغاری سے ملنے کے لیے بھی کہا۔ میں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ جب تک آپ میرا استعفیٰ منظور نہیں کرتیں اُس وقت تک میں پیپلز پارٹی کے کسی بھی عہدیدار سے ملاقات نہیں کروں گا۔ اس موقع پر میں نے یہ بھی کہا:

"There are three types of people in the world;

lovers of honour,

lovers of wisdom,

and lovers of wealth ; I am of the first type"

ترجمہ: دنیا میں تین اقسام کے لوگ ہیں:
عزت واحترام چاہنے والے،
علم وفراست چاہنے والے
اور دولت چاہنے والے، میں پہلی قسم کا ہوں۔

جس پر محترمہ نے یقین دلایا کہ آپ کو پارٹی میں احترام دیا جائے گا۔

1987ء میں چچا حامد رضا اور میں پیر صاحب پگاڑو کی بیٹی میری کزن نائلہ پگاڑو کی شادی میں شرکت کے لیے اُن کی رہائش گاہ 'کنگری ہاؤس' کراچی پہنچے جس میں صدر ضیاءُالحق نے بھی شرکت کی۔ اُن کے جانے کے بعد چچا اور میں نے پیر صاحب سے علیحدگی میں ملاقات کی۔

چچا نے پیر صاحب سے کہا کہ وفاقی کابینہ میں یوسف رضا کی دوبارہ شمولیت نہ ہونے کی وجہ سے ہمارا خاندان خاصا پیچھے رہ گیا ہے۔ چچا نے مزید کہا کہ آپ یوسف رضا کو وزیر بنوائیں۔ پیر صاحب نے جواب دیا: ''ان کا پتہ کٹ چکا ہے'' یہ وزیر نہیں بنیں گے۔ میں نے پیر صاحب سے کہا کہ اگر میں وزیر نہیں بن سکتا تو آپ چچا کو وزیر بنوائیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں! یہ وزیر بن جائیں گے۔

در پردہ حقائق یہ تھے کہ صدیق کانجو نے وزارت حاصل کرنے کے لیے وزیرِ اعظم محمد خان جونیجو اور وزیرِ اعلیٰ پنجاب نواز شریف سے روابط پیدا کر کے چچا حامد رضا کی ملاقات اُن سے کروائی اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ اگر یوسف رضا کو وزارت سے ہٹا دیا جائے تو حامد رضا گیلانی کی وجہ سے گیلانی گروپ کی حمایت حکومت کو حاصل رہے گی۔ چچا حامد رضا بھی یہی چاہتے تھے کہ صدیق کانجو کو وزیر بنایا جائے لیکن جب پیر صاحب نے چچا حامد رضا کو وزیر بنانے کی حامی بھر لی تو تمام کھیل بگڑ گیا۔ میری چچا کی حمایت کرنے پر صدیق کانجو کے مجھ سے تعلقات خراب ہو گئے۔

کچھ دنوں بعد صدر ضیاءُ الحق نے جونیجو کی حکومت برطرف کر کے اسمبلی تحلیل کر دی جس کی وجہ سے پیر صاحب پگاڑو اپنے وعدے پر عملدرآمد نہ کروا سکے۔

❀ ❀ ❀

باب پنجم

محترمہ بے نظیر بھٹو کا پہلا دورِ حکومت (1988ء۔1990ء)

صدر ضیاءُ الحق نے 1988ء میں جونیجو حکومت برطرف کر کے قومی اسمبلی تحلیل کر دی اور ملک میں غیر جماعتی بنیادوں پر عام انتخابات کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان پر ماضی کی طرح تمام جمہوری قوتیں پریشان ہو گئیں کیونکہ یہ انتخابات 1985ء کی طرز کے دوسرے انتخابات ہوتے۔ اس اعلان کے کچھ عرصے بعد 17 / اگست 1988ء کو صدر ضیاءُ الحق کا C-130 طیارہ بہاولپور سے پرواز کرتے ہی میرے حلقۂ انتخاب لال کمال، لودھراں میں گر کر تباہ ہو گیا اور طیارے میں سوار تمام مسافر بشمول صدر ضیاءُ الحق جان بحق ہو گئے۔ چیئرمین سینٹ غلام اسحاق خان قائم مقام صدر بن گئے۔ عدالتی احکام کے باعث عام انتخابات جماعتی بنیادوں پر کروائے گئے۔ 1987ء میں بے نظیر بھٹو کی شادی آصف علی زرداری کے ساتھ ہوئی۔

مجھے پیپلز پارٹی کی شریک چیئر پرسن بے نظیر بھٹو نے کراچی مدعو کر کے پیپلز پارٹی میں باضابطہ شمولیت کی دعوت دی۔ میں نے شمولیت سے قبل گیلانی گروپ سے ملاقات کی جن میں چچا حامد رضا، چچا فیض مصطفیٰ اور سیّد تنویر الحسن شامل تھے اور انہیں دوبارہ پیپلز پارٹی میں شمولیت کی دعوت دی۔ جسے وہ چھوڑ چکے تھے۔ چچا فیض مصطفیٰ نظریاتی طور پر پیپلز پارٹی کے حامی تھے۔ انہوں نے بھی میری رائے سے اتفاق کیا۔ چچا حامد رضا نے چچا فیض مصطفیٰ کو بریف کر کے پیپلز پارٹی سے مذاکرات کے لیے میرے ہمراہ کراچی بھیج دیا۔ کراچی میں ہماری فاروق لغاری سے ملاقات ہوئی۔ چچا فیض مصطفیٰ نے چچا حامد رضا کی جانب سے دی گئی تجویز پر گفتگو کی۔ پیپلز پارٹی اُن کی

فراہم کردہ فہرست کو مختلف قومی وصوبائی اسمبلی کی نشستوں پر ایڈجسٹ کرنا چاہتی تھی سوائے حلقہ 114 ملتان کے، جس پر میں نے ٹکٹ کے لیے درخواست دی تھی۔ محترمہ نے چچا حامد رضا کے لیے تجویز دی کہ وہ قومی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ نہ لیں کیونکہ انہوں نے پیپلز پارٹی کو مشکل وقت میں چھوڑا تھا، اب بہتر ہے کہ وہ سینیٹر بننا پسند کرلیں۔ چچا نے اس فیصلے کو قبول کرلیا اور خوشی سے کہا کہ میں اس طرح اپنے تمام گروپ کی انتخابی مہم میں حصہ لے سکوں گا۔ معلوم نہیں بعد میں چچا اس معاہدے پر عملدرآمد کیوں نہ کرسکے۔ وہ کسی اور جماعت میں بھی شامل نہ ہوئے اور نہ ہی انتخاب میں حصہ لیا۔ میں نے اُن کے انکار کے بعد پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی۔

میری پیپلز پارٹی میں شمولیت پر محترمہ نے ملتان میں پیپلز پارٹی کی تنظیم کو ہدایت کی کہ وہ میرے لیے استقبالیے کا اہتمام کریں۔ ان ہدایات کی روشنی میں میری کراچی سے ملتان واپسی پر پیپلز پارٹی نے خونی بُرج، ملتان میں میرے لیے بہت بڑا جلسہ کیا جس میں پیپلز پارٹی کی ضلعی و شہری تنظیموں کے علاوہ ملک مختار اعوان، ملک الطاف کھوکھر، عبدالقادر قادری، حبیب اللہ شاکر اور صفدر عباس کھاکھی بھی شریک ہوئے۔ لاڑاڈا پر پیپلز پارٹی تحصیل ملتان کے صدر میاں اجمل مڑل نے میرا بھرپور استقبال کیا۔ ان جلسوں کی پاداش میں حکومتِ وقت نے میرے خلاف 16 ایم پی او کے تحت مقدمات درج کروادیے۔

عام انتخابات کے موقعہ پر محترمہ نے مجھے کراچی مدعو کیا۔ جب میں 70 کلفٹن کے گیٹ پر پہنچا تو وہاں پارٹی ٹکٹ کے خواہش مند افراد کا جمِ غفیر تھا۔ میں نے گیٹ پر مامور گارڈز سے کہا کہ بے نظیر بھٹو کو اطلاع دیں کہ ملتان سے یوسف رضا آئے ہیں۔ صبح سے وہاں آئے ہوئے اور منتظر اُمیدوارانِ ٹکٹ نے میری اس بات کو مضحکہ خیز جانا۔ کچھ دیر کے بعد ایک گارڈ گیٹ پر آیا اور اس نے میرا نام اُونچی آواز میں ایسے پکارا جیسے عدالت کے باہر کسی ملزم کا نام پکارا جاتا ہے اور کہا کہ محترمہ نے آپ کو اندر بلوایا ہے۔ جب میں لاؤنج میں داخل ہوا تو محترمہ چائے پی رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے کہا کہ میں میٹنگ سے پہلے ضلع ملتان کے پارٹی ٹکٹوں کے بارے میں آپ کی رائے لینا چاہتی ہوں۔ میں نے تمام اُمیدواروں کے متعلق تفصیلی گفتگو کی اور اپنی تجویز کردہ فہرست انہیں پیش کردی۔

میری ملاقات کے بعد پیپلز پارٹی کے پارلیمانی بورڈ کا اجلاس شروع ہوگیا۔ ضلع ملتان

کی باری آئی تو اس میں سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے اَراکین کے علاوہ ملک الطاف کھوکھر اور عبدالقادر قادری بھی موجود تھے۔ اجلاس سے قبل میرے اور پیپلز پارٹی ضلع ملتان کے صدر الطاف کھوکھر کے مابین پارٹی ٹکٹوں کے بابت مکمل ہم آہنگی تھی مگر جب میرے حلقۂ انتخاب کی باری آئی تو انہوں نے اپنے وعدے کے برعکس میری بجائے ریاض قریشی کا نام تجویز کیا۔ فیصلہ میرے حق میں ہو گیا مگر الطاف کھوکھر کی وعدہ خلافی کی وجہ سے میں نے انہیں اپنے حلقۂ انتخاب سے صوبائی اسمبلی کی نشست کے لیے ٹکٹ کی بھرپور مخالفت کی اور میں اپنے تجویز کردہ اُمیدوار سابق ایم پی اے ناظم حسین شاہ کو ٹکٹ دلوانے میں کامیاب ہو گیا۔

میرے جہانگیر بدر سے اچھے مراسم ہیں۔ 1988ء کے عام انتخابات میں جہانگیر بدر نے مجھ سے کہا کہ آپ کسی بھی حلقہ سے انتخاب جیت سکتے ہیں مگر مرزا ناصر بیگ کا صرف لودھراں ہی حلقۂ انتخاب ہے۔ میں نے بادلِ ناخواستہ اُن کی یہ بات مان لی۔ بعد ازاں جب میں نے ملتان سے انتخاب میں حصہ لیا تو صدر اسلامی جمہوری اتحاد و وزیرِ اعلیٰ پنجاب نواز شریف میرے مدِ مقابل تھے۔ اس موقعہ پر جہانگیر بدر نے مجھے اپنے تجزیئے سے بتایا کہ آپ انتخاب جیت جائیں گے۔ 1990ء کے عام انتخابات میں جس وقت میرا مقابلہ چچا حامد رضا سے ہو رہا تھا تو ان کا تجزیہ یہی تھا کہ میں جیت جاؤں گا۔ اور میں یہ دونوں انتخاب جیت گیا۔ 1993ء کے عام انتخابات میں نواز حکومت، شاہ محمود کو میرے مدِ مقابل انتخاب لڑانا چاہتی تھی جس پر جہانگیر بدر نے کہا کہ نہ صرف یہ کہ شاہ محمود آپ کے مدِ مقابل انتخاب میں حصہ نہیں لیں گے بلکہ اپنی پارٹی میں بھی نہیں رہیں گے۔ یہی ہوا 1993ء میں شاہ محمود پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔

پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن بیگم نصرت بھٹو انتخابی مہم کے سلسلے میں براستہ بہاولپور ملتان پہنچیں تو لودھراں میں اُن کا بھرپور استقبال ہوا جہاں سے میں 1985ء میں پہلی مرتبہ ایم این اے منتخب ہوا تھا۔ وہاں سے مرزا ناصر بیگ قومی اسمبلی کے اُمیدوار تھے۔ چیئرپرسن جس حلقۂ انتخاب سے گزرتی تھیں اس حلقے کا امیدوار اُن کے ساتھ جیپ میں کھڑے ہو کر عوام سے خطاب کرتا تھا۔ لودھراں میں استقبال کے بعد میں اُن کے ہمراہ ہو گیا۔ میرے حلقۂ انتخاب ملتان میں بڑا شاندار استقبال ہوا۔ شدید گرمی میں دھوپ سے بچنے کے لیے میں نے اپنے اور بیگم نصرت بھٹو کے سر پر چھتری تان رکھی تھی۔ اس حلقے سے صوبائی اسمبلی کے لیے آزاد اُمیدوار شیخ خلیل احمد،

گورنر پنجاب کے چھوٹے بیٹے مسلم لیگ کے اُمیدوار مرید حسین قریشی کا مقابلہ کر رہے تھے۔ شیخ صاحب سے میری دوستی تھی اسی وجہ سے انہوں نے عوام سے کہا کہ یوسف رضا میرے لیے ووٹ مانگ رہے ہیں۔ واضح رہے کہ اُن کا انتخابی نشان چھتری تھا۔ اس انتخاب میں شیخ خلیل احمد کامیاب ہو گئے۔

1988ء کے انتخابات میں مخدوم سجاد حسین، نواب صادق حسین، سیّد فخر امام، جاوید ہاشمی، شاہ محمود، سکندر بوسن اور اَحسن شاہ نے وزیرِ اعلیٰ پنجاب نواز شریف کی میرے مدِّ مقابل بے حد مدد کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ سکندر بوسن اور اَحسن شاہ بھی پیپلز پارٹی کے اسحاق بُچہ اور سیّد ناظم حسین کے مقابلے میں صوبائی اسمبلی کا انتخاب ہار گئے جبکہ شاہ محمود بمشکل صوبائی اسمبلی کی نشست پر کامیاب ہوئے مگر اُن کے بھائی مرید حسین بھی انتخاب ہار گئے۔

یہ انتخابات اس حوالے سے بھی اہم تھے کہ کئی اہم شخصیات نے اپنی سیاسی وابستگیاں تبدیل کیں۔ ملتان کی سیاسی آب و ہوا میں بھی اتار چڑھاؤ آیا۔ میں نے شجاع آباد، ملتان سے تعلق رکھنے والے اپنے دوست فخر الدّین شاہ کو بتایا کہ نواز شریف آپ کو صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ نہیں دیں گے کیونکہ سیّد فخر امام، نواب لیاقت علی کو ٹکٹ دلوانے کے خواہاں ہیں لیکن انہوں نے میری بات کو تسلیم نہ کیا۔ جب پیپلز پارٹی نے میر ثروت کو شجاع آباد سے صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ جاری کر دیا تو مسلم لیگ نے بھی اپنا ٹکٹ نواب لیاقت کو دینے کا اعلان کر دیا۔ فخر الدّین شاہ کو بہت پریشانی ہوئی کیونکہ دونوں بڑی جماعتوں کے ٹکٹ تقسیم ہو چکے تھے مگر اُن کا نام نہیں تھا۔ وہ میرے پاس آئے اور ٹکٹ کا مطالبہ کیا۔ میں نے اور رانا تاج احمد نون نے مل کر میر ثروت کا ٹکٹ فخر الدّین شاہ کے بیٹے جاوید علی شاہ کو دلوا دیا۔ اس طرح پیپلز پارٹی کا پلیٹ فارم استعمال کرتے ہوئے جاوید علی شاہ نے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز کیا اور اپنے مدِّ مقابل نواب لیاقت کو شکست دی۔

عام انتخابات میں کامیابی کے بعد میں نے 'بلاول ہاؤس' کراچی میں بےنظیر بھٹو سے ملاقات کی۔ انہوں نے اسلامی جمہوری اتحاد کے سربراہ/ وزیرِ اعلیٰ نواز شریف کو شکست دینے پر مجھے مبارکباد دی۔ محترمہ بہت مصروف تھیں اور اپنے رفقاء سے حکومت بنانے کے لیے صلاح و مشورہ کر رہی تھیں۔ اس وقت محترمہ کو حکومت تشکیل دینے کے لیے چند ووٹوں کی ضرورت تھی۔ انہوں نے اپنی پارٹی سے دریافت کیا کہ آپ میں سے کوئی ایسا ہے جو تین ارکانِ قومی اسمبلی کو

ہمارے ساتھ شامل کروا سکے؟ سب خاموش رہے۔ یہ خاموشی دیکھ کر میں نے حامی بھر لی۔ میں نے فون پر اپنے دوست سابق وفاقی وزیر سیّد قاسم شاہ ایم این اے سے رابطہ کیا۔ ان کے گروپ میں اُن کے علاوہ اراکینِ قومی اسمبلی فرید جدون اور پرنس صلاح الدین سعید آف ام اسٹیٹ شامل تھے۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ انہیں ایک وفاقی وزارت دی جائے۔ میں نے قاسم شاہ کا فوری بینظیر بھٹو سے رابطہ کروا دیا۔ وہ اُن کا مطالبہ مان گئیں اور اُنہیں کہا کہ آپ آج ہی ہالیڈے ان (موجودہ میریٹ) ہوٹل اسلام آباد میں پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن بیگم نصرت بھٹو سے ملاقات کر کے پیپلز پارٹی میں شمولیت کا اعلان کریں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ وزیرِ اعظم نے وعدے کے مطابق قاسم شاہ کو وزیرِ مملکت برائے ماحولیات بنا دیا اور کچھ عرصہ بعد وزارتِ سیاحت انہیں دے دی گئی۔ میٹنگ کے بعد محترمہ نے متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) کے سربراہ الطاف حسین سے اُن کی رہائش گاہ پر ملاقات کی جس میں مَیں بھی شامل تھا۔ انہوں نے بھی محترمہ کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ اُس وقت آئین کے مطابق صدرِ پاکستان ہی کو اختیار تھا کہ وہ وزیرِ اعظم نامزد کریں۔ صدر اسحاق خان نے بےنظیر بھٹو کو وزارتِ عظمیٰ کے لیے نامزد کر دیا اور وہ اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ اس طرح بےنظیر بھٹو تاریخ میں پہلی مسلمان خاتون وزیرِ اعظم منتخب ہوئیں۔

1988ء میں عام انتخابات کے بعد جہانیاں سے ایم این اے عبدالرحمٰن وہلہ کی وفات ہوگئی۔ اس نشست پر ضمنی انتخاب ہونا تھا۔ ایم پی اے اسلم رندھاوا سے میری دوستی تھی۔ انہوں نے عبدالرحمٰن وہلہ کے بڑے بیٹے فضل داد وہلہ کے لیے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ کی سفارش کی۔ وزیرِ اعظم نے اُنہیں ٹکٹ دیتے وقت مجھے انتخابی مہم کا انچارج مقرر کر دیا۔ دوسری طرف وزیرِ اعلیٰ پنجاب نواز شریف نے جاوید ہاشمی کو مسلم لیگ کا ٹکٹ دے کر صوبائی وزیر شاہ محمود کو اُن کی انتخابی مہم کا انچارج بنا دیا۔ واضح رہے کہ جاوید ہاشمی نے اسی ضمنی انتخاب کے موقعہ پر مسلم لیگ میں باقاعدہ شمولیت اختیار کی تھی۔ وزیرِ اعلیٰ نواز شریف اور ان کی صوبائی حکومت کی طرف سے نصف درجن سے زائد وزراء بشمول چوہدری پرویز الٰہی بھی جاوید ہاشمی کی انتخابی مہم میں حصہ لے رہے تھے۔ مجھے وفاقی حکومت کی طرف سے مکمل اختیار حاصل تھا کہ انتخابی مہم کے سلسلے میں جو بھی رکاوٹیں ہوں، وہ میرے کہنے پر دور کر دی جائیں۔

اُن دنوں میں نے وفاقی محکموں کی طرف سے اس حلقۂ انتخاب میں کافی ترقیاتی کام کروائے جن میں بجلی کی فراہمی، ریلوے لیول کراسنگو، پبلک کال آفس اور جہانیاں کے لیے ڈائریکٹ ڈائلنگ ٹیلی فون ایکسچینج جیسی سہولیات شامل تھیں۔ فضل داد کو اردو پر عبور حاصل نہیں تھا۔ رات کو دیر تک کام کرنے سے وہ تھک جاتے اور اگر رات کو دیر گئے انتخابی مہم میں جانا ہوتا تو میں اُن کی جگہ میاں مصعب حیدر کھگھہ کو ساتھ لے جاتا، لوگ اُسے فضل داد سمجھتے تھے کیونکہ دونوں کی شکلوں میں مشابہت تھی۔ انتخاب کے دوران جاوید ہاشمی، فضل داد کے پاسپورٹ کی فوٹو کاپی لے آئے جس پر اُن کا نام ایف ڈی واہلہ لکھا ہوا تھا۔ مخالفین نے اس کی تشریح یہ کی کہ یہ نام فریڈرک ڈیوڈ واہلہ ہے۔

اس ضمنی انتخاب کے دوران چک اعظم ہانس کے عوام نے ایک بینر لگا رکھا تھا کہ 'بجلی دو، ووٹ لو'۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ اگر آپ کا مطالبہ منظور نہ ہوا تو آپ کیا کریں گے؟ انہوں نے کہا کہ جس طرح گزشتہ انتخاب کے دوران جب جاوید ہاشمی اور شاہ محمود نے ہمارا بجلی کا مطالبہ پورا نہیں کیا تھا تو ہم نے انتخاب کا بائیکاٹ کر دیا تھا، اس مرتبہ بھی بائیکاٹ کر دیں گے۔ میں نے کوشش کر کے انتخاب سے قبل بجلی فراہم کروا دی، اس طرح وہاں کے عوام نے ہمیں نہ صرف ووٹ دیے بلکہ ہماری بھرپور مدد بھی کی۔ میں نے انتخاب کے دوران اعلان کر دیا کہ اگر فضل داد انتخاب ہار گئے تو میں قومی اسمبلی کی نشست سے مستعفی ہو جاؤں گا۔

ایک قابلِ ذکر واقعہ اُس وقت پیش آیا جب میں فضل داد کی حمایت کے لیے سابق ایم پی اے شیخ خلیل سے ملنے اُن کے گھر گیا تو انہوں نے ہمیں بہت دیر تک بٹھائے رکھا اور ہماری خاطر تواضع کی مگر وہ خود ہمیں مطلع کیے بغیر جاوید ہاشمی اور شاہ محمود کے ہمراہ ان کی انتخابی مہم میں چلے گئے اور ہم اُن کے انتظار میں اُن کے گھر بیٹھے رہے۔ ہمیں کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ وہ گھر پر موجود نہیں ہیں۔ ہم خاصے دلبرداشتہ ہوئے اور ساتھ ہی اُن کی اس ناشائستہ حرکت پر غصہ بھی آیا کہ اُن کو چاہیے تھا کہ وہ ہمیں صاف جواب دے دیتے مگر وہ جس طریقے سے گھر سے گئے اس کا ہم سب نے بُرا منایا۔ میں اپنی جیپ میں سوار سوچ رہا تھا کہ اس حلقۂ انتخاب میں تین طاقتور دھڑے جاوید ہاشمی، شاہ محمود اور شیخ خلیل ہیں جنہوں نے آپس میں انتخابی اتحاد کر لیا ہے اور عملاً وہ انتخاب جیت چکے ہیں۔ مجھے اسلم خان بوسن نے جیپ میں بیٹھتے ہی کہا کہ گیلانی صاحب! ہم یہ

تسلیم کیوں نہیں کر لیتے کہ ہم انتخاب ہار چکے ہیں؟ اس پر میں نے اُن سے کہا کہ ہم مقابلہ کریں گے اور میدان چھوڑ کر نہیں بھاگیں گے۔ ضرب المثل ہے کہ:

"A man is not finished if he is defeated, He is finished if he quits."

ترجمہ: کوئی شخص شکست کھانے سے ختم نہیں ہوتا بلکہ میدان چھوڑنے سے ہوتا ہے۔

آخر کار سخت مقابلے کے بعد پیپلز پارٹی کے نامزد اُمیدوار فضل داد کامیاب ہو گئے۔

اسمبلی ہال میں سپیکر قومی اسمبلی کے انتخاب کے دوران میں ووٹ دے کر اپنی نشست کی طرف جا رہا تھا کہ وزیرِ اعظم بے نظیر بھٹو سے میری ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں اپنی کابینہ تشکیل دے رہی ہوں جس میں آپ کا نام شامل نہیں ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ میں پہلے مرحلے میں ملک مختار احمد اعوان کو چھوٹا وزیر (وزیرِ مملکت) بنا رہی ہوں اور بعد میں آپ کو بڑا وزیر (وفاقی وزیر) بناؤں گی۔ میں خاموش ہو گیا مگر چند دنوں بعد کابینہ کا اعلان ہوا تو مختار اعوان وفاقی وزیرِ محنت و افرادی قوت بنا دیئے گئے۔ میرے خیال میں وزیرِ اعظم پر اُنہیں وفاقی وزیر بنانے کے لیے سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی اور چیئر پرسن بیگم نصرت بھٹو کا دباؤ تھا۔ مجھے وزیر نہ بنایا گیا بلکہ ملک سے باہر ایک وفد میں بھیج دیا گیا۔ اس وفد میں میرے علاوہ چیئرمین سی ڈی اے مظہر رفیع بھی شامل تھے۔ یہ وفد اُردن کے دارالخلافہ عمان اور اسلام آباد کو جڑواں شہر قرار دینے کی تقریب میں شرکت کے لیے گیا تھا۔ ہم نے اُردن کا دورہ کیا، معاہدے پر دستخط ہوئے اور خصوصی طور پر حضرت یحییٰ علیہ السلام کے مزار پر حاضری دی۔ ہمیں دیگر چند اہم مقامات بھی دکھائے گئے۔ ہمیں وادیٔ عمان میں ایک زرعی فارم بھی دکھایا گیا، جسے سندھی باشندوں نے ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ اقتدار میں آباد کیا تھا۔

میں اس دورے میں پاکستانی سفیر جنرل صغیر کی رہائش گاہ پر قیام پذیر تھا۔ وہاں دوسرے روز یومِ آزادی کے سلسلے میں ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ میں بطور مہمانِ خصوصی اُس تقریب میں شریک ہوا اور پرچم کشائی کی رسم ادا کی۔ اُردن میں قیام کے دوران میرا جی چاہا کہ دمشق میں حضرت بی بی زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے روضۂ مبارک پر حاضری کی سعادت حاصل کروں۔ جنرل صغیر نے دمشق میں تعینات پاکستانی سفیر کے ساتھ رابطہ کر کے میرے لیے انتظامات کروا دیے اور بذریعہ کار خود شام (Syria) کی سرحد تک چھوڑنے آئے۔ وہاں پاکستانی

سفیر نے میرا استقبال کیا اور بی بی زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے روضۂ مبارک پر حاضری دلوائی۔ ہمیں وہاں ایک تاریخی مسجد اُمویہ بھی لے جایا گیا۔ جب میں رات کو واپس عمان آیا تو جنرل صغیر اور اُن کی اہلیہ نے مبارکباد دی اور کہا کہ آج وفاقی کابینہ نے حلف اُٹھایا ہے جس میں آپ کا نام بھی شامل ہے۔

میں دوسرے روز اپنے ایک دوست ملک وقار سے ملنے چلا گیا جو بی سی سی آئی بینک، عمان میں کام کرتے تھے۔ ملک وقار کا تعلق ملتان سے ہے۔ اُن کے دفتر سے معلوم ہوا کہ مجھے وزارتِ سیاحت دی گئی ہے۔ میرے لیے اس خبر میں کوئی خوشی نہ تھی کیونکہ میں اس سے بہتر وزارتوں پر رہ چکا تھا۔ میں حسبِ پروگرام عمرہ کی ادائیگی کے لیے چلا گیا۔ دو ہفتوں بعد پاکستان واپس آیا تو مجھے دوستوں نے قائل کیا کہ آپ کو دلبرداشتہ نہیں ہونا چاہیے اور کابینہ کے اندر رہ کر اپنی اہلیت کی بنیاد پر مقام پیدا کرنا چاہیے۔ اتفاق ہے کہ پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن بیگم نصرت بھٹو اور میں نے وزارت کا اکٹھے حلف اُٹھایا۔

کچھ عرصے بعد نوید ملک کو میری وزارتِ سیاحت کا مشیر مقرر کر دیا گیا۔ انہیں مشیر بنانے سے پہلے مجھے اعتماد میں نہیں لیا گیا۔ میں نے سوچا کہ میں اسلام آباد جا کر وزیرِ اعظم سے اس بات کا گلہ کروں۔ چند دنوں بعد قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کیا گیا اور میری ملاقات اسمبلی ہال میں وزیرِ اعظم سے ہو گئی۔ اس سے پیشتر کہ میں ان سے گلہ کرتا، انہوں نے کہا کہ ہم آصف زرداری کے دوست سابق جنرل منیجر انٹر کانٹیننٹل، کراچی نوید ملک کو وزارتِ سیاحت کا مشیر بنانا چاہتے تھے مگر اسٹیبلشمنٹ ڈویژن نے غلطی سے لاہور والے نوید ملک کا نوٹیفکیشن جاری کر دیا ہے، اب آپ اُن سے استعفیٰ طلب کریں۔ میں نے نوید ملک سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ میں اَز خود دو تین دن میں مستعفی ہو جاؤں گا۔ میں نے اس کی اطلاع محترمہ کو بھی دے دی۔

دوسرے روز کالم نگار منو بھائی نے اخبار کے اپنے کالم میں اس تعیناتی کا پول کھول دیا جس سے نوید ملک خاصے رنجیدہ ہوئے۔ انہوں نے استعفیٰ تو دے دیا مگر ساتھ ہی پریس کانفرنس کر کے یہ بیان داغ دیا کہ آصف زرداری پاکستان ٹورازم ڈیویلپمنٹ کارپوریشن کے ہوٹل اونے پونے بیچنا چاہتے تھے مگر میری مداخلت کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکے۔ 1997ء میں جب نواز شریف کے خلاف گرینڈ ڈیموکریٹک الائنس بنا تو نوید ملک اس میں پیش پیش تھے۔ جب اس اتحاد کی

طرف سے ملتان میں ریلی نکالی گئی اور جی ڈی اے کے اکابرین کا ملتان ائرپورٹ پر استقبال کیا گیا تو میں بھی استقبال کرنے والوں میں شامل تھا۔

ع بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

وزیرِ مملکت برائے ماحولیات سیّد قاسم شاہ نے مجھے، وزیرِ مواصلات مخدوم امین فہیم اور ایم این اے پرنس صلاح الدین سعید کے ہمراہ شوگران، کاغان میں مدعو کیا۔ وادیٔ کاغان و ناران اور جھیل سیف الملوک جیسے قدرتی حسن سے مالا مال علاقے اُن کے حلقۂ انتخاب میں شامل تھے۔ میں نے کئی ملکی و غیر ملکی دورے کیے ہیں مگر جو قدرتی حسن ان وادیوں میں نظر آیا اُس کی مثال نہیں ملتی۔ ہمیں اپنے تین روزہ قیام کے دوران ان قدرتی مناظر کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ سیر کرواتے ہوئے پُرخطر پہاڑی راستوں میں قاسم شاہ نے پُراعتماد ڈرائیونگ کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے وہاں مشہور گلوکار مہدی حسن کو بھی مدعو کر رکھا تھا جن کا بلندی کے سفر کے باعث بلڈ پریشر بڑھ گیا۔ دوسرے دِن جب اُن کی طبیعت بحال ہوئی تو ہم اُن کے فن سے محظوظ ہوئے۔ ہم نے ان علاقوں کے مسائل کا بھی جائزہ لیا۔

میں نے وزارتِ سیاحت میں انقلابی تبدیلیاں کیں۔ نئی ٹورازم پالیسی کا اجراء کیا۔ سیاحت کو صنعت کا درجہ دلوایا۔ کئی شہروں کو سیاحت کے حوالہ سے ٹیکس فری زون قرار دیا جس میں ملتان بھی شامل تھا۔ سیاحت کو فروغ دینے اور سیاحوں کی سہولت کو مدِّنظر رکھ کر اکثر مقامات پر ٹورسٹ انفارمیشن سنٹر بنائے گئے۔ اس شعبہ میں زرِمبادلہ کے حصول کو ترقی دینے کے لیے دیگر ممالک کے ساتھ ساتھ ہمسایہ ملک بھارت سے بھی نرم پالیسی اختیار کی۔ اوپن سکائی پالیسی (Open Sky Policy) اپنائی گئی۔ مالم جبہ، سوات کے مقام پر سکائنگ ریزورٹ (Skiing Resort) کا افتتاح کیا گیا۔ پاکستان ایسوسی ایشن آف ٹریول ایجنٹس کے تحت دہلی، بھارت میں ایک کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ میں نے بطورِ وزیرِ سیاحت جزیرہ بالی، انڈونیشیا کا دورہ بھی کیا۔ اسی دوران ورلڈ ٹورازم آرگنائزیشن کے تحت انٹرنیشنل ٹورازم کنونشن کا انعقاد پیرس، فرانس میں ہوا جس میں مجھے ورلڈ ٹورازم آرگنائزیشن کا ایشیا ریجن کے لیے بلا مقابلہ وائس چیئرمین منتخب کیا گیا۔

میں نے اپنے دور میں ملتان سے حج فلائٹس کے علاوہ بھوجا ائرلائنز اور ایرو ایشیا کی

فلائٹس کا اجراء کروایا۔ سیاحت کوفروغ دینے کے لیے آزادی اور سیکیورٹی کو یقینی بنایا جائے تو نہ صرف اندورنِ ملک سے سیاحوں کوترغیب ملے گی بلکہ بیرونِ ملک سے بھی سیاحوں کی آمد میں اضافہ ہوگا اور زرِمبادلہ کے ذخائر میں خاطرخواہ اضافہ بھی ہوگا۔ ہندوستان میں راجوں اور مہاراجوں کے اکثرمحل فائیوسٹار ہوٹلوں میں تبدیل کردیے گئے ہیں۔ یہ پالیسی ہمیں بھی اپنا کر سیاحت کوفروغ دینا چاہیے۔

میں نے لاہور میں انٹرنیشنل ٹورازم کنونشن کا انعقاد بھی کیا۔ یہ کنونشن مال روڈ پر الحمراء ہال میں ہوا۔ اس کی افتتاحی تقریب میں وزیرِ اعلیٰ پنجاب نواز شریف اوراختتامی تقریب میں وزیرِ اعظم بےنظیر بھٹومہمانِ خصوصی تھیں۔ دونوں رہنماؤں نے عمدہ تقاریر کیں۔ لاہور میں جشن کا سماں تھا، میں نے دونوں رہنماؤں کوالحمراء میں لگائے گئے سٹالوں کا معائنہ کروایا جس میں پاکستانی مصنوعات کی نمائش لگائی گئی تھی۔ اس موقعہ پرملکی وغیرملکی طائفوں نے بھی اپنےفن کا مظاہرہ کیا۔ شاہی قلعہ، لاہور میں پہلی مرتبہ لال قلعہ، ہندوستان کی طرز پر لائیٹ اینڈ ساوَنڈ شو کا مظاہرہ کیا گیا۔ وزیرِ اعظم نے مجھ سے دریافت کیا کہ آپ تو نوازشریف کے سیاسی حریف تھے۔ آپ نے ایک دوسرے کا مقابلہ بھی کیااوراَب یہ سب کیسے ممکن بنایا کہ ایک ہی تقریب میں ہم دونوں کو مدعو کرلیا؟ وہ بہت خوش ہوئیں کہ ان کے پاس ایک ایساوزیرموجود ہے جودونوں سیاسی جماعتوں سے بات کرسکتا ہے۔

وزیرِ اعظم نے وفاقی وصوبائی حکومتوں کے تعلقات بہتر بنانے کے سلسلے میں تجویز دی کہ مَیں اور ملک محمد قاسم صدر مسلم لیگ (قاسم گروپ) جو بعد میں قائدِ ایوان سینٹ منتخب ہوئے، دونوں اکٹھے وزیرِ اعلیٰ نوازشریف سے ملاقات کر کے اُنہیں قائل کریں کہ ملک کے حالات بہت کشیدہ ہیں جن کو بہتر بنانے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ اُنہوں نے مزید کہا کہ پیٹی مَن والا آپ سے ملاقات کر کے مزید معلومات فراہم کریں گے،اُن کا تعلق امریکہ سے ہے اور وہ پہلے ہی وزیرِ اعلیٰ سے مل چکے ہیں۔ میں نے ملک قاسم سے ملنے کے بعد نوازشریف سے فون پر رابطہ کیااور ملاقات کے لیے وقت مقرر کرلیا۔ اس خبر کو پریس نے بڑی اہمیت دی کیونکہ عوام اس ملاقات کے نتیجے کے منتظر تھے۔

میں اور ملک قاسم حسبِ پروگرام لاہور پہنچ گئے۔ لاہور ائر پورٹ کے وِی آئی پی لاوَنج

میں میاں صاحب کے نمائندے نے مجھ سے علیحدگی میں ملاقات کی اور اُن کا پیغام پہنچایا کہ کل صبح آپ ناشتے پر اُن کی رہائش گاہ ماڈل ٹاؤن اکیلے تشریف لائیں۔ میں ملک قاسم کے ہمراہ ان کی رہائش گاہ ''سکاچ کارنر'' گیا۔ میں نے بڑی ہمت کر کے ملک قاسم کو اعتماد میں لیا اور نواز شریف کے پیغام سے مطلع کیا جسے سن کر وہ پریشان ہو گئے۔ وزیرِ اعظم اُس وقت پشاور کے دورے پر گئی ہوئی تھیں اور وزیرِ اعلیٰ سرحد آفتاب احمد خان شیر پاؤ کے ساتھ میٹنگ میں مصروف تھیں۔ میں نے اُن سے فون پر بات کی اور مکمل تفصیل بیان کی۔ وزیرِ اعظم نے مجھ سے کہا:

" I trust you. You can meet him alone."

ترجمہ: مجھے آپ پر اعتماد ہے۔ آپ اُن سے اکیلے مل سکتے ہیں۔

انہوں نے ملک قاسم سے بات کر کے اُنہیں بھی اعتماد میں لیا اور کہا کہ آپ گیلانی صاحب کو اکیلے جانے دیں۔

دوسرے روز جب میں میاں صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچا تو وہاں دونوں بھائی نواز شریف اور شہباز شریف موجود تھے۔ نواز شریف نے گفتگو کا آغاز یوں کیا کہ آپ ہمارے پرانے دوستوں میں سے ہیں۔ میں آپ کے خلاف 1988ء کا انتخاب نہیں لڑنا چاہتا تھا مگر مجھے گورنر پنجاب نے مجبور کیا تھا۔ انہوں نے مزید کہا کہ اگر آپ وزیرِ اعظم کے اُمیدوار بن جائیں تو پنجاب کے اراکینِ قومی اسمبلی کی خاصی تعداد آپ کا ساتھ دے گی۔ میں نے کہا کہ اس وقت ملکی حالات نہایت ہی خطرناک صورت اختیار کر چکے ہیں اور میری خواہش ہے کہ آپ وزیرِ اعلیٰ رہیں اور محترمہ وزیرِ اعظم، میں کسی عہدے کا خواہش مند نہیں ہوں۔ میاں صاحب کہنے لگے کہ مجھے وزیرِ اعظم پر اعتماد نہیں ہے، اگر میں آپ کی بات سے اتفاق کر بھی لوں تو اس بات کی ضمانت کون دے گا کہ مستقبل میں میرے ساتھ اُن کا رویہ مثبت ہوگا۔ اس ملاقات سے قبل وزیرِ اعظم نے مجھ سے کہا تھا کہ وفاق اور پنجاب کے مابین مصالحت کی صورت میں صدر اسحاق خان ضامن نہیں ہونے چاہئیں۔ میں نے میاں صاحب سے کہا کہ آپ خود ہی ضامن کا نام تجویز کریں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میرے ضامن آپ ہیں، وزیرِ اعظم کی طرف سے وعدہ خلافی کی صورت میں آپ میرا ساتھ دیں گے اور اُنہیں چھوڑ دیں گے۔ میں نے میاں صاحب کی اس تجویز سے اتفاق کر لیا۔

میں نے وزیرِ اعظم کو فوری طور پر اعتماد میں لیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ مجھے میاں صاحب اپنا ضامن مان لیں گے۔ وہ فوراً متفق ہو گئیں۔ میں نے میاں صاحب کو مطلع کر دیا اور اس طرح دونوں فریق راضی ہو گئے۔ ہم نے ملاقات کے دوران آپس میں یہ بھی طے کیا کہ ایک مشترکہ کمیٹی تشکیل دی جائے جس میں وفاقی حکومت کی طرف سے میں اور ملک قاسم جبکہ صوبائی حکومت کی طرف سے سابق وفاقی وزیرِ مواصلات' ایم این اے ملک نعیم اعوان، ایم این اے میاں غلام حیدر وائیں اور سپیکر پنجاب اسمبلی میاں منظور احمد وٹو شامل ہوں گے۔ میرے اور میاں صاحب کے مابین بنیادی معاملات طے پا چکے تھے جس کا کمیٹی کے اراکین کو علم نہ تھا۔ مجوزہ کمیٹی نے کئی میٹنگز کیں جن میں ایک دوسرے کے خلاف بیان نہ دینے کا معاہدہ، ایک دوسرے کے احترام کا معاہدہ، پیپلز ورکس پروگرام میں صوبوں کا کوٹہ اور صوبائی حکومت میں نئی تقرریوں کے لیے وفاق کے کوٹے سے متعلقہ معاملات طے کیے گئے۔

میرے نجی دورۂ جاپان کے موقعہ پر میرا تعارف مالک عبداللہ سے ہوا۔ وہ اُن دنوں جاپان میں پاکستانی سفارت خانے میں فرسٹ سیکرٹری تعینات تھے۔ میں جب 1988ء میں وفاقی وزیرِ سیاحت بنا تو میں نے وزیرِ اعظم سے خصوصی اجازت لی تھی کہ انہیں اپنا پرائیویٹ سیکرٹری رکھ سکوں۔ مالک عبداللہ نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں انہیں ایک جاپانی لڑکی سے شادی کے لیے حکومت سے اجازت دلوادوں کیونکہ فارن سروس رولز کے مطابق کوئی افسر کسی غیر ملکی سے شادی نہیں کر سکتا۔ وزیرِ اعظم نے پہلی مرتبہ اس قسم کی اجازت دی۔ جب مالک عبداللہ کو شادی کی اجازت مل گئی تو کئی سینئر افسران جنہوں نے غیر ملکی خواتین کے ساتھ دَر پردہ شادیاں کر رکھی تھیں وہ منظرِ عام پر آ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے کئی پردہ نشینوں کے نام ظاہر ہو گئے۔

1989ء میں وزیرِ اعظم نے امریکہ کا دورہ کیا، اس وقت امریکہ کے صدر جارج بش سینئر تھے۔ وزیرِ اعظم کا دورہ، پاکستان اور امریکہ کے تعلقات کو بڑھانے میں بہت مددگار ثابت ہوا۔ انہی دنوں ایرانی انقلاب کے بانی، آیت اللہ امام خمینیؒ کا انتقال ہو گیا۔ اُن کی نمازِ جنازہ میں وفاقی حکومت کی طرف سے میں نے نمائندگی کی۔ صدر غلام اسحاق خان اور میں خصوصی طیارے پر ایران روانہ ہوئے۔ اس وفد میں چوہدری شجاعت حسین، صبغت اللہ مجددی، قاضی حسین احمد سمیت کئی اور قائدین بھی شامل تھے۔ ایرانی وزیرِ اعظم نے تہران ائرپورٹ پر ہمارا استقبال کیا اور

ہمیں ائر پورٹ سے آزادی ہوٹل تک بذریعہ بس لے جایا گیا۔ ہوٹل سے جنازے میں شرکت کے لیے ہمیں ہیلی کاپٹر کے ذریعے پہنچایا گیا۔ میں نے اپنی زندگی میں اس سے پہلے کسی جنازے میں لاکھوں کی تعداد میں عورتوں اور مردوں کو شامل نہیں دیکھا تھا۔

میں نے 1989ء میں پاکستان ایسوسی ایشن آف ٹریول ایجنٹس (PATA) کی طرف سے ہندوستان کا دورہ کیا۔ وفد میں میری اہلیہ کے علاوہ ایم این اے فضل داد، پرائیویٹ سیکرٹری خضر حیات اور اُن کی اہلیہ شامل تھے۔ جب مجھے پاٹا کی طرف سے ہندوستان کے دورے سے متعلق ترجیحات کا تعین کرنا تھا تو فضل داد نے اصرار کیا کہ اپنے پروگرام میں شملہ کو ضرور شامل کریں۔ میں نے اپنے پروگرام میں شملہ کو بھی شامل کرلیا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اُن کی نانی کا گھر شملہ میں تھا جب ہم نے ہندوستان میں شملہ کا دورہ کیا تو فضل داد نے اپنی نانی کا گھر ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہے۔

ہندوستان میں مسٹر شیوراج پاٹیل ٹورازم اور سول ایوی ایشن کے وفاقی وزیر تھے۔ انہوں نے اپنی وزارت کی طرف سے ہمیں ہیلی کاپٹر فراہم کر رکھا تھا، اسی لیے ہمیں فتح پور سیکری، جے پور، اجمیر شریف، شملہ اور چیل کا دورے کرنے میں بڑی آسانی رہی۔ اُس دورے کے دوران میری ملاقات ذوالفقار علی بھٹو کے دیرینہ دوست موہن داس اوبرائے سے دہلی میں اُن کے فارم ہاؤس پر ہوئی۔ اُس وقت ان کی عمر پچانوے برس تھی۔ سیسل ہوٹل مری، فلیشمین ہوٹل راولپنڈی، فلیٹیز ہوٹل لاہور اور ڈینز ہوٹل پشاور تقسیمِ ہندوپاک سے قبل اُنہی کی مینجمنٹ میں کام کر رہے تھے۔ موہن داس اوبرائے نے کہا کہ مجھے ان ہوٹلوں کی مینجمنٹ دے دیں، میں انہیں کامیابی سے چلا کر دکھاؤں گا کیونکہ آپ انہیں نہیں چلا سکیں گے۔ انہوں نے کہا کہ میں یہیں سے بیٹھ کر اوبرائے ہوٹل مدینہ منورہ چلا رہا ہوں کیونکہ مدینہ میں غیر مسلموں کے جانے پر پابندی ہے۔ اُن دنوں پوری دنیا میں مختلف مقامات پر کئی فائیو سٹار ہوٹل اُن کی ملکیت تھے۔ انہوں نے ممبئی میں میری ملاقات اپنے صاحبزادے وِکی اوبرائے سے کروائی اور ہمارا وفد انہی کے ہوٹل اوبرائے ممبئی میں بطورِ مہمان قیام پذیر ہوا۔ موہن داس اوبرائے بے تکلفی سے ذوالفقار علی بھٹو کو ذُلفی کہہ کر پکارتے تھے۔ انہوں نے وزیرِ اعظم کے لیے بھی نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

1989ء میں ہندوستان کے وزیرِ اعظم راجیو گاندھی نے پاکستان کا دورہ کیا۔ یہ دورہ

بڑی اہمیت کا حامل تھا۔اس دورے میں کئی معاہدوں پر دستخط کیے گئے جس میں ایک معاہدہ ایک دوسرے کی ایٹمی تنصیبات پرحملہ نہ کیے جانے کا تھا۔سیاحت سے متعلق بھی معاہدہ ہوا۔

صدر غلام اسحاق خان نے راجیو گاندھی کے اعزاز میں ایوانِ صدر میں عشائیہ دیا۔ عشائیے کے دوران وزیر اعظم نے مجھے چٹ بھجوائی کہ راجیو گاندھی میڈم نور جہاں سے فیض احمد فیض کی ایک نظم 'مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ' سننا چاہتے ہیں۔میڈم نور جہاں اور میں ایک ہی میز پر بیٹھے تھے۔جب میں نے اُن سے گانے کی فرمائش کی تو وہ مجھ سے خفا ہو گئیں کہ آپ نے مجھے گانے کا پہلے کیوں نہیں بتایا؟ ساز کے بغیر گانا کتنا مشکل ہے۔بالآخر میں نے انہیں رضامند کرلیا اور انہوں نے وہ نظم سنائی جسے راجیو گاندھی نے محو ہو کر سنا۔

ایوانِ صدر میں عشائیے کے موقعہ پر ایک مزاحیہ پروگرام بھی ترتیب دیا گیا۔راجیو گاندھی سے اسی پروگرام میں دریافت کیا گیا کہ پاکستان اور ہندوستان میں کون سی قدر مشترک ہے۔اس پرانہوں نے برجستہ جواب دیا:

"The only thing common between India and Pakistan is that after 9pm only the PM is on the television."

ترجمہ: پاکستان اور بھارت میں صرف ایک قدر مشترک ہے کہ رات نو بجے کے بعد صرف پرائم منسٹر ہی ٹیلی ویژن پر ہوتا ہے۔

کسی نے دریافت کیا کہ ہندوستانی پریس اتنا پاکستان مخالف کیوں ہے؟اس پر راجیو گاندھی نے کہا:

"The Indian Press is more hostile towards me than towards Pakistan."

ترجمہ: بھارتی پریس پاکستان سے زیادہ میرا مخالف ہے۔

1989ء میں وزیر اعظم نے مجھے اور میری اہلیہ کو وزیرِ اعظم چین مسٹر لی پنگ اور اُن کی اہلیہ کے دورۂ پاکستان کے دوران وزیرِ مہمانداری مقرر کیا۔وزیر اعظم کے والد Li Shouxun جو ادیب تھے،کو 1930ء میں قتل کر دیا گیا تھا۔چائنیز کیمونسٹ پارٹی کے رہنما چواین لائی نے گیارہ سال کی عمر میں لی پنگ کی تعلیم وتربیت اور پرورش کی ذمہ داری لی۔جب 1949ء میں کیمونسٹوں

نے چین کا کنٹرول سنبھالا تو چواین لائی پہلے وزیرِ اعظم بنے۔ لی پنگ خود بھی نہایت خوش مزاج، صاحبِ علم اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ میں لی پنگ کے تمام پروگراموں میں اُن کے ہمراہ رہا۔ اُن کا قیام 'سٹیٹ گیسٹ ہاؤس' راولپنڈی میں تھا جبکہ اُن کی اکثر ملاقاتیں اسلام آباد میں ہوا کرتی تھیں۔ میں اسلام آباد اور راولپنڈی کے سفر کے دوران ایک موضوع چھیڑ دیتا تو وہ کھل کر اپنا مؤقف بیان کرتے تھے۔ میں کبھی اُن کی پارٹی کی تنظیم، بلدیاتی نظام، تعلیم اور کبھی صحت پر گفتگو کرتا۔ ہمارے درمیان ایک خاتون مترجم کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ میں نے اپنے شوقِ دست شناسی کے تحت اُن کا ہاتھ بھی دیکھا۔ جب وہ دوسری مرتبہ وزیرِ اعظم چین منتخب ہوئے تو اس دوران میں سپیکر قومی اسمبلی منتخب ہو چکا تھا۔

1989ء میں وزیرِ اعظم بے نظیر بھٹو نے مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ آزاد کشمیر میں جلسۂ عام کرنا چاہتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ کے وزیرِ اعظم آزاد کشمیر سردار عبدالقیوم خان سے اچھے مراسم ہیں، آپ اس جلسے کے لیے ان سے مشورہ کریں۔ میں نے وزیرِ اعظم کی خواہش کے مطابق سردار عبدالقیوم خان سے ملاقات کر کے مظفر آباد میں جلسۂ عام کا اہتمام کروایا۔ سردار صاحب نے نہ صرف خود وزیرِ اعظم پاکستان کا پُر جوش استقبال کیا بلکہ جلسے کی ابتداء میں تلاوتِ قرآنِ پاک بھی کی۔ غالباً یہ پہلا موقعہ تھا جب پاکستان پیپلز پارٹی اور مسلم کانفرنس آزاد کشمیر کا مشترکہ جلسہ ہوا جس سے وزیرِ اعظم نے خطاب کیا۔ یہ جلسہ بہت کامیاب رہا۔ اس موقعہ پر وزیرِ اعظم نے مقبوضہ کشمیر کے گورنر سکسینہ کو بھی للکارا۔

1990ء میں سردار عبدالقیوم خان سے میری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھ سے شکایت کی کہ اُمورِ کشمیر و شمالی علاقہ جات کے لیے وفاقی وزیر میر باز کھیتر ان میرا احترام نہیں کرتے، وہ مجھے آئے دن مظفر آباد سے اسلام آباد طلب کر لیتے ہیں، مجھے اُن کے اس رویّے پر سخت اعتراض ہے۔ میں نے اُن سے وعدہ کیا کہ میں آپ کے جذبات وزیرِ اعظم تک پہنچاؤں گا۔ جب میں نے اُن کے جذبات وزیرِ اعظم تک پہنچائے تو انہوں نے میری بات بڑے غور سے سنی اور کہا کہ آپ اُن سے ملاقات کریں اور میری طرف سے کہیں کہ میں اُن کی بہت قدر کرتی ہوں، وہ ہمیں بتائیں کہ اس محکمے کا وزیر کس کو ہونا چاہیے؟ میں نے حسبِ خواہش بے نظیر بھٹو، سردار عبدالقیوم خان سے ملاقات کی اور اُن کا پیغام پہنچایا۔ انہوں نے کہا کہ آپ کوئی بھی وزیر بنائیں مگر کم از کم

اُس کے بال سفید ہونے چاہئیں تا کہ وہ بزرگوں کی قدر کر سکے۔ میں نے اُن سے کہا کہ وزیرِ اعظم آپ ہی سے نام لینا چاہتی ہیں۔ انہوں نے محمد حنیف خان کا نام تجویز کیا جو اُن دنوں وفاقی وزیر ہاؤسنگ و تعمیرات تھے۔ میں نے اُن کے خیالات مَن و عَن وزیرِ اعظم تک پہنچا دیے۔ انہوں نے میر باز کھیتران کی جگہ حنیف خان کو وفاقی وزیر اُمورِ کشمیر و شمالی علاقہ جات مقرر کر دیا۔ مجھ پر بہت عرصے بعد یہ منکشف ہوا کہ یہ تبدیلی وزیرِ اعظم سردار عبدالقیوم خان کے لیے خوشگوار ثابت نہ ہو سکی۔

ہاؤسنگ و تعمیرات کا محکمہ مجھے جبکہ سیاحت کا محکمہ سیّد قاسم شاہ کو دے دیا گیا۔ مجھے اپنے دوست میر باز کھیتران کا افسوس ہوا کہ اس سارے معاملے میں اُن کا بہت نقصان ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بے نظیر بھٹو کے بارے میں یہ سوچ رکھتے ہوں کہ انہوں نے اُن سے اہم وزارت لے کر صرف وزارتِ ماحولیات دے دی۔ آج میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے کہ میں اس بات کی وضاحت کر رہا ہوں۔ چند دن پہلے میر باز کھیتران سنٹرل جیل اڈیالہ، راولپنڈی میں پابند سلاسل ہوئے تو اُن کی مجھ سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے مجھے کہا کہ ان تمام معاملات کا مجھے علم تھا مگر میں خاموش تھا اور ازراہِ مذاق کہا کہ آئندہ میں بھی آپ کے اقتدار میں روڑے اٹکاؤں گا۔

میں ایم پی اے اسلم رندھاوا کی حادثاتی موت کی وجہ سے جہانیاں میں صوبائی اسمبلی کی نشست پر ہونے والے ضمنی انتخاب میں سابق ایم پی اے ملک ارشد حسین مبتلا کے مدمقابل خالد اقبال رندھاوا کی انتخابی مہم میں مصروف تھا کہ مجھے وزیرِ اعظم نے فون کر کے فوراً اسلام آباد آنے کو کہا اور ساتھ ہی اپنا خصوصی طیارہ مجھے لانے کے لیے ملتان ائرپورٹ پر بھجوایا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اُن کے خلاف عدمِ اعتماد کی تحریک پیش کر دی گئی ہے۔

اسلام آباد پہنچنے پر مجھے 'وزیرِ اعظم ہاؤس' کے گیسٹ ہاؤس میں قیام کے لیے جگہ دی گئی۔ میں نے وزیرِ اعظم کو مشورہ دیا کہ اراکینِ قومی اسمبلی کو خفیہ مقام پر منتقل کیا جائے۔ وزیرِ اعظم نے اتفاق کرتے ہوئے اراکین کو سوات بھجوا دیا۔ مجھے ہدف دیا کہ میں چند اراکین سے رابطہ کروں۔ نواز شریف اپنے اراکین کو مری لے جا چکے تھے اور انہیں وفاقی حکومت سے رابطے کی اجازت نہ تھی۔ میں نے اراکینِ قومی اسمبلی قاسم شاہ، غلام محمد مانیکا، رئیس شبیر احمد اور مخدوم احمد عالم انور سے رابطہ کیا۔ ان سے میرے بزرگوں کے دیرینہ مراسم تھے اور وہ وزیرِ اعظم

کے لیے بھی اچھے خیالات رکھتے تھے۔ میں نے اسلام آباد میں اُن سے فرداً فرداً ملاقات کی۔ میں نے غلام محمد مانیکا اور قاسم شاہ کو وزیرِ اعظم کے گیسٹ ہاؤس میں اپنے ساتھ ٹھہرالیا۔ مانیکا صاحب کو رات ایک بجے اطلاع ملی کہ اُن کے بیٹوں کو پنجاب پولیس ہراساں کر رہی ہے جس سے وہ پریشان ہو گئے۔ میں نے اُسی وقت وزیرِ اعظم سے رابطہ کیا۔ انہوں نے رات 2 بجے چیف سیکرٹری پنجاب کو فون کر کے کسی غلط اقدام سے باز رہنے کی تلقین کی۔ مخدوم احمد عالم نے مجھے ایک تحریر دی کہ وہ جمہوریت کی بقا اور ملک کی ترقی کے لیے وزیرِ اعظم کے خلاف عدمِ اعتماد کا ساتھ نہیں دیں گے۔

اس دوران نواز شریف نے احمد محمود کے ذمے یہ کام لگایا کہ وہ رئیس شبیر احمد کو وفاقی حکومت کے ساتھ رابطہ نہ کرنے دیں۔ اُن دونوں کا تعلق ضلع رحیم یار خان سے تھا۔ جب نواز شریف، رئیس شبیر احمد کے گھر احمد محمود سے آ کر ملے اور اُن سے رئیس شبیر کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ وہ گھر پر موجود ہیں۔ مگر رئیس شبیر وہاں سے خفیہ طور پر جا چکے تھے جس کا احمد محمود کو علم نہ تھا۔ میں نے غلام محمد مانیکا، رئیس شبیر اور مخدوم احمد عالم کی وزیرِ اعظم سے ملاقات کروائی۔ وزیرِ اعظم اُس وقت سیف گیمز کی تقریب میں شرکت کے لیے سپورٹس کمپلیکس، اسلام آباد جا رہی تھیں، وہ انہیں بھی اپنے ہمراہ لے گئیں۔ ان اراکین کو ٹیلی ویژن پر تشہیر ملنے سے حکومت کے حلیف اراکین کے حوصلے بلند ہوئے جبکہ نواز شریف کے حامی اراکین کے حوصلے پست ہو گئے۔ اس طرح تحریکِ عدمِ اعتماد ناکام ہو گئی۔

غلام محمد مانیکا، رئیس شبیر، مخدوم احمد عالم اور قاسم شاہ اس تحریک کی ناکامی کا بڑا سبب بنے۔ کئی مفاد پرست اراکین نے اپنے مفاد کے حصول کے لیے اس موقعہ کو غنیمت جانا۔ اہم بات یہ ہے کہ عدمِ اعتماد کی تحریک سے پہلے فضل داد کو ضمنی انتخاب میں پیپلز پارٹی نے نہ صرف ٹکٹ دیا بلکہ بھرپور مدد بھی کی لیکن انہوں نے اس موقعہ پر بے نظیر بھٹو کا ساتھ نہ دیا۔ جس نشست سے فضل داد کامیاب ہوئے، اُس پر ہمیشہ جٹ قوم کا اُمیدوار منتخب ہوتا رہا لیکن فضل داد کے اس غیر جمہوری قدم سے یہ نشست ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جٹ قوم سے چھن گئی۔

تحریکِ عدمِ اعتماد کی ناکامی کے بعد غلام محمد مانیکا کو وفاقی وزیر برائے افرادی قوت و سمندر پار پاکستانی اور مخدوم احمد عالم کو اسی محکمہ کا وزیرِ مملکت بنا دیا گیا جبکہ رئیس شبیر نے کوئی عہدہ

قبول کرنے سے معذرت کر لی۔ وزارت کا عہدہ سنبھالنے پر مسلم لیگ بہاولپور کی تنظیم نے مخدوم احمد عالم کو رحیم یار خان نہ آنے اور سخت نتائج کی دھمکی دی۔ پیپلز پارٹی نے اُن کا چیلنج قبول کر لیا اور مخدوم احمد عالم کو جلوس کی شکل میں رحیم یار خان لے جایا گیا۔ جلوس میں فاروق لغاری، جہانگیر بدر، مخدوم شہاب الدین قریشی اور میں بھی شامل تھا۔ بہاولپور میں مسلم لیگ کے کارکنوں نے شرکائے جلوس پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ وہاں استقبال کے لیے آئے ہوئے پیپلز پارٹی کے کارکنوں اور شرکائے جلوس نے اُن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور انہیں وہاں سے مار بھگایا۔

میری بھکّر سے ایم این اے محمد ظفر اللہ خان سے دوستی تھی۔ اُن کا ایکسین پی ڈبلیو ڈی امیر نواز شنواری سے بھی تعلق تھا' جس محکمے کا میں وفاقی وزیر رہ چکا تھا۔ امیر نواز کی فاٹا کے تین اراکینِ قومی اسمبلی سے بھی دوستی تھی کیونکہ وہ ان کی ترقیاتی سکیموں کے انچارج تھے۔ محمد ظفر اللہ خان نے میری فاٹا کے ان تین اراکین سے ملاقات کروائی اور انہیں پیپلز پارٹی کی حمایت کے لیے قائل کیا۔ جب انہوں نے میرے ساتھ اپنی حمایت کی سو فیصد حامی بھر لی تو میں نے وزیرِ اعظم کو اعتماد میں لیا۔ 'وزیرِ اعظم ہاؤس' میں ایک شاندار تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں سرحد سے تعلق رکھنے والے تمام وفاقی وزراء اور وزیرِ اعلیٰ کو بھی مدعو کیا گیا جن میں آفتاب شیر پاؤ، جنرل بابر اور افتخار گیلانی نمایاں تھے۔ فاٹا کے تینوں اراکینِ قومی اسمبلی کو 'فیڈرل لاج' سے 'وزیرِ اعظم ہاؤس' تک فاٹا کے رسم و رواج کے مطابق جرگے کے ہمراہ پیدل لایا گیا اور جرگے کے ہر فرد کو دو دُنبے اور دو ہزار روپے نقد رقم پیش کی گئی۔ ان تینوں اراکین نے وزیرِ اعظم کی حمایت کا اعلان کیا، یہ میرے لیے بہت بڑی کامیابی تھی۔ میری اس کامیابی پر سرحد کے چند سرکردہ رہنماؤں نے بُرا منایا جس کا وزیرِ اعظم نے مجھ سے سرسری ساذکر بھی کیا۔

اس تقریب سے قبل میں نے محمد ظفر اللہ خان کی بھی وزیرِ اعظم سے ملاقات کروائی اور کہا کہ خان صاحب غیر مشروط طور پر آپ کے ساتھ شامل ہو رہے ہیں۔ محترمہ نے جب خان صاحب سے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ آپ ہمارے ساتھ غیر مشروط شامل ہو رہے ہیں۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ بات درست نہیں ہے بلکہ میری ایک شرط ہے' جس کا ذکر میں گیلانی صاحب سے کر چکا ہوں مگر وہ اس وقت بھول رہے ہیں۔ وزیرِ اعظم نے مجھ سے دریافت کیا تو میں نے کہا کہ انہوں نے میرے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں کی۔ وزیرِ اعظم نے اُن سے کہا کہ کیا آپ کو وزارت

چاہیے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ وزیرِ اعظم نے پھر دریافت کیا کہ کیا آپ کا کوئی اور مطالبہ ہے؟ تو انہوں نے پھر انکار کر دیا۔ اس انکار کے بعد وزیرِ اعظم نے ان سے کہا کہ آپ ہی بتائیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ خان صاحب نے کہا کہ گیلانی صاحب بھول رہے ہیں، میں اُن سے کہہ چکا ہوں کہ وہ مجھے اپنے مریدوں کی فہرست میں شامل رکھیں، انہوں نے جس دن مجھے اپنے مریدوں کی فہرست سے خارج کر دیا میں اسی دن آپ کو چھوڑ جاؤں گا۔ وزیرِ اعظم نے مجھ سے کہا کہ گیلانی صاحب! میں آپ سے سفارش کرتی ہوں کہ آپ انہیں اپنے مریدوں کی فہرست میں ہمیشہ شامل رکھیں۔

میں پکا قلعہ، حیدر آباد سندھ کے پُرتشدد واقعات کی وجہ سے خاصا پریشان تھا۔ میں نے سوچا کہ وزیرِ اعظم سے مل کر درخواست کروں کہ اُمورِ مملکت چلانے کے لیے ہر قدم پر رکاوٹیں کھڑی کی جا رہی ہیں، لہٰذا وہ مستعفی ہو جائیں۔ اُس وقت نواز شریف ایم این اے نہیں تھے اور قائدِ حزبِ اختلاف غلام مصطفیٰ جتوئی کی اراکینِ قومی اسمبلی پر مکمل گرفت نہیں تھی۔ وزیرِ اعظم کے مستعفی ہونے کی صورت میں انہیں دوبارہ حکومت میں لانا اسٹیبلشمنٹ کی مجبوری بن جائے گی، لہٰذا میں وزیرِ اعظم سے ملاقات کے لیے پروگرام طے کیے بغیر اسلام آباد سے کراچی چلا گیا۔ میں نے وزیرِ اعظم سے 'بلاول ہاؤس' میں ملاقات کی۔ اُن کے پاس کئی وزراء، اراکینِ قومی وصوبائی اسمبلی بشمول مخدوم امین فہیم موجود تھے۔ اُس دن کے 'ڈان' اخبار میں بڑی نمایاں خبر چھپی کہ فوج حکومت کی مکمل حمایت کرے گی۔ اس خبر سے وزیرِ اعظم بہت خوش تھیں، گہما گہمی اتنی تھی کہ میں اُن سے اپنی بات نہ کر سکا۔ میں نے وزیرِ اعظم سے اجازت چاہی تو وہ مجھے رخصت کرنے کے لیے ڈرائنگ روم سے باہر آئیں۔ مجھے موقع مل گیا کہ میں اُن سے اپنی بات کہہ سکوں۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ بہت مشکل حالات میں حکومت چلا رہی ہیں اور میری تجویز ہے کہ آپ حکومت چھوڑ کر حزبِ اختلاف میں بیٹھ جائیں۔ میں نے مزید کہا کہ آپ 'ڈان' اخبار کی خبر پر خوش ہیں مگر مجھے اس بات میں کوئی چال نظر آ رہی ہے، میں اپنا استعفیٰ لکھ کر لایا ہوں۔ وزیرِ اعظم جذباتی ہو گئیں اور مجھے کہنے لگیں کہ چلو! آپ کو تو ہر چیز کا علم ہے، آپ دیکھیں کہ مجھے صدر غلام اسحاق خان سے روزانہ یہ بات سننی پڑتی ہے کہ ایم کیو ایم کے سربراہ الطاف حسین نے بھوک ہڑتال کر رکھی ہے اور میں جا کر اُنہیں کچھ کھلاؤں پلاؤں۔

وزیرِ اعظم نے میری تجویز سے اتفاق کیا اور اس سلسلے میں انہوں نے پارٹی کا ہنگامی اجلاس پرانے وزیرِ اعظم سیکرٹیریٹ، اسلام آباد میں طلب کر لیا تا کہ اس اہم معاملے پر پارٹی کو اعتماد میں لیا جا سکے۔ اس ہنگامی اجلاس اور اُس کے ایجنڈے کی خبر صدرِ مملکت کے علم میں بھی آ چکی تھی جس پر صدر نے وزیرِ اعظم سے رابطہ کر کے اُنہیں اپنی مکمل حمایت کی یقین دہانی کروائی۔ پارٹی کی میٹنگ میں اس موضوع پر بحث ہوئی اور پھر بغیر کسی فیصلے کے برخاست کر دی گئی۔ بہت عرصے بعد غالباً 1999ء میں جی ڈی اے کا اجلاس ملتان میں سابق صوبائی وزیر پنجاب میاں سعید قریشی کی فیکٹری میں منعقد ہوا۔ جنرل اسلم بیگ نے اس اجلاس میں بطورِ رکن شرکت کی۔ میں نے اس موقعہ پر اُن سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو انہوں نے جواب دیا:

" If she'd acted on your advice, she would've really embarrased us. "

ترجمہ: اگر وہ آپ کے مشورے پر عمل کر لیتیں تو وہ یقیناً ہمارے لیے باعثِ شرمندگی ہوتا۔

میں نے 1990ء میں بلوچستان کا دورہ کیا۔ میں اُس وقت وفاقی وزیر ہاؤسنگ و تعمیرات تھا۔ میری ملاقات وزیرِ اعلیٰ بلوچستان نواب اکبر بگٹی سے ہوئی۔ میں نے وہاں اپنی وزارت کی طرف سے جاری شدہ منصوبے بھی دیکھے۔ اُنہی دنوں نواب اکبر بگٹی نے مجھے ظہرانے پر مدعو کیا۔ وہ والد کے ساتھ 1956ء میں رکن آئین ساز اسمبلی اور بعد میں وزیرِ اعظم فیروز خان نون کی کابینہ میں وزیرِ مملکت رہ چکے تھے۔ اُن دنوں اُن کے بے نظیر بھٹو سے تعلقات کشیدہ تھے۔ اس موقعہ پر انہوں نے مجھے کہا کہ ایم کیو ایم بہت جلد حکومت سے علیحدہ ہو جائے گی۔ میں نے واپسی پر وزیرِ اعظم کو یہ بات بتائی جو صحیح ثابت ہوئی اور چند ہفتوں بعد ایم کیو ایم نے پیپلز پارٹی سے اتحاد ختم کر دیا۔

1990ء میں وزیرِ اعظم نے اپنی رہائش گاہ 'سندھ ہاؤس' میں کور کمانڈروں کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔ انہوں نے ہر کور کمانڈر کے ساتھ اپنا ایک وفاقی وزیر بٹھایا۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے وزیرِ اعظم کی طرف سے ایک چٹ موصول ہوئی کہ میں انٹر سروسز انٹیلیجنس (آئی ایس آئی) کے سربراہ لیفٹننٹ جنرل حمید گل سے اپنی حکومت کی کارکردگی کے بارے میں دریافت کروں؟ میں نے جنرل حمید گل سے اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ آپ کو مسلم لیگ نہیں چھوڑنی

چاہیے تھی کیونکہ ہم آپ کو وزیرِ اعلیٰ پنجاب بنانے کا سوچ رہے تھے مگر آپ نے جلد بازی کی اور پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے مزید کہا کہ آپ کی حکومت پر بدعنوانی کے کئی الزامات ہیں، آپ کے بُرے دن آنے والے ہیں۔ عشائیے کے اختتام پر وزیرِ اعظم نے تمام وزراء سے دریافت کیا کہ کور کمانڈروں کی ہماری حکومت کے بارے میں کیا رائے ہے؟ کم و بیش سب کا جواب تھا کہ وہ حکومت کی کارکردگی سے مطمئن ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ حالیہ میٹنگ ڈیفنس کوآرڈینیشن کمیٹی میں کور کمانڈروں نے آپ کی تقریر کو بھی بہت سراہا ہے۔

وزیرِ اعظم نے میری رائے طلب کی تو میں نے مَن وعَن وہی باتیں بتا دیں جو جنرل حمید گل نے مجھ سے کی تھیں۔ وزیرِ اعظم نے فوراً فون پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ میں چیف آف آرمی سٹاف جنرل اسلم بیگ سے بات کرتی ہوں کہ آپ کا جنرل سیاست میں مداخلت کر رہا ہے۔ میں نے اُنہیں روکتے ہوئے کہا کہ فوج کی بحیثیت ادارہ ایک ہی سوچ ہوتی ہے۔ انہوں نے فون رکھ دیا مگر پریشان ہو گئیں۔ جب 1999ء میں جی ڈی اے کی میٹنگ ملتان میں ہوئی تو میں نے جنرل اسلم بیگ سے یہ بات بھی کی انہوں نے کہا کہ کاش! آپ وزیرِ اعظم کو نہ روکتے تو میں انہیں جنرل حمید گل کے تاثرات کے بارے میں صحیح وضاحت کرتا۔

1990ء میں پیپلز پارٹی کے ایم پی اے اسرار احمد انتقال کر گئے۔ وزیرِ اعظم اور میں ہیلی کاپٹر کے ذریعے میلسی (وہاڑی) گئے اور مرحوم کے اہلِ خانہ سے تعزیت کی۔ اُن کے خاندان نے اسرار احمد کے بھائی طارق خان کے لیے صوبائی اسمبلی کی نشست پر پیپلز پارٹی کے ٹکٹ کا مطالبہ کیا۔ محترمہ نے انہیں ان کی خدمات کی وجہ سے ضمنی انتخاب کے لیے ٹکٹ دے دیا اور ساتھ ہی انہوں نے مجھے انتخابی مہم کا انچارج مقرر کر دیا۔ میرا تعلق اُن کے حریف کھچی خاندان سے بہت دیرینہ تھا جس کی وجہ سے اسرار احمد کا خاندان مجھ پر شک کر رہا تھا۔ وزیرِ اعظم نے اُن سے کہا کہ یوسف رضا میرے وفاقی وزیر ہیں اور ان کی پارٹی وابستگی پر کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہونا چاہیے۔ جب میں پیپلز پارٹی کی انتخابی مہم کا انچارج بنا تو عوام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ اَب پیپلز پارٹی کا پلڑا بھاری ہو گیا ہے۔ انتخاب کے دوران نعرہ تھا ''میاں محفوظ غیر محفوظ'' کیونکہ سابق ایم پی اے میاں محفوظ ارائیں، مسلم لیگ کی طرف سے اُمیدوار تھے۔

اس مہم کے دوران میرے حلقے سے ایم پی اے سیّد ناظم حسین نے ایک انتخابی جلسے

میں تقریر کرتے ہوئے عوام سے کہا کہ قائد حزبِ اختلاف مصطفیٰ جتوئی اپنی جماعت کے تنہا ایم این اے ہیں اور خواہش رکھتے ہیں کہ انہیں ملک کا وزیرِ اعظم بنا دیا جائے۔ انہوں نے عوام سے دریافت کیا کہ کیا ایسا ممکن ہے؟ جلسہ عام میں ایک شخص کھڑا ہو گیا اور اس نے بلند آواز میں جواب دیا کہ وہ وزیرِ اعظم بن گیا ہے۔ ناظم حسین جوشِ خطابت میں جس تیز رفتاری سے جا رہے تھے انہیں اچانک بریک لگ گئی اور پھر اتنے پریشان ہوئے کہ نا معلوم اپنی تقریر میں کیا کچھ کہہ گئے۔ ہم نے فوراً ٹیلی ویژن لگوایا تو خبروں سے معلوم ہوا کہ بے نظیر بھٹو کی حکومت برطرف کر کے اسمبلی تحلیل کر دی گئی ہے اور مصطفیٰ جتوئی کو واقعی نگران وزیرِ اعظم بنا دیا گیا ہے۔ میں نے ملتان جانے کی تیاری کی۔ میں نے اپنے ساتھ ڈیوٹی پر مامور پولیس گارڈز کو واپس جانے کا کہا تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم آپ کو ملتان پہنچائے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ میں مکمل پروٹوکول کے ساتھ ملتان جا رہا تھا کہ میلسی شہر سے گزرتے ہوئے مجھے کئی مقامات پر لوگوں نے روکا اور کہا کہ آپ وزیر نہیں رہے کیونکہ حکومت برطرف کر دی گئی ہے۔ غالباً اُن کا خیال تھا کہ مجھے حکومت کی برطرفی کی خبر نہیں۔ اُن کے جذبات متاثر کن تھے۔

❀ ❀ ❀

باب ششم

میاں محمد نواز شریف کا پہلا دورِ حکومت (1990ء۔1993ء)

1990ء میں صدر غلام اسحاق خان نے عام انتخابات کا اعلان کر دیا۔ اس وقت یہ تاثر عام تھا کہ بے نظیر بھٹو کو اسٹیبلشمنٹ دوبارہ اقتدار میں نہیں آنے دے گی۔ پورے ملک میں انتخابی مہم کا آغاز ہو گیا۔ میرے مدِ مقابل کوئی بھی اُمیدوار انتخاب میں حصہ لینے کو تیار نہ تھا۔ مجھے میرے لاسال ہائی سکول ملتان کے دوست محمد اعجاز الحق نے بتایا کہ مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ کے اجلاس میں جب آپ کے حلقۂ انتخاب کا نام آیا تو آپ کے مقابلے میں کسی نے بھی درخواست نہ دی، مجھے خوشی ہوئی کہ میرا دوست عوام میں اتنا مقبول ہے۔

اسلامی جمہوری اتحاد نے چچا حامد رضا کو میرے مدِ مقابل اُمیدوار بننے پر بمشکل راضی کیا۔ اُن کے صوبائی اسمبلی کے اُمیدوار شاہ محمود، سکندر بوسن اور اَحسن شاہ تھے جبکہ میرے صوبائی اسمبلی کے اُمیدوار مظہر راں، حیدر زمان گردیزی اور ناظم حسین تھے۔ میں کامیاب ہو گیا مگر میرے تینوں صوبائی اسمبلی کے اُمیدوار انتخاب ہار گئے۔

جن دنوں میرا مقابلہ چچا حامد رضا کے ساتھ ہو رہا تھا تو والدہ خاصی پریشان تھیں۔ وہ ایک دن کہنے لگیں کہ بھائی حامد رضا میرے پیر کا پوتا ہے اور تم میرے بیٹے ہو، میں بہت پریشان ہوں کہ حکومت آپ کو آپس میں لڑا رہی ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ اَب ان حالات میں آپ کیا کریں گی؟ انہوں نے جواباً کہا کہ میں تسبیح دیکھ کر بتاتی ہوں۔ تسبیح دیکھنے کے بعد انہوں نے کہا کہ انتخاب تو تم جیت جاؤ گے مگر وہ بھی کچھ بن رہے ہیں۔ ان کی بات درست ثابت ہوئی، انتخاب تو

میں ہی جیت گیا مگر کچھ عرصے بعد چچا سینٹ کے رکن منتخب ہو گئے۔ پورے ملک میں مسلم لیگ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوگئی۔

اسلامی جمہوری اتحاد کے سربراہ میاں نواز شریف پاکستان کے وزیرِ اعظم منتخب ہو گئے۔ اُن کی کامیابی کے بعد پیپلز پارٹی کی پارلیمانی پارٹی کا اجلاس اسلام آباد میں منعقد ہوا۔ ہم نے انتخابی نتائج کو احتجاجاً قبول کیا اور حلف برداری میں بھی شامل ہوئے۔ پیپلز پارٹی کی پارلیمانی پارٹی نے بے نظیر بھٹو کو قائد حزبِ اختلاف اور فاروق لغاری کو ڈپٹی قائد منتخب کیا۔

میاں نواز شریف سے میرے دیرینہ تعلقات ہیں۔ 1983ء میں وفاقی کونسل کے اجلاس کے بعد اسلام آباد سے لاہور جاتے ہوئے جہاز میں میری اور اُن کی نشستیں اکٹھی تھیں، وہیں ہماری پہلی ملاقات ہوئی۔ اس وقت میاں صاحب صوبائی وزیرِ خزانہ پنجاب تھے جبکہ میں وفاقی کونسل کا رکن اور ضلع کونسل، ملتان کا چیئرمین تھا۔ میں نے انہیں ضلع کونسل سے خطاب کی دعوت دی جو انہوں نے قبول کر لی۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے ملتان کا دورہ کیا اور ضلع کونسل سے خطاب کیا۔ میں نے انہیں اپنے ضلع کونسل کے اراکین اور عمائدین علاقہ سے بھی ملوایا جس کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ انہی دنوں میاں صاحب نے ایک جلسے کا انعقاد چوہدری عید محمد کے سینما ہال، لاہور میں کیا جس میں مَیں خاص طور پر میاں صاحب کی دعوت پر شریک ہوا۔

میاں صاحب طبعاً ایک شریف انسان ہیں۔ کم گو، خوش لباس اور دوستوں کے دوست ہیں۔ نواز شریف پہلی مرتبہ 1985ء کے عام انتخابات میں قومی وصوبائی اسمبلی کی نشستوں سے بیک وقت منتخب ہوئے۔ ان انتخابات میں اُن کے علاوہ مخدوم زادہ حسن محمود، ملک اللہ یار کھنڈا اور چوہدری عبدالغفور وزارتِ اعلیٰ کے اُمیدوار تھے۔

ماموں حسن محمود بھی قومی وصوبائی اسمبلی کی نشستوں سے بیک وقت منتخب ہونے والوں میں شامل تھے۔ وہ نہایت تجربہ کار، زِیرک اور جوڑ توڑ کے ماہر پارلیمنٹرین تھے۔ انہوں نے ریاست بہاولپور کے وزیرِ اعظم کے طور پر بہت کام کیے جن میں صادق پبلک سکول کا قیام اور ڈرگ سٹیڈیم (Drig Stadium) کی تعمیر شامل ہے۔ انہوں نے والد کو وکٹوریہ ہسپتال، بہاولپور میں ایل ایس ایم ایف میڈیکل سکول کے قیام کے لیے سہولیات بہم پہنچائیں۔ بہاولپور ریاست میں قانونِ وراثت کے مطابق صرف بڑا بیٹا ہی وارث قرار پاتا تھا لیکن سیّد حسن محمود نے اس

قانون میں ترمیم کر دی جس میں متوفی کے تمام ورثاء اپنے شرعی حصے کے مطابق وارث قرار پاتے ہیں حالانکہ وہ خود اپنے بھائیوں میں بڑے تھے۔ میری والدہ کو بھی اپنے والد کی وراثت سے تقریباً پچاس مربع اراضی ملی (مگر وہ ہماری سیاست کی نذر ہو گئی)۔ مخدوم زادہ صاحب واحد قائد حزبِ اختلاف پنجاب تھے جو صوبائی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے چیئرمین منتخب ہوئے۔ انہوں نے صدر ضیاءُ الحق سے ملاقات کی اور اُن سے مشورہ کیا کہ وہ مرکز میں رہیں یا صوبے میں؟ صدر صاحب نے انہیں اُن کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ بعد ازاں مخدوم زادہ صاحب نے اپنے بہنوئی مسلم لیگ کے صدر، پیر صاحب پگاڑو سے ملاقات کر کے حمایت چاہی۔ پیر صاحب نے انہیں صوبے میں رہنے کا مشورہ دیا کیونکہ مرکز میں وہ محمد خان جونیجو کو وزیرِ اعظم بنانے کے لیے کوشاں تھے۔ دوسری طرف ملک اللہ یار کھنڈا کو جونیجو صاحب کی حمایت حاصل تھی۔ ساتھ ہی چچا حامد رضا بھی انہی کی مدد کر رہے تھے۔ نواز شریف میرے گھر لاہور تشریف لائے اور مجھے جیل روڈ پر، عمار ہسپتال کے قریب ایک قالینوں کے شوروم میں لے گئے۔ وہاں انہوں نے وزارتِ اعلیٰ کے لیے میرے تاثرات جاننے کی خواہش کا اظہار کیا کہ اگر وزارتِ اعلیٰ کے لیے سیّد حسن محمود اور خود اُن میں سے کسی کی حمایت کرنا ہو تو میں کس کی حمایت کروں گا۔ میں نے میاں صاحب کو بتایا کہ سیّد حسن محمود کو فوج کی طرف سے مخالفت کا سامنا ہو گا۔ وہ انہیں وزیرِ اعلیٰ پنجاب نہیں بننے دیں گے، لہٰذا میں آپ کی حمایت کروں گا۔ میاں صاحب نے مجھے کہا کہ اگر آپ ایم این اے کی بجائے ایم پی اے ہوتے تو میں آپ کو اپنا وزیر بنا لیتا۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا (چند دنوں بعد وزیرِ اعظم جونیجو نے مجھے کابینہ میں شامل کر کے وفاقی وزیر ہاؤسنگ و تعمیرات بنا دیا)۔ اسی موقعہ پر میاں صاحب نے مجھ سے اپنی صوبائی کابینہ کے لیے مشورہ مانگا۔ میں نے انہیں ملتان سے شاہ محمود اور دیوان عاشق کے نام تجویز کیے۔ جب میاں صاحب وزیرِ اعلیٰ پنجاب بنے اور اپنی کابینہ کا اعلان کیا تو میرے تجویز کردہ نام شامل نہیں تھے۔ اس کے برعکس ہمارے ملتان سے سیاسی حریف سعید قریشی کو صوبائی وزیر بنا دیا گیا۔ اُن کے اس عمل سے میرے گروپ کے سامنے مجھے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ میرا خیال ہے کہ کابینہ کی تشکیل میں میاں صاحب خود مختار نہ تھے۔ اگرچہ مجھے اُن سے اس بات کا گلہ نہیں لیکن ذہنی طور پر مسلم لیگ سے میرے اختلاف کی ابتداء ہو گئی۔ جب میں پیپلز پارٹی میں شامل ہوا اور میاں صاحب دوسری مرتبہ وزیرِ اعلیٰ منتخب ہوئے تو انہوں نے شاہ محمود

اور دیوان عاشق کو اپنی کابینہ میں شامل کر لیا۔ مجھ سے دورانِ اسیری 2004ء سنٹرل جیل، راولپنڈی میں جاوید ہاشمی نے انکشاف کیا کہ سعید قریشی کو صوبائی وزیر بنوانے میں اُن کا ہاتھ تھا۔

میاں صاحب کی دعوت پر پاکستان آئے ہوئے بھارت کے وزیرِ اعظم اٹل بہاری واجپائی نے مینارِ پاکستان کے تاریخی مقام پر کشمیر کو متنازعہ مسئلہ تسلیم کیا جو کہ سفارتی سطح پر نواز شریف کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ انہوں نے ایٹمی دھماکہ کر کے بین الاقوامی طور پر ملک کی ایٹمی طاقت کی توثیق کروائی جسے پاکستان کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ اسی طرح قائد حزبِ اختلاف بے نظیر بھٹو کو اُمورِ خارجہ کمیٹی کا چیئر پرسن بنانا اور آصف زرداری کی حاضری اسمبلی میں یقینی بنانے کے لیے رُول 90 اپنی اسمبلی سے پاس کروانا پارلیمانی تاریخ کی بہترین مثالیں ہیں ۔میاں صاحب نے بطورِ صدر مسلم لیگ اپنی جماعت کو منظم اور متحرک کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اُن کے دور میں کارکنوں کی تعداد میں قابلِ ذکر اضافہ ہوا۔

1990ء کے عام انتخابات کے فوراً بعد وزیرِ اعظم نواز شریف توہین رسالت کے قانون * میں ترمیم لانا چاہتے تھے۔ قائد حزبِ اختلاف بے نظیر بھٹو نے پارٹی کی چند کمیٹیاں تشکیل دیں تا کہ وہ مختلف رہنماؤں سے مل کر انہیں آمادہ کریں کہ اس قسم کی متنازعہ ترمیم نہ کی جائے۔ محترمہ نے مجھے اور فاروق لغاری کو جونیجو صاحب سے ملاقات کے لیے کہا۔ ہماری جونیجو صاحب سے ملاقات ہوئی، وزارتِ ریلوے کے بعد یہ میری اُن سے پہلی باضابطہ ملاقات تھی۔ وہ بڑی شفقت سے ملے اور کہا کہ ہم سرداروں اور پیروں کی بہت عزت کرتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں یقین دلایا کہ وہ اس ترمیم کے سلسلے میں ہمارا ساتھ دیں گے۔ ہماری ملاقات کے وقت اعجاز الحق بھی وہاں موجود تھے، انہوں نے بھی اس ترمیم کی مخالفت کا یقین دلایا۔ غلام مصطفیٰ جتوئی پہلے ہی اس ترمیم کی مخالفت کر چکے تھے۔ وزیرِ اعظم کو مسلم لیگ کی پارلیمانی پارٹی میں بھی اس ترمیم کی وجہ سے خاصی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس بنا پر وزیرِ اعظم ترمیم نہ لا سکے۔

قبل ازیں ایرانی انقلاب کے بانی آیت اللہ امام خمینی کی نماز جنازہ پر مجھے حکومتِ پاکستان کی نمائندگی کا اعزاز مل چکا تھا اور اب 1991ء میں اُن کی برسی پر بھی دعوت نامہ بھیجا گیا۔ دعوت نامے کے علاوہ ایران سے ایک خصوصی طیارہ بھی بھیجا گیا۔ حزبِ اقتدار کی طرف

* Blasphemy

سے وفاقی پارلیمانی سیکرٹری برائے اطلاعات ونشریات جاوید علی شاہ، ایم این اے علامہ حامد سعید کاظمی، صوبائی وزراء ملک سلیم اقبال، ملک خدا بخش ٹوانہ، اختر عباس بھروانہ اور دیوان عاشق حسین کے علاوہ بشریٰ رحمٰن بھی شامل تھیں۔ حزبِ اختلاف کی طرف سے میں اکیلا رکن تھا۔ ہمیں آیت اللہ خمینی کی برسی پر لے جایا گیا اور ایران کی برسرِ اقتدار پارٹی کے سرکردہ افراد سے ملوایا گیا۔ اراکینِ وفد نے وفد کی قیادت ملک سلیم اقبال کو سونپی۔ اختر عباس بھروانہ بے تکلفی سے انہیں تھانیدار کہتے تھے۔ اس دورے میں مترجم کے فرائض ایک ایرانی خاتون بانو خدا بخش نے انجام دیے۔ دورے کے دوران دلچسپ واقعات پیش آئے۔ وفد میں شامل بعض اراکین کو انگریزی پر مکمل عبور حاصل نہ تھا اس لیے وہ مترجم سے مختصر گفتگو کرتے جسے وہ آگے پہنچا دیتیں۔ اُن اراکین نے مترجم سے گلہ کیا کہ آپ حکومت کی بات مختصر کرتی ہیں اور حزبِ اختلاف کی بات مکمل وضاحت سے کرتی ہیں۔ مترجم نے کہا کہ آپ بات ہی کم کرتے ہیں اور ازراہِ مذاق کہا: آئندہ ہم اس بات پر متفق ہو جاتے ہیں کہ you speak less, I'll speak more (آپ کم بولیں میں زیادہ بولوں گی)۔ ہم نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام کے روضۂ پاک پر بھی حاضری دی۔

ایران میں ٹریفک قوانین سخت بھی ہیں اور انوکھے بھی۔ مسافر کسی بھی گاڑی کو روک سکتے ہیں اور اگر اُس میں بیٹھنے کی گنجائش موجود ہو تو کرایہ ادا کر کے اپنی منزل تک سفر کر سکتے ہیں۔ میں اور جاوید علی شاہ سڑک کنارے کھڑے تھے کہ ایک ٹیکسی آتی دکھائی دی۔ ہم نے اُسے رُکنے کے لیے اشارہ کیا۔ ٹیکسی میں ڈرائیور کے ساتھ والی اور پیچھے ایک سیٹ خالی تھی جبکہ پیچھے دو خواتین مسافر پہلے سے موجود تھیں۔ میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا اور جاوید علی شاہ پیچھے بیٹھ گئے۔ ہم ابھی کچھ ہی دور گئے تھے کہ پولیس نے ٹیکسی کا پیچھا کرتے ہوئے روک لیا اور ہماری شناخت دریافت کی۔ میں نے اپنا تعارف کروایا۔ پاک ایران دوستی کا اثر تھا کہ وہ مطمئن تو ہو گئے مگر خواتین کو ٹیکسی سے اُتار لیا اور ڈرائیور سے کہا کہ پہلے ان اجنبی مردوں کو چھوڑ آؤ پھر خواتین کو لے کر جاؤ۔ ان دنوں معاشرتی قدریں خاصی بدل چکی ہیں مگر اُس وقت وہاں کی روایات کی مطابق عوام اور غیر ملکیوں (اجنبیوں) کے درمیان فاصلہ رکھا جاتا تھا۔

1991ء میں بلدیاتی انتخابات کا اعلان ہوا تو ملتان میں مسلم لیگ کے دو واضح گروپ

بن گئے، ایک چچا حامد رضا اور دوسرا شاہ محمود کا اور پیپلز پارٹی کا گروپ میری قیادت میں متحد تھا۔ چچا کے ساتھ وزیرِ اعلیٰ پنجاب غلام حیدر وائیں، وفاقی وزراء سیّد فخر امام، جاوید ہاشمی اور صدیق کانجو، صوبائی وزراء اقبال خان خاکوانی، دیوان عاشق حسین اور ایم پی اے سکندر بوسن بھی شامل تھے۔

ایم پی اے سکندر بوسن کے ہمراہ اسلم خان بوسن اور نور خان بوسن میرے گھر ملتان آئے اور انہوں نے مجھ سے میرے چچا زاد بھائی سیّد محمد رضا کے لیے چیئرمین ضلع کونسل، ملتان کے عہدے کے لیے ووٹ مانگا تو میں نے مطالبہ کیا کہ وہ مجھ سے خود ووٹ مانگیں۔ انہوں نے میرا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا، سو میں نے انہیں ووٹ دینے سے انکار کر دیا۔ اس انکار پر اسلم بوسن نے اپنے سر سے ٹوپی اتار کر میرے پاؤں میں رکھ دی اور میری حمایت کا مطالبہ کیا۔ میں نے اُن سے کہا کہ چیئرمین میرا کزن محمد رضا بن رہا ہے، لہٰذا اسے چاہیے کہ وہ مجھ سے خود ووٹ مانگے۔ سکندر بوسن نے کہا کہ اگر آپ شاہ محمود کے ایما پر قریشی گروپ کو ووٹ دیں گے تو میں ساری زندگی آپ کے گھر نہیں آؤں گا۔ میں نے کہا کہ آپ مجھ سے خفیہ ووٹ مانگنا چاہتے ہیں تاکہ آپ ووٹ بھی لے لیں اور حکومت کو اس کا علم بھی نہ ہو۔ آج سکندر بوسن کے قریبی عزیز نور بوسن کے بیٹے فیاض خان بوسن، شاہ محمود کے دستِ راست ہیں۔

میں نے چیئرمین ضلع کونسل، ملتان کے انتخاب میں شاہ محمود کے ساتھ مل کر حصہ لیا مگر محمد رضا کے ایک ووٹ کی برتری کے باعث ہم تمام مخصوص نشستیں ہار گئے۔ شاہ محمود نے کابینہ سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے انہیں قائل کیا کہ وہ مستعفی نہ ہوں۔ میں نے گروپ سے اجازت طلب کی کہ میں جسے چاہوں چیئرمین ضلع کونسل کے عہدے کے لیئے نامزد کر دوں۔ گروپ نے خوشی سے اجازت دے دی۔ میں نے پیر فخر الدّین شاہ سے رابطہ کر کے چیئرمین ضلع کونسل کے عہدے کی پیشکش کی جو انہوں نے قبول کر لی۔

میں نے زندگی میں اُن جیسے حوصلہ مند لوگ کم دیکھے ہیں کہ انہوں نے یہ بھی نہ پوچھا کہ میرے پاس کتنے اراکین ہیں اور کیا وہ چیئرمین بن بھی سکیں گے یا نہیں؟ اُن کے بیٹوں نے بھی ان سے دریافت کیا کہ کیا یوسف رضا نے آپ کو بتایا ہے کہ اُن کے پاس کتنے ووٹ ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے ان سے پوچھنے کی ضرورت نہیں، مجھے معلوم ہے کہ اب یوسف رضا

نے مرن* کر دینا ہے۔قصہ مختصر تمام حکومتی ہتھکنڈوں کے باوجود ہم بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گئے۔

1992ء میں سپیکر قومی اسمبلی گوہر ایوب خان نے یونڈے، کیمرون میں ہونے والی آئی پی یو کانفرنس کے لیے اپنے وفد میں مجھے بھی شامل کیا۔ ہمارا وفد پہلے نائیجیریا گیا جہاں ہمیں ایک ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ میں صبح سویرے باتھ روم میں شیو کر رہا تھا کہ اچانک ہوٹل کی انتظامیہ کا ایک آدمی دروازہ توڑ کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں نے اُس سے دریافت کیا کہ آپ کو دروازہ توڑنے کی ضرورت کیوں پیش آئی، آپ کو دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے تھا۔ اُس نے کہا کہ میں کمرے کی اشیاء چیک کرنا چاہتا ہوں کہ کیا ہر چیز اپنی جگہ پر موجود بھی ہے یا نہیں؟ وہاں کمرے میں موجود اشیاء کو زنجیروں سے باندھا جاتا تھا۔ اُس نے مزید کہا کہ میں آپ ہی کے کمرے سے دوسرے کمرے میں جانا چاہتا ہوں۔ اُس کمرے میں گوہر ایوب اور اُن کی اہلیہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں نے اُسے وہاں جانے سے روکا، وہ بڑی مشکل سے قائل ہوا۔

ہم دوسرے روز کیمرون کے لیے بذریعہ ہوائی جہاز روانہ ہوئے۔ میں نے وہاں پہنچ کر اپنا سامان چیک کیا تو میرے سوٹ کیس میں سے بہت سا سامان غائب تھا اور اُس کی جگہ بچوں کے کپڑے ڈال دیے گئے تھے۔ بہرحال ہم یونڈے پہنچے اور ایک ہوٹل میں رہائش رکھی۔ کیمرون کے صدر کی زیرِ صدارت آئی پی یو کی کانفرنس کا افتتاح ہونا تھا۔ پوری دنیا سے مندوبین مقررہ وقت پر کانفرنس ہال پہنچ گئے تو اطلاع دی گئی کہ کانفرنس کا وقت تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس تبدیلیٔ وقت کا جواز بھی نہ بتایا گیا، لہٰذا سینکڑوں مندوبین کو اپنے اپنے ہوٹلوں میں واپس جانا پڑا۔ اسی شام اجلاس ہوا۔ ہم وفد کے ہمراہ دوسرے روز خرید و فروخت کے لیے نکلے۔ ایک مارکیٹ میں دنیا کا نایاب پتھر جیڈ دستیاب تھا۔ گوہر ایوب خان اور اُن کی اہلیہ کو اس پتھر کا بنا ہوا چھوٹا سا ڈیکوریشن پیس (ہاتھی) پسند آ گیا۔ قیمت طے کرتے ہوئے دُکاندار اُن سے چڑ گیا اور کہنے لگا کہ اَب میں آپ کو یہ نہیں بیچوں گا۔ میں یہ منظر دیکھ رہا تھا، میں دکاندار کے پاس چلا گیا اور اپنی طرف سے اسے خریدنے کی کوشش کی مگر اس نے گوہر ایوب خان کی طرف دیکھ کر مجھے کہا کہ آپ اُن کے لیے خریدنا چاہتے ہیں، اس لیے اَب میں آپ کو بھی یہ نہیں بیچوں گا۔ ہماری خواہش اُس کی ضد سے ہار گئی۔

* سرائیکی زبان کا لفظ ہے: کسی کام کے لیے انتھک محنت کرنا۔

اسی سال میرے دوست زاہد بشیر نے مجھے امریکہ آنے کی دعوت دی۔ مجھے اس نجی دورے کے دوران سنسینیٹی، ہیوسٹن اور ڈیلس جانے کا موقعہ ملا۔ یہاں ایک واقعہ اُس وقت پیش آیا جب میں سنسینیٹی ائرپورٹ پر اُتر کر ڈیلس کے لیے فلائٹ لے رہا تھا۔ میرے ایک ہاتھ میں ٹرالی بیگ اور دوسرے میں بریف کیس تھا، میں فلائٹ چھوٹ جانے کے ڈر سے قطار کو توڑتا ہوا سب سے آگے جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے ساتھی مسافروں کے احتجاج پر اُن سے التجا کی کہ میری ڈیلس کی فلائٹ چھوٹ رہی ہے۔ اس پر انہوں نے مجھے جگہ دے دی۔ غالباً مجھے کیمرے میں دیکھا جا رہا تھا کہ میں اتنی جلدی میں کیوں ہوں۔ میں جونہی لاؤنج میں پہنچا تو مجھے ائرپورٹ سیکیورٹی نے روک لیا اور سَرچ کا مطالبہ کیا۔ میں نے ان سے التجا کی کہ میں فلائٹ سے رہ جاؤں گا مگر وہ نہ مانے۔ میں نے اپنا تعارف بحیثیت ایم این اے، پاکستان بھی کروایا مگر اس کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لے گئے۔ وہاں کے قانون کے مطابق دس ہزار ڈالر سے زائد رقم رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ انہوں نے میری جیبیں چیک کیں تو دس ہزار ڈالر ہی نکلے۔ بیگ کھولا گیا تو اُس میں سے بھی کچھ برآمد نہ ہوا۔ انہوں نے مجھ سے معذرت کرتے ہوئے دوسری فلائٹ پر جانے کی اجازت دے دی۔

1992ء میں قائد حزبِ اختلاف بے نظیر بھٹو نے مجھے فون پر ہندوستان کے وزیر اعظم راجیو گاندھی کے قتل کی اطلاع دی اور کہا کہ وزیرِ اعظم نواز شریف ہمیں حزبِ اختلاف کی نمائندگی کے لیے اپنے ہمراہ راجیو گاندھی کی آخری رسومات میں لے جانا چاہتے ہیں، لہٰذا آپ اپنا پاسپورٹ ہندوستان کے ہائی کمشنر مسٹر ڈکشٹ کو بھجوا دیں جو آپ کے پاسپورٹ کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے اپنا پاسپورٹ فوری طور پر ہائی کمشنر کو اسلام آباد بھجوا دیا۔ مسٹر ڈکشٹ اب وفات پا چکے ہیں وہ وفات سے قبل بھارت کے نیشنل سیکیورٹی ایڈوائیزر رہتے۔ کچھ دیر بعد محترمہ نے مجھ سے دوبارہ رابطہ کر کے کہا کہ ہم اپنے طور پر دہلی کے لیے کل کی فلائٹ میں اپنی نشستیں بُک کروالیں کیونکہ نواز شریف نے انہیں مطلع کیا ہے کہ شاید اُن کا پروگرام تبدیل ہو رہا ہے۔ محترمہ کے وفد میں میرے علاوہ افتخار حسین گیلانی اور سلمان تاثیر شامل تھے۔ ہم نے دہلی میں حسبِ پروگرام راجیو گاندھی کی آخری رسومات میں شرکت کی جس میں وزیرِ اعظم پاکستان نواز شریف بھی شامل تھے۔ جب راجیو گاندھی کی چِتا جلائی گئی تو اُس وقت سونیا گاندھی کے علاوہ ان کی بیٹی پریا

، بیٹا راہول اور اداکارہ امیتابھ بچن نمایاں تھے۔ پریانکا نے اپنی والدہ کو نہایت پُر وقار انداز سے سہارا دیا ہوا تھا جو شدتِ غم سے نڈھال تھیں۔ دوسرے دن ہندوستان کے تمام اخبارات میں محترمہ بے نظیر بھٹو کو خاص طور پر جگہ دی گئی۔

دہلی میں ہمارا قیام اَشوکا ہوٹل میں تھا۔ محترمہ نے اپنے قیام کے دوران ہندوستان کے سابق صدر گیانی ذیل سنگھ، سونیا گاندھی، نرسیما راوَ، وی پی سنگھ، نٹور سنگھ اور اندر کمار گجرال سے ملاقاتیں کیں۔ اَشوکا ہوٹل میں فلسطین کے صدر یاسر عرفات سے بھی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ہمیں کہوٹہ پر اسرائیلی حملے کے خدشات سے بھی آگاہ کیا۔ ہمارے وفد کی ملاقات ہندوستان کے نگران وزیرِ اعظم چندر شیکھر سے بھی ہوئی۔ انہوں نے ہمیں اَجمیر شریف جانے کے لیے اپنا خصوصی طیارہ فراہم کیا۔ ہم راستے میں کچھ دیر کے لیے مہاراجہ جے پور کے محل 'رام باغ پیلس' میں رُکے اور دوپہر کا کھانا کھایا۔ یہ میری پسندیدہ جگہ ہے، اَب اس محل کو فائیوسٹار ہوٹل بنادیا گیا ہے۔ محترمہ نے بڑے خوشگوار موڈ میں اپنے وفد کے اراکین سے دریافت کیا کہ میرے دورِاقتدار میں میری سب سے بڑی غلطی کیا تھی؟ افتخار حسین گیلانی نے کہا کہ آپ کی ایڈمرل سروہی کے معاملے میں مداخلت بڑی غلطی تھی۔ محترمہ نے کہا کہ اس کا مجھے آپ ہی نے تو مشورہ دیا تھا۔ اس پر وہ خاموش ہو گئے۔ جب وہ میری طرف متوجہ ہوئیں تو میں نے کہا کہ آپ کی کابینہ میں وزراء کی تعداد ضرورت سے زیادہ تھی، ایسے میں کسی اہم مسئلے پر سب کی رائے لینا ممکن نہیں تھا۔ محترمہ نے کہا کہ یہ میری غلطی نہیں تھی، اگر میں دوبارہ بھی وزیرِ اعظم بنی تو اپنی کابینہ اسی طرح بناؤں گی۔ میں نے موضوع تبدیل کر دیا۔

ہم اَجمیر شریف گئے۔ سجادہ نشیں نے محترمہ کو ایک پرانا رجسٹر دکھایا جس میں سابق وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے دستخط موجود تھے اور مجھے 1956ء کا وہ رجسٹر دکھایا گیا جس میں میرے والد کے دستخط تھے۔ غالباً یہ وہ موقعہ تھا جب والد سابق ایم این اے صاحبزادی محمودہ بیگم کے بھائی سردار خورشید خان کی شادی پر ان کی بارات کے ساتھ ہندوستان گئے تھے۔ سردار صاحب انڈس ہوٹل، لاہور کے مالک ہیں۔ یہاں محترمہ نے آصف زرداری کی رہائی کے لیے بھی دعامانگی۔

1992ء میں بے نظیر بھٹو نے 'پارلیمنٹ ہاؤس' کے سامنے بھوک ہڑتالی کیمپ لگایا جس

میں حزبِ اختلاف کے تمام اراکین محترمہ کے ہمراہ بیٹھے۔ان اراکین میں سردار فاروق لغاری، مخدوم فیصل صالح حیات، جہانگیر بدر، خورشید شاہ، آفتاب شعبان میرانی، اعتزاز احسن، افتخار حسین گیلانی، آفتاب شیر پاؤ، سردار فتح محمد حسنی کے علاوہ میں بھی شامل تھا۔اس موقعہ پر اعتزاز احسن نے بہت عمدہ تقریر کی اور فیض احمد فیضؔ کی نظم سنائی جس کے چنداشعار یوں ہیں:

ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل میں لکھا ہے۔۔۔۔۔
سب تاج اُچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا
اور راج کرے گی خلقِ خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

یہ نظم فیض احمد فیضؔ نے جنوری 1979ء میں اپنے امریکہ میں قیام کے دوران لکھی تھی، اعتزاز احسن نے اپنی تقریر کے دوران پڑھے، ان اشعار سے حزبِ اختلاف کے جذبات کی صحیح ترجمانی کی۔

1992ء میں پیپلز پارٹی کی شریک چیئرپرسن اور قائد حزبِ اختلاف بے نظیر بھٹو کو سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف سے اٹلی و جرمنی میں ہونے والے سالانہ بین الاقوامی کنونشن میں شرکت کے لیے دعوت موصول ہوئی۔انہوں نے پیپلز پارٹی کی نمائندگی کے لیے میرا نام تجویز کیا۔ مجھے روم میں ڈیڑھ سو سال پرانے تاریخی 'گرینڈ ہوٹل' میں ٹھہرنے کا موقعہ ملا۔ یہ ہوٹل شہر کے وسط میں واقع ہے۔روم کے قریبی شہر ریجیو ملی میں میلے کا اہتمام کیا گیا۔اس میلے میں دنیا بھر سے مندوبین نے شرکت کی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ میلے کے ذریعے اس پارٹی نے پوری دنیا کو اپنے منشور اور پروگرام سے روشناس کروایا۔ میلے میں اٹلی کی مصنوعات کی نمائش ہوئی جس میں

ملک بھر سے بنی ہوئی مصنوعات کو نمائش کے لیے رکھا گیا۔ اس مقام کے قریب دنیا کی بہترین کار 'فراری' کے پلانٹ اور برونو مالی کی فیکٹری موجود ہیں۔

اسی دورے کے دوران میرے دیرینہ دوست شاہد رفیق نے میری دیکھ بھال اور سیر و سیاحت کے لیے اٹلی کے ایک مقامی جوڑے فلویو گوبیندوا اور ان کی اہلیہ کو مامور کیا۔ مجھے انہوں نے روم گھمایا، اس دوران وہ مجھے ویٹی کن سٹی کے سینٹ پیٹر بسلیکا (چرچ) بھی لے گئے۔ عیسائیت میں اس جگہ کو وہی اہمیت حاصل ہے جو مسلمانانِ عالم کے لیے خانہ کعبہ کی ہے۔ وہ مجھے چرچ میں لفٹ کے ذریعے ایک متعین بلندی تک لے گئے اور اس جگہ پہنچ کر کہا کہ آگے سیڑھیاں بہت تنگ ہیں، لہٰذا آپ یہاں سے آگے نہ جائیں۔ اس مقام پر چند رسیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ کچھ نوجوان سیاح رسیوں کو پکڑ کر اوپر چڑھ رہے تھے، میں نے بھی اسی طرح چھت پر پہنچ کر پورے ویٹی کن سٹی کا نظارہ کیا اور اس طرح وہ سیاحتی مقام میرے لیے یادگار بن گیا۔ میری تھکاوٹ کو مقامی جوڑے کی تحسین آمیز نظروں نے ختم کر دیا۔

سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کا دوسرا سالانہ بین الاقوامی کنونشن برلن (جرمنی) میں تھا۔ جہانگیر بدر اور میں نے اس کنونشن میں پیپلز پارٹی کی نمائندگی کی اور چند دن اکٹھے گزارے۔ یہ ایک اہم کنونشن تھا۔ ہمیں کئی عالمی لیڈروں کے علاوہ روس کے صدر گورباچوف سے بھی ملنے اور ان کے خیالات جاننے کا موقعہ ملا۔

قائدِ حزبِ اختلاف نے 1993ء میں کراچی سے لاہور تک ٹرین مارچ کا اعلان کر دیا۔ اُن کے ہمراہ پیپلز پارٹی کے سرکردہ رہنماؤں کے علاوہ نیشنل پیپلز پارٹی کے صدر اور سابق وزیرِ اعظم غلام مصطفیٰ جتوئی بھی تھے۔ ٹرین کی ملتان آمد کے وقت انتظامیہ نے ریلوے سٹیشن جانے والے تمام راستے بند کر دیے لیکن پیپلز پارٹی کے ہزاروں کارکن مختلف راستوں اور ریلوے پٹڑی کے ذریعے ریلوے سٹیشن پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ میرے ریلوے سٹیشن پہنچنے پر چاروں اطراف سے رکا ہوا عوام کا ہجوم رکاوٹیں توڑتا ہوا جلوس میں شامل ہو گیا۔ کارکنوں نے ریلوے سٹیشن پر قبضہ کر لیا اور محترمہ کی ٹرین کے آگے لیٹ گئے اور ٹرین کو کئی گھنٹے تک نہ چلنے دیا۔ بالآخر محترمہ اور غلام مصطفیٰ جتوئی نے عوام سے اپیل کی کہ ٹرین کو آگے جانے دیا جائے کیونکہ لاہور میں اُن کا استقبال ہونا تھا۔ ٹرین کو روکنا اور کارکنوں کا ٹرین کے آگے لیٹ جانا دوسرے دن کے

اخبارات کی شہ سُرخی بن گیا۔

1993ء میں قائدحزبِ اختلاف نے لانگ مارچ کا اعلان کر دیااور ملک بھر سے پیپلز پارٹی کے کارکنوں کواسلام آباد پہنچنے کی کال دی۔کارکنوں نے تیاریاں شروع کر دیں۔نواز حکومت نے گھبراہٹ میں جگہ جگہ رکاوٹیں کھڑی کردیں۔اسلام آباد کا پورے ملک سے رابطہ کاٹ دیا گیا۔میں نے پیپلز پارٹی ملتان ڈویژن کی تنظیم،اراکینِ قومی وصوبائی اسمبلی اورٹکٹ ہولڈرز کا اجلاس طلب کرلیا۔اجلاس کے بعدمیں نے پریس کلب، ملتان میں پارٹی کارکنوں کے ساتھ میٹنگ کی۔وہاں دھواں دھار تقاریر ہوئیں جس کی وجہ سے پولیس نے پریس کلب کوگھیرے میں لےلیا۔پریس کلب نے اس اقدام پرسخت احتجاج کیا، جب میرے ہمراہ پارٹی کارکن پریس کلب سے باہر آئے تو پولیس نے بسیں کھڑی کر کے روڈبلاک کر دی۔میری جیپ کے اندر سے پارٹی کے سرکردہ رہنماؤں کوگھسیٹ کر باہر نکالا گیااور سینکڑوں کارکنوں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا مگراس کے باوجود جب میں اسلام آباد کے لیے بذریعہ گاڑی روانہ ہواتو اکیلانہیں تھابلکہ ہزاروں کارکن میرے ساتھ تھے۔راستے میں جگہ جگہ رکاوٹیں کھڑی کی گئیں، درختوں کو کٹوا کر سڑکوں کو بلاک کیا گیا۔کئی جگہوں پر پیپلز پارٹی شعبۂ خواتین ملتان کی صدرمسز نسیم چوہدری (جوموجودہ ایم این اے ہیں اور بینکنگ کورٹ کی جج بھی تعینات رہ چکی ہیں) کی انتظامیہ کے ساتھ سخت جھڑپیں ہوئیں۔انہوں نے میرے لیے راستہ کھلوانے میں فعال کردارادا کیا۔قادر پورراں میں پولیس نے پیپلز پارٹی کے کئی کارکنوں کوگرفتار کرلیا جس میں صدر پیپلز پارٹی ضلع ملتان مظہرعباس راں، غلام دستگیراٹھنگل،سعادت علی کالرو،ظفراحمدراں،سعیداحمد،حاجی محمدشفیع،غفنفرعباس،سلیم رضااور اشفاق آہیر شامل تھے۔قادر پورراں میں بے دریغ لاٹھی چارج اور آنسوگیس کا استعمال کیا گیامگر عوام کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کو نہ روکا جاسکا۔بالآخرانتظامیہ نے پورے شہرقادر پورراں کی بجلی بند کردی۔جب عوام کوخبر ہوئی کہ میں تمام رکاوٹیں توڑکراُن تک پہنچ چکاہوں تو وہ بے حد خوش ہوئے۔

میں دوسرے روز بذریعہ ہوائی جہاز اسلام آباد پہنچا تو وہاں پیپلز پارٹی کے کارکن ہزاروں کی تعدادمیں موجود تھےاوراُن کے حوصلے بلند تھے۔ہم بمشکل ریلوے سٹیشن راولپنڈی تک پیدل پہنچےاور ہزاروں کارکنوں کے ہمراہ وہاں سے پیدل جلوس کی صورت میں راستے کی رکاوٹوں

کو توڑتے ہوئے لیاقت باغ پہنچ گئے جہاں محترمہ کو آنا تھا۔ ہم پر جگہ جگہ پتھراؤ، لاٹھی چارج اور آنسو گیس کا استعمال کیا گیا۔ یہیں فاروق لغاری بھی زخمی ہوئے۔ ہمیں وہاں اطلاع ملی کہ بے نظیر بھٹو رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے جلسے کی جگہ پر پہنچ گئی ہیں۔ اس طرح لانگ مارچ کامیاب ہو گیا۔

مجھے پارٹی کی طرف سے تین مرتبہ ضلع جہلم کا دورہ کرنے کا موقعہ ملا۔ پہلی مرتبہ شدید سیلاب کے دوران امدادی کام کا جائزہ لینے کے لیے، دوسری مرتبہ پیپلز پارٹی کی تنظیمِ نو کے سلسلے میں اور تیسری مرتبہ بطور کشمیر میں ہونے والے انتخابات کے موقعہ پر جانے کا اتفاق ہوا۔ اس مرتبہ میں ایم این اے چوہدری الطاف حسین (جو بعد میں گورنر پنجاب بنے) کی رہائش گاہ پر گیا۔ اُنہیں ہمراہ لے کر پولنگ سٹیشنوں کا دورہ کیا۔ ہم ایک پولنگ سٹیشن کا دورہ کرنے دینہ گئے۔ چوہدری صاحب نے پولنگ سٹیشن کے اندر جا کر جائزہ لیا۔ کچھ دیر بعد وہ تیزی سے باہر نکلے اور جیپ میں میرے ساتھ بیٹھتے ہی وہاں سے جلدی نکلنے کو کہا۔ انہوں نے راستے میں بتایا کہ وہاں دھاندلی ہو رہی تھی اور ڈیوٹی پر مامور پولیس اہلکار خود جعلی ووٹ ڈال رہے تھے جس کی وجہ سے میں نے انہیں تھپڑ مارا ہے، اَب میں نہیں چاہتا کہ آپ یہاں رکیں اور کوئی ناخوشگوار واقعہ ہو جائے۔ جب ہم واپس جہلم کے قریب پہنچے تو پولیس کی بھاری نفری نے پولیس بسوں کے ذریعے سڑک بلاک کی ہوئی تھی۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس جہلم راجہ منور نے میری جیپ کو روکا اور چوہدری صاحب کو حوالے کرنے کے لیے کہا۔ میں نے چوہدری صاحب کو پولیس کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ آپ وفاق اور صوبے کے درمیان حالات کو کشیدہ کر رہے ہیں۔ ہماری تکرار بڑھ گئی اور اس دوران دونوں اطراف سے ٹریفک رُک گئی اور عوام کی کثیر تعداد میری جیپ کے اردگرد جمع ہو گئی۔ لوگوں نے پولیس کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ کچھ نے یہاں تک کہا کہ پولیس کی بسوں کو آگ لگا دیں جس پر ڈی ایس پی گھبرا گیا اور اس نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو وائرلیس پر حالات سے آگاہ کیا۔ انہوں نے صورتِ حال کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے ہمیں جانے کی اجازت دے دی۔

دوسرے روز اخبارات کی شہ سرخی تھی کہ یوسف رضا گیلانی نے چوہدری الطاف حسین کو پولیس کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ اُن دنوں میں وفاقی حکومت کی طرف سے مصالحتی کمیٹی کی نمائندگی کر رہا تھا جو صوبائی حکومت کے ساتھ معاملات کو سلجھا رہی تھی۔ وزیرِ اعلیٰ نواز شریف نے مجھے فون کر کے اس واقعہ پر افسوس کیا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو میں

انتظامیہ کے خلاف انکوائری کرواتا ہوں۔ میں نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ جب نواز شریف کی حکومت ختم ہوئی تو چوہدری الطاف حسین کو نگران حکومت میں گورنر پنجاب بنا دیا گیا اور جب وہ پہلی مرتبہ جہلم گئے تو میں بھی ان کے ہمراہ تھا اور نگران حکومت میں وفاقی وزیر تھا۔ وہی انتظامیہ اُن کا استقبال کر رہی تھی۔

1993ء میں میرے ملائیشیا جانے سے قبل قائد حزبِ اختلاف بے نظیر بھٹو کو اُمور خارجہ کمیٹی کا چیئرپرسن بنا دیا گیا۔ میں ملائیشیا پہنچا تو مجھے اطلاع ملی کہ صدر غلام اسحاق خان نے نواز حکومت کو برطرف کر کے اسمبلی تحلیل کر دی ہے۔ مجھے محترمہ کا پیغام بھی موصول ہوا کہ میں فوراً پاکستان واپس آجاؤں۔ نواز حکومت کی برطرفی کے بعد میر بلخ شیر مزاری کو نگران وزیرِ اعظم مقرر کر دیا گیا۔ فاروق لغاری، آصف زرداری، آفتاب شیر پاؤ اور اعتزاز احسن کو وفاقی کابینہ میں شامل کر لیا گیا۔ میں واپس آیا تو مجھے محترمہ نے اعتماد میں لیتے ہوئے کہا کہ صدر اسحاق خان نے مجھ سے رابطہ کر کے اراکینِ قومی اسمبلی کے استعفے طلب کیے جو میں نے بھجوا دیے۔ محترمہ نے مزید کہا کہ میں نے صدر صاحب سے کہا ہے کہ میں خود نگران وزیرِ اعظم نہیں بننا چاہتی مگر نگران وزیرِ اعلیٰ پنجاب یوسف رضا گیلانی اور نگران وزیرِ اعلیٰ سندھ آفتاب شعبان میرانی ہوں گے جس پر انہوں نے اتفاق کیا تھا، لیکن وہ اپنے اس وعدے کا پاس نہیں کر رہے اور اَب آپ کو پنجاب کا گورنر اور آفتاب شعبان کو سندھ کا گورنر بنانا چاہتے ہیں۔ محترمہ کہنے لگیں کہ آپ نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا، مجھے اُمید ہے آپ انکار نہیں کریں گے۔ میں نے کہا کہ اگر میں گورنر بن گیا تو میرے لیے پورے دو سال انتخاب میں حصہ لینے کی پابندی لگ جائے گی۔ انہوں نے مجھے قائل کرتے ہوئے کہا کہ پارٹی اس کے لیے فیصلہ کر چکی ہے۔ محترمہ نے یہ بھی کہا کہ ہم پنجاب میں تمام سرگرمیاں آپ کے ذریعے کریں گے۔ بادلِ ناخواستہ میں نے اُن کی بات تسلیم کر لی۔ دوسرے روز محترمہ نے فون کر کے کہا کہ صدر اسحاق خان اپنے اس وعدے کو بھی پورا نہیں کر رہے، لہٰذا میں سوچ رہی ہوں کہ ہم اُن کی نگران کابینہ میں رہیں یا نہ رہیں۔ صدر اسحاق خان کے داماد، انور سیف اللہ خان سے میرے بہت اچھے مراسم ہیں۔ میں ان کے بھائی سلیم سیف اللہ خان کے ہمراہ جونیجو صاحب کی کابینہ میں وزیر رہ چکا تھا اور ان کی والدہ بھی میرے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ چوہدری الطاف حسین نے پیپلز پارٹی اور ایوانِ صدر کے درمیان پل کا کردار ادا

کیا تھا، لہٰذا ہم نے اُنہیں گورنر پنجاب بنانے کا وعدہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ صدر غلام اسحاق خان بزرگ آدمی ہیں، اُنہیں شرمندہ نہ کریں۔ اس طرح مجھے نگران کابینہ میں وفاقی وزیر بلدیات و دیہی ترقی بنا دیا گیا۔ اس دوران دیگر اضلاع کے علاوہ میں نے ملتان میں بھی کئی ترقیاتی کام کروائے جن میں ایشین ڈیویلپمنٹ بینک کے تحت 'کھیت سے منڈی تک' (دوسری مرتبہ) 100 کلومیٹر سڑکیں اور سورج میانی، ملتان میں سوئی گیس کی فراہمی شامل ہے۔

نگران وزیرِ اعظم بلخ شیر مزاری نے کابینہ کا ایک غیر رسمی اجلاس 'وزیرِ اعظم ہاؤس' اسلام آباد میں طلب کیا۔ انہوں نے میرے کزن پارلیمانی اُمور کے وفاقی وزیر سیّد تنویر الحسن گیلانی سے دریافت کیا کہ کیا نواز شریف کی اسمبلی بحال ہو گی یا نہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہم نے تمام انتظامات مکمل کر لیے ہیں، لہٰذا اُن کی اسمبلی بحال نہیں ہو گی۔ پھر انہوں نے وفاقی وزیر انور سیف اللہ سے دریافت کیا کہ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟ انہوں نے بھی سیّد تنویر الحسن سے ملتا جلتا جواب دیا۔ انہوں نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا کہ گیلانی صاحب! آپ اتنے تجربہ کار ہیں آپ کا کیا خیال ہے؟ میں نے اُن سے کہا کہ میں ان دونوں سے اتفاق نہیں کرتا۔ مغرب کی اذان کا وقت ہوا تو میں باہر جانے کے لیے اٹھا کہ مزاری صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ آپ نے تو مجھے پریشان کر دیا ہے۔ جب ہم دونوں اُن کے دفتر میں جا کر بیٹھے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ نے کیسے یہ سمجھا کہ اسمبلیاں بحال ہو جائیں گی؟ میں نے کہا کہ کل سیکرٹری دفاع کا بیان شائع ہوا تھا کہ حکومت نے انتخابات کے سلسلے میں تمام ضروری اقدامات کا حکم دے دیا ہے مگر آج کی خبروں میں آئی ایس پی آر کی طرف سے اس بیان کی تردید آئی ہے کہ فوج نے انتخابات کے سلسلے میں کسی قسم کی تیاری کا حکم نہیں دیا، میں اسی بنیاد پر آپ کے وزراء سے اتفاق نہیں کر رہا کیونکہ فوج آپ کے ساتھ نہیں ہے۔ وزیرِ اعظم کہنے لگے کہ اس کا مطلب ہے کہ صدر صاحب نے ہمیں مروا دیا ہے۔ اس کے چند دن بعد سپریم کورٹ نے نواز شریف کی حکومت بحال کر دی۔

❁❁❁

باب ہفتم

محترمہ بے نظیر بھٹو کا دوسرا دورِ حکومت (1993ء۔1996ء)

سپریم کورٹ نے نواز شریف کی حکومت بحال کر دی مگر صدر اور وزیرِ اعظم کے درمیان اختلافات کی وجہ سے ملکی حالات بحرانی کیفیت اختیار کر چکے تھے۔ اس لیے دونوں کو مستعفی ہونا پڑا۔ چیئرمین سینٹ وسیم سجاد قائم مقام صدر اور امریکہ میں مقیم ٹیکنوکریٹ معین قریشی کو بلا کر نگران وزیرِ اعظم بنا دیا گیا جنھوں نے 1993ء کے عام انتخابات کروائے۔

ان انتخابات سے قبل پیپلز پارٹی کے پارلیمانی بورڈ کا اجلاس لاہور میں بے نظیر بھٹو کی صدارت میں ہوا۔ مجھے میرے روایتی حلقۂ انتخاب سے پارٹی ٹکٹ دے دیا گیا۔ جب حلقہ مخدوم رشید، جہانیاں کے متعلق رائے مانگی گئی تو ملتان سے پیپلز پارٹی کے ضلعی صدر مظہر راں نے فاروق لغاری سے صلاح و مشورہ کیا۔ فاروق لغاری محترمہ کے قریب بیٹھے ہوئے تھے، محترمہ نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ اس حلقے سے بھی یوسف رضا ہی انتخاب میں حصہ لیں گے۔

اس انتخاب سے قبل میری شاہ محمود کے ساتھ ضلع کونسل، ملتان کی حد تک مفاہمت تھی۔ جس کی وجہ سے مظہر راں خاصے پریشان تھے کیونکہ وہ شاہ محمود کے حریف تھے۔ مظہر راں چاہتے تھے کہ اگر یوسف رضا اور شاہ محمود ایک دوسرے کے مدِ مقابل قومی اسمبلی کی ایک ہی نشست کے لیے انتخاب میں حصہ لیں تو وہ صوبائی اسمبلی کی نشست پر شاہ محمود کا مقابلہ کریں گے ورنہ نہیں۔

انھی انتخابات میں گورنر پنجاب چوہدری الطاف حسین اور وزیرِ اعلیٰ پنجاب منظور احمد وٹو نے مجھ سے سفارش کی کہ میں اپنے حریف سکندر بوسن کو اپنے حلقۂ انتخاب سے صوبائی اسمبلی کی

نشست کے لیے پیپلز پارٹی کا ٹکٹ دلواؤں کیونکہ انہوں نے وزیرِ اعلیٰ غلام حیدر وائیں کے خلاف تحریکِ عدم اعتماد کے موقعہ پر پیپلز پارٹی کے اتحادی منظور وٹو کا ساتھ دیا تھا۔ میں نے یہ تجویز پیپلز پارٹی کی مقامی تنظیم کے سامنے رکھی تو انہوں نے اس بنیاد پر اختلاف کیا کہ محترمہ کے دورۂ نواب پور، ملتان کے موقعہ پر سکندر بوسن نے اُن پر حملہ کروایا تھا۔

دوسری طرف شاہ محمود مسلم لیگ سے مطالبہ کر رہے تھے کہ انہیں جاوید ہاشمی کی جگہ ٹکٹ دیا جائے۔ نواز شریف نے نہ صرف ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا بلکہ یہ بھی کہا کہ آپ گزشتہ کئی برسوں سے یوسف رضا کے حلقے کے لیے صوبائی حکومت سے ترقیاتی سکیموں کے فنڈز لیتے رہے ہیں، لہٰذا آپ ہی اس حلقے سے انتخاب میں حصہ لیں۔ شاہ محمود نے ہماری ضلع کونسل، ملتان کی سطح پر مفاہمت کی وجہ سے انکار کر دیا۔

یہ بات جب میرے علم میں آئی تو میں نے اپنی اہلیہ کی کلاس فیلو اور شاہ محمود کی کزن مسز نوشینہ نعیم عطا سے کہا کہ وہ میری اور شاہ محمود کی ملاقات کا اہتمام کریں۔ اُنہوں نے اپنی رہائش گاہ کینٹ، لاہور جسے ہم codeword میں جنیوا کہتے تھے، پر ہماری ملاقات کروائی۔ شاہ محمود مُصر تھے کہ وہ ہر حال میں جاوید ہاشمی کے مقابلے میں حصہ لینا چاہتے ہیں، خواہ آزاد اُمیدوار کے طور پر ہی کیوں نہ ہو۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو مسلم لیگ کا ووٹ تقسیم ہونے کی صورت میں فائدہ پیپلز پارٹی کو ہوگا، لہٰذا اگر وہ پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب میں حصہ لیں تو میں اُن کے لیے یہ حلقہ چھوڑ دوں گا۔ ہم اس بات پر متفق ہو گئے۔ میں نے جب یہ تجویز محترمہ کو دی تو انہوں نے کہا کہ شاہ محمود نہ صرف اپنے لیے بلکہ اپنے بھائی مرید حسین کے لیے بھی صوبائی اسمبلی کی نشست قادر پور راں سے پارٹی ٹکٹ کے خواہاں ہیں، ہم اُنہیں صرف ایک ہی ٹکٹ دے سکتے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ میں اپنے ضلعی صدر مظہر راں کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ میں نے کہا کہ اگر ہم مرید حسین کو نظر انداز کرتے ہیں تو ہو سکتا ہے وہ پیپلز پارٹی کی مخالفت کریں اور اس طرح ہم ان کی مکمل حمایت سے محروم ہو جائیں جس کا فائدہ ہر حال میں مخالفین اٹھائیں گے۔ فاروق لغاری اور میں نے محترمہ کو تجویز دی کہ ہم انتخابات کے بعد مظہر راں کو اقتدار میں شامل کر لیں گے۔ محترمہ نے ہماری اس تجویز سے بمشکل اتفاق کیا۔ انہوں نے مجھے اور فاروق لغاری کو مظہر راں کے پاس 'غازی علم الدین شہید ہوسٹل' اسلام آباد بھیجا۔ ہم نے اُن سے وعدہ

کیا کہ اگر پیپلز پارٹی کی حکومت بنتی ہے تو انتخاب میں حصہ لیے بغیر اُن کی کار پر جھنڈا لگوا دیں گے جس پر وہ راضی ہو گئے۔ شاہ محمود نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور وہ جاوید ہاشمی کے مقابلے میں انتخاب بھی جیت گئے۔ دوسری طرف میرا مقابلہ سکندر بوسن کے ساتھ ہوا۔ میرے صوبائی اسمبلی کے لیے اُمیدوار سیّد ناظم حسین، اسحاق بُچہ اور مرید حسین تھے۔ میں بھاری اکثریت سے جیت گیا اور میرے تینوں صوبائی اسمبلی کے اُمیدوار بھی کامیاب ہو گئے۔

انہی دنوں مجھے والدہ نے بڑی سادگی سے بتایا کہ مسز نسیم چوہدری، شاہ محمود کو میرے پاس لے کر آئیں کہ میں اُن کی کامیابی کے لیے دعا کروں، لہٰذا میں نے اُن کے لیے دعا کی ہے۔ والدہ نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں نے صحیح کیا ہے کہ نہیں؟ میں نے جواب دیا کہ آپ نے صحیح کیا ہے کیونکہ وہ بھی پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مسز نسیم چوہدری کو چاہیے تھا کہ وہ آپ کو بھی اعتماد میں لیتیں۔ میں نے ازراہِ مذاق کہا کہ آپ کو بھی تو مجھے بتانا چاہیے تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گئیں اور پھر بولیں کہ وہ اچھے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اُمید ہے کہ آپ کے ساتھ ٹھیک رہیں گے۔

میں اور شاہ محمود محترمہ کو انتخابات میں کامیابی پر مبارکباد دینے 'گلزار ہاؤس' لاہور گئے۔ 'گلزار ہاؤس' کا ڈرائنگ روم بھرا ہوا تھا اور وہ پریس کانفرنس میں مصروف تھیں۔ میں نے اُن کو چٹ بھیجی۔ انہوں نے اپنی پولیٹیکل سیکرٹری مس ناہید خان کو بلا کر کچھ کہا اور دیکھتے ہی دیکھتے ڈرائنگ روم بالکل خالی ہو گیا۔ محترمہ نے پیغام بھیجا کہ ہم دونوں دوپہر کا کھانا انہی کے ساتھ کھائیں۔ دوپہر کے کھانے پر ہمارے علاوہ پارٹی کے چند سرکردہ رہنماؤں نے بھی شرکت کی، اسی دوران محترمہ نے ہم سے صلاح ومشورہ بھی کیا۔ میں نے اُن سے کہا کہ ہمیں سب سے پہلے سپیکر قومی اسمبلی کے اُمیدوار کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ جس پر محترمہ نے فوری طور پر پیپلز پارٹی کی پارلیمانی پارٹی کا اجلاس اسلام آباد میں ڈاکٹر نیازی کی رہائش گاہ پر طلب کر لیا۔

میں اُس اجلاس کے دوران پچھلی صفوں میں بیٹھا ہوا تھا کہ فاروق لغاری میرے پاس آئے اور کہا کہ محترمہ آپ کو اندر بلا رہی ہیں۔ میں اُن کے ساتھ ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچا تو فاروق لغاری نے دروازہ کھول کر مجھے اندر جانے کو کہا اور جب میں نے مُڑ کر دیکھا تو دروازہ بند ہو چکا تھا اور وہ نہیں تھے۔ ڈرائنگ روم میں دو سابق وزرائے اعظم بے نظیر بھٹو اور میر بلخ

شیر مزاری تشریف فرما تھے۔ مجھے دیکھتے ہی محترمہ نے مزاری صاحب سے کہا کہ آپ گیلانی صاحب سے بات کریں۔ مزاری صاحب نے انہیں کہا کہ مناسب ہوگا کہ آپ ان سے خود بات کریں۔ محترمہ نے مجھ سے کہا کہ گیلانی صاحب! آپ نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا ہے اور کبھی مایوس نہیں کیا، میں آپ سے ایک گزارش کرنا چاہتی ہوں، اُمید ہے کہ آپ اب بھی مجھے مایوس نہیں کریں گے۔ مزید کہا کہ ہم آپ کو قومی اسمبلی کا سپیکر بنانا چاہتے ہیں اور آپ انکار نہیں کریں گے۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ میرے تصور میں سپیکر کے لیے بزرگ ہونا، سفید بال، ہمہ جہت اور اچھا وکیل ہونا ضروری تھا اور سب سے بڑھ کر اُسے آئندہ انتخابات میں حصہ بھی نہ لینا ہو۔ مجھے اپنی کم علمی اور کم گو ہونے کا احساس بھی تھا۔ میں نے اپنے ان دلائل کے پیشِ نظر انکار کر دیا۔ میرا جواب سن کر انہوں نے کہا کہ کیا گوہر ایوب بطور سپیکر انتخاب نہیں جیتے تھے؟ میں نے کہا کہ ان کا حلقۂ انتخاب اسلام آباد کے قریب ہے اور دوسرا نواز شریف نے اُن سے ذاتی دوستی کی بنا پر ان کے حلقۂ انتخاب میں بہت کام کیے تھے، اس لیے میں اپنا موازنہ ان کے ساتھ نہیں کر سکتا۔ محترمہ نے کہا کہ میرے آپ کے ساتھ جتنے تعلقات ہیں میں میاں صاحب سے کہیں زیادہ کام آپ کے حلقے میں کروں گی (جو آگے چل کر ثابت بھی کر دکھایا)۔ انہوں نے کہا کہ آپ ایک تجربہ کار اور بااعتماد ساتھی ہیں، میں سپیکر کا عہدہ کسی ایسے شخص کو نہیں دے سکتی جو قابلِ اعتماد نہ ہو۔ اور مزید کہا کہ این ڈی خان نے ڈپٹی سپیکر بننے سے انکار کر دیا ہے کیونکہ وہ وفاقی وزیر بننا چاہتے ہیں۔ اُن کے اس انکار پر محترمہ نے بُرا منایا اور ڈپٹی سپیکر قومی اسمبلی کے لیے سیّد ظفر علی شاہ کا نام تجویز کیا۔

میں اور ظفر علی شاہ، محمد خان جونیجو کی کابینہ میں وفاقی وزیر رہ چکے تھے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ محترمہ نے اُن کا نام تجویز کیا۔ وہ نہایت نفیس، تجربہ کار پارلیمنٹیرین اور سلجھے ہوئے سیاستدان ہیں۔ جب میں نے محترمہ کی خواہش پر رضامندی کا اظہار کیا تو انہوں نے کہا کہ آپ یہ بات کسی کو نہ بتائیں، میں باہر آ کر سب کو اعتماد میں لیتی ہوں۔ جب وہ پارٹی میٹنگ میں شریک ہوئیں تو اراکینِ قومی اسمبلی سے دریافت کیا کہ سپیکر قومی اسمبلی کس کو ہونا چاہیے؟ کوئی خاطر خواہ جواب نہ آیا۔ انہوں نے کہا کہ میری نظر میں سپیکر کا عہدہ بڑے صوبے پنجاب کو جانا چاہیے، سپیکر تجربہ کار اور کم از کم چار پانچ مرتبہ ایم این اے رہ چکا ہو اور مزید کہا کہ اس مرتبہ حزبِ اختلاف خاصی مضبوط

ہو گی کیونکہ اُن کے ہاں نہایت تجربہ کار سیاستدان موجود ہیں، اس لیے سپیکر کو نوجوان ہونا چاہیے۔ محترمہ نے نہایت بُردباری کے ساتھ کہا کہ میں نہیں چاہتی کہ اس عہدے کے لیے پارٹی کو تقسیم کیا جائے، لہٰذا آپ سب مجھے اپنے پسندیدہ اُمیدوار کا نام پرچی پر لکھ کر دیں۔ اراکینِ قومی اسمبلی باری باری اپنی پرچی انہیں دیتے گئے اور وہ اپنے پرس میں رکھتی گئیں۔ انہوں نے گنتی کے بعد بہت خوشی کے ساتھ اعلان کیا کہ یوسف رضا کے حق میں رائے دی گئی ہے۔ مجھے باضابطہ پیپلز پارٹی کی طرف سے سپیکر قومی اسمبلی نامزد کر دیا گیا۔

سپیکر کے انتخاب کے روز میری جانب سے سابق وزیرِ دفاع/ وزیرِ اعلیٰ سندھ آفتاب شعبان میرانی اور سابق وفاقی وزیرِ خزانہ نوید قمر پولنگ ایجنٹ مقرر ہوئے۔ جب گنتی ہوئی تو مجھے ایک سو چھ اور گوہر ایوب خان کو نوے ووٹ ملے۔ اس اجلاس کی صدارت محمود خان اُچکزئی نے کی جو صوبہ بلوچستان سے تعلق رکھتے ہیں اور سیاسی طور پر ان کی وابستگی پختون خواہ ملی عوامی پارٹی سے ہے۔ اُچکزئی صاحب دلیر، نہایت تجربہ کار اور سلجھے ہوئے سیاستدان ہیں۔ انہوں نے میری حلف برداری کی تقریب کے فرائض بھی انجام دیے اور اس طرح میں دنیا میں اُس وقت کم عمر سپیکر منتخب ہوا۔

سپیکر قومی اسمبلی منتخب ہونے کے فوراً بعد بے نظیر بھٹو، بیگم نصرت بھٹو، فاروق لغاری، نوابزادہ نصر اللہ خان اور حامد ناصر چٹھہ میرے چیمبر میں تشریف لائے اور مجھے کامیابی پر مبارکباد دی۔ میں اس ملاقات کے بعد محترمہ کو رخصت کرنے کے لیے لفٹ کے ذریعے کار پارکنگ تک گیا۔ اس دوران انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ گیلانی صاحب! آج پارٹی میٹنگ وعشائیے میں شرکت کے لیے آپ کس وقت تشریف لا رہے ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ سپیکر غیر جانب دار ہوتا ہے اس لیے میں پارٹی میٹنگ میں شامل نہیں ہوں گا۔ یہ میٹنگ وزیرِ اعظم کے چناؤ کے لیے خصوصی طور پر رکھی گئی تھی۔ محترمہ نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا پارٹی اجلاس میں شرکت کرنے پر کوئی ممانعت ہے؟ میں نے جواب دیا کہ نہیں' مگر یہ اچھی روایت بھی نہیں۔ انہوں نے کہا کہ گوہر ایوب ایسا کرتے رہے تھے۔ میں نے جواب دیا کہ یہ غلط روایت تھی۔

محترمہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئیں۔ میں نے انہیں رخصت کرتے ہوئے کہا کہ میں پارٹی میٹنگ کے اختتام پر عشائیے میں شرکت کروں گا۔ انہوں نے میرا جواب سن کر اطمینان

کا اظہار کیا اور کہا کہ ہم آپ کو مطلع کر دیں گے۔ محترمہ طے شدہ پروگرام کے تحت پیپلز پارٹی اور اُس کی اتحادی جماعتوں کی میٹنگ میں شامل ہوئیں۔ میٹنگ کے اختتام پر مجھے عشائیے میں مدعو کیا گیا۔ جب میں وہاں پہنچا تو اراکینِ قومی اسمبلی نے میرا بھرپور استقبال کیا اور میرے اس جمہوری اقدام کو سراہا۔ محترمہ نے بھی محسوس کیا کہ میرا فیصلہ درست تھا۔

چند دنوں بعد وزیرِاعظم کے عہدے کے لیے انتخاب ہوا اور محترمہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوگئیں۔ منتخب ہونے کے فوراً بعد وزیرِاعظم میرے چیمبر میں دوسری مرتبہ تشریف لائیں۔ حسبِ سابق میں اُنہیں رخصت کرنے کے لیے لفٹ کے ذریعے کار پارکنگ جا رہا تھا کہ انہوں نے مجھ سے کہا کہ گیلانی صاحب! اس مرتبہ میں نے اپنی کابینہ مختصر بنائی ہے۔ میں نے خوشگوار لہجے میں جواب دیا کہ میں نے آپ کو اتنی مختصر کابینہ کا مشورہ نہیں دیا تھا۔ یہ بات انہوں نے اُس گفتگو کے تناظر میں کی جو انہوں نے ہمارے ساتھ 'رام باغ پیلس' جے پور، ہندوستان میں کی تھی۔ محترمہ نے سوال کیا کہ گیلانی صاحب! صدر کس کو ہونا چاہیے؟ میں نے نوابزادہ نصراللہ خان کا نام تجویز کیا۔ انہوں نے اس کے حق میں کچھ دلائل مانگے تو میں نے کہا کہ جب 1988ء میں صدرِمملکت کے چناؤ کے لیے دونوں بڑی جماعتیں غلام اسحاق خان کی حمایت کر رہی تھیں تو اُس وقت اُن کے مقابلے میں نوابزادہ صاحب نے بانوے ووٹ حاصل کیے تھے اور دوسرا وہ ہمیشہ پارلیمنٹ کی بالادستی قائم رکھنے کے لیے کام کریں گے اور قومی اسمبلی تحلیل نہیں کریں گے۔ بالکل ایسی ہی بات میں نے جنرل جہانگیر کرامت کے متعلق بھی کی تھی، جب اُنہیں چیف آف آرمی سٹاف بنایا جا رہا تھا۔ محترمہ نے میری نوابزادہ صاحب کے متعلق رائے سن کر کہا کہ مجھے اپنی ڈائری میں اُن کا نام لکھنے دیں۔ انہوں نے اپنی ڈائری کھولی اور نام لکھنے لگیں تو میری نگاہ اُن کی ڈائری پر پڑی۔ انہوں نے اپنی ڈائری چھپا لی اور مسکرا کر کہنے لگیں کہ میں باقی نام آپ کو نہیں دیکھنے دوں گی۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ محترمہ نے نوابزادہ صاحب کو پیغام بھیجا تھا کہ وہ پیپلز پارٹی اور اسلامی جمہوری اتحاد کے متفقہ صدارتی اُمیدوار بن جائیں۔ اُس وقت نوابزادہ صاحب کا سیاسی تعلق نواز شریف سے تھا۔ میاں صاحب نے نوابزادہ صاحب سے کہا کہ میں صدارت کے لیے وسیم سجاد کو نامزد کر چکا ہوں۔ اس کے بعد محترمہ نے آفتاب شیر پاؤ اور فاروق لغاری کی

مشاورت سے فاروق لغاری کو صدرِ مملکت کے عہدے کے لیے نامزد کردیا۔ جب صدارتی انتخاب کے دوران نواز شریف کو اپنے اُمیدوار کی کامیابی کے آثار کم دکھائی دیئے تو انہوں نے پیر صاحب پگاڑو کے ذریعے وسیم سجاد کی جگہ نوابزادہ صاحب کو اپنا اُمیدوار بنانا چاہا جس پر نوابزادہ صاحب نے انکار کردیا اور فاروق لغاری کی حمایت کا اعلان کردیا۔ اس طرح فاروق لغاری بھاری اکثریت سے صدرِ مملکت منتخب ہو گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور کے بعد پیپلز پارٹی کی یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔

میرے سپیکر کا عہدہ سنبھالنے پر اراکینِ قومی اسمبلی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نواب اکبر بگٹی نے میرے لیے بلوچی زبان میں خیالات کا اظہار کیا تو ایک ایم این اے نے میری رولنگ طلب کی کہ کیا کوئی رکن اردو یا انگریزی کے علاوہ بھی کسی زبان میں خطاب کرسکتا ہے؟ مجھے سیکرٹری جنرل قومی اسمبلی خان احمد گورایہ نے اشارتاً کہا کہ کرسکتا ہے۔ میں نے یہی رولنگ دے دی۔ اپنے چیمبر میں جا کر میں نے تمام سابقہ رولنگز کا مطالعہ کیا اور دوسرے روز دوران اجلاس رولنگ دی کہ میں نے کل ایوان کے ایک معزز رکن کو علاقائی زبان میں خیالات کے اظہار کی اجازت اس لیے دی کیونکہ یہ ایسا موقعہ تھا کہ وہ اپنے جذبات کی بہتر ترجمانی کسی اور زبان میں نہیں کر سکتے تھے، تاہم اسے آئندہ کے لیئے روایت نہ بنایا جائے۔ جب میں اپنے چیمبر میں پہنچا تو فون کی گھنٹی بجی اور فون پر گرجدار لہجے میں کہا گیا کہ سپیکر صاحب! آپ نے نواب اکبر بگٹی کو بلوچی زبان میں تقریر کرنے کی اجازت کیوں دی، اس کا فوج نے بہت بُرا منایا ہے۔ اس سے پیشتر کہ میں کوئی جواب دے پاتا فون بند ہوگیا۔

پیپلز پارٹی کی حکومت بننے پر میں نے بطورِ سپیکر اراکینِ قومی اسمبلی کے اعزاز میں میریٹ ہوٹل، اسلام آباد میں استقبالیہ دیا جس میں صدر، وزیرِ اعظم، گورنر اور چاروں وزرائے اعلیٰ شریک ہوئے۔ مظہر راں عین کھانے کے وقت پہنچے۔ اُس وقت میرے ایک طرف صدر اور دوسری طرف وزیرِ اعظم تشریف فرما تھیں۔ میں نے صدر صاحب کو اعتماد میں لیا اور وزیرِ اعظم کو مظہر راں سے دورانِ انتخاب کیا ہوا وعدہ یاد دلایا۔ وزیرِ اعظم نے مجھے جواب دیا کہ آپ انہیں اپنا مشیر مقرر کریں۔ میں نے کہا کہ ہمارا وعدہ اُن کی گاڑی پر جھنڈا لگوانے کا تھا اور میرے مشیر کو یہ سہولت نہیں ہوتی، لہٰذا انہیں وزیرِ اعلیٰ پنجاب کا مشیر مقرر کروائیں۔ وزیرِ اعظم نے اُسی وقت

وزیرِ اعلیٰ پنجاب منظور احمد وٹو کو بلا کر مظہر راں کو مشیر بنانے کا کہا۔ چند دنوں بعد وہ مشیر مقرر ہو گئے۔ اس طرح ہم نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ آج کل وہ مسلم لیگ (نواز گروپ) کے سرگرم رکن ہیں۔

1988ء میں بےنظیر بھٹو کی حکومت نے دولتِ مشترکہ کا دوبارہ رُکن بننے کے بارے میں اہم فیصلہ کیا۔ اُس وقت کے سپیکر قومی اسمبلی ملک معراج خالد نے اس قرارداد کو اسمبلی سے پاس کروالیا مگر 1990ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت ختم ہونے پر اسلامی جمہوری اتحاد کے سربراہ نواز شریف وزیرِ اعظم اور گوہر ایوب خان قومی اسمبلی کے سپیکر منتخب ہو گئے۔ کامن ویلتھ پارلیمنٹری ایسوسی ایشن (سی پی اے) کی رکنیت حاصل کرنے کے لیے قانونی تقاضا تھا کہ سینٹ بھی قرارداد پاس کرے مگر یہ قرارداد سینٹ سے اس لیے پاس نہ ہو سکی کہ چیئر مین سینٹ وسیم سجاد اور سپیکر قومی اسمبلی گوہر ایوب خان کی اس بات پر ٹھن گئی کہ سی پی اے کا رکن بننے کی صورت میں قیادت کون کرے گا؟

1993ء میں پاکستان پیپلز پارٹی دوبارہ اقتدار میں آ گئی۔ بےنظیر بھٹو وزیرِ اعظم اور میں سپیکر قومی اسمبلی منتخب ہو گیا۔ سیکرٹری قومی اسمبلی نے مجھے سینٹ کے پاس التواء میں پڑی قرارداد کے بارے میں بریف کیا۔ میرے وسیم سجاد سے اچھے تعلقات تھے اور میں نے 1985ء میں سینٹ میں ٹیکنو کریٹ کی نشست پر اُن کی مدد کی تھی۔ وہ مجھے کہا کرتے تھے کہ آپ بادشاہ گر ہیں۔ میں نے اس قرارداد کے سلسلے میں اُن سے ملاقات کی اور ہمارے درمیان طے پا گیا کہ سی پی اے کے وفود کی قیادت ہم باری باری کریں گے جبکہ ہر تیسرے آئی پی یو کے وفد کی قیادت چیئر مین سینٹ کریں گے۔ سینٹ نے قرارداد پاس کر دی۔ اس طرح ہم سی پی اے کے رکن بن گئے۔ مجھے سی پی اے کا وائس چیئر مین (ایشین ریجن) منتخب کر لیا گیا جس کی تجویز ہندوستان نے دی تھی۔ اس طرح پاکستان نے سی پی اے میں فعال کردار ادا کیا۔ قومی اسمبلی کی بے حد مصروفیت کے پیشِ نظر میں چند دوروں میں شرکت نہ کر سکا جن کی قیادت چیئر مین سینٹ نے کی جبکہ 1995ء میں قبرص میں سپیکرز اور پریذائیڈنگ آفیسرز کی ہونے والی کانفرنس میں ہم دونوں نے اکٹھے شرکت کی۔

1994ء میں مجھے چین کی پارلیمنٹ کی طرف سے دورے کی دعوت ملی۔ میں نے اپنے

وفد میں پیر آفتاب شاہ جیلانی، علی اکبر وینس، بابو غلام حسین، حاجی محمد یعقوب خان، عبدالرؤف خان لغمانی اور نسیم خالد کو شامل کیا۔ ہمیں کئی ریاستوں میں لے جایا گیا۔ دیوارِ چین اور طیارہ ساز فیکٹری کا معائنہ خصوصی طور پر کروایا گیا۔ اس دورے میں ہمارے وفد کو لوشاں ماؤنٹین بھی لے جایا گیا۔ یہ جگہ تخلیق کاروں کے لیے جنت تصور کی جاتی ہے کیونکہ اس جگہ سے چین کے شعراء نے بہت نام کمایا تھا۔ معمارِ انقلابِ چین ماؤزے تنگ بھی شاعر تھے۔ لوشاں ماؤنٹین کے دورے کے موقعہ پر مقامی انتظامیہ نے مجھے پیغام لکھنے کو کہا تو میں نے وہ پیغام اشعار کی صورت میں لکھا:

"What little life I know

Is full of colours of a rainbow

On the horizon it appears for few hours

Who knows where, then, it goes"

ترجمہ: وہ مختصر سی زندگی جس کا مجھے علم ہے وہ قوس وقزح کے رنگوں سے بھری ہوئی ہے، یہ اُفق پر چند گھنٹوں کے لیے نمودار ہوتی ہے، کون جانتا ہے پھر یہ کہاں چلی جاتی ہے۔

لوشاں ماؤنٹین اپنے محلِ وقوع کے حوالے سے اپنے اندر بہت جاذبیت رکھتا ہے۔ اس جگہ کے متعلق ایک کہاوت یہ بھی مشہور ہے کہ

"Nobody has seen the other side of the mountain."

ترجمہ: آج تک کسی نے اس پہاڑ کی دوسری طرف نہیں دیکھا۔

اس کی وجہ وہاں سال بھر دھند کا طاری رہنا ہے۔

دورۂ چین کے دوران ہمیں 'پیانو سٹی' لے جایا گیا۔ وہاں ایک خاص وقت میں پوری آبادی سے پیانو کی بڑی دلفریب اور مُدھر آوازیں آتی ہیں۔ امریکہ کے صدر رچرڈ نکسن بھی وہاں جاچکے تھے۔ وہ لمحے ہمارے لیے سحر انگیزی اور دلکشی کا منفرد تجربہ تھے۔ اسی پیانو سٹی میں پہاڑ کی چوٹی پر ایک مقام ایسا بھی ہے جس تک پہنچنا سخت چڑھائی کے سبب دشوار ہے۔ وہاں مشہور ہے کہ صرف بہادر لوگ ہی چوٹی تک پہنچ سکتے ہیں۔ میں بھی کوشش کر کے اُس چوٹی تک پہنچ گیا، وہاں کی انتظامیہ نے میرا استقبال کیا۔ دورے کے اختتام پر میری ملاقات وزیرِ اعظم لی پنگ سے کروائی گئی۔ چینی وزیرِ اعظم نے میری ملاقات کے دوران کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ میرا دوست

مجھے ملے بغیر چلا جائے، لہٰذا میں آپ کے جہاز کو رکوا کر آپ سے ملاقات کر رہا ہوں، میں آپ کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ میری یادداشت اتنی کمزور نہیں ہوئی کہ میں آپ کو بھول جاؤں، مجھے یاد ہے کہ میرے دورۂ پاکستان 1989ء میں آپ میرے وزیرِ مہمانداری رہ چکے ہیں۔ ہماری گفتگو عالمی سیاست اور خصوصاً جنوبی ایشیاء کے حوالے سے ہوئی جس میں مسئلہ کشمیر سرِ فہرست تھا۔ بعد میں وہ چین کی نیشنل پیپلز کانگریس کے چیئر مین (سپیکر) منتخب ہوئے۔

1994ء میں قومی اسمبلی میں شارٹ سرکٹ کی وجہ سے آگ لگ گئی۔ میں فوراً موقعہ پر پہنچ گیا۔ آگ بجھانے والے اپنی کوشش کر رہے تھے اور میری نظریں پاکستان کے پرچم پر لگی ہوئی تھیں جو پارلیمنٹ کی عمارت پر لہرا رہا تھا۔ مجھے بچپن سے آج تک اگر کسی چیز سے جنون کی حد تک لگاؤ (obsession) ہے تو وہ پاکستان کا پرچم ہے۔ سی ڈی اے کی لمبی لمبی کرینوں کے ذریعے اور سیڑھیاں لگا کر آگ بجھانے والا عملہ پارلیمنٹ کی چھت تک تو پہنچ جاتا مگر اُن کے لیے تپش کے باعث وہاں رکنا مشکل ہو جاتا۔ آگ پر قابو پانے تک قومی اسمبلی کا چیمبر جل کر راکھ ہو گیا مگر پاکستان کا پرچم سلامت رہا۔ قومی اسمبلی میں آگ لگنے کے بعد مجھے سب سے زیادہ دکھ قائداعظم محمد علی جناح کے پورٹریٹ کے جلنے کا تھا۔

جب میں نے چیئر مین سی ڈی اے سے قائداعظمؒ کی تصویر کے خالق کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ جس شخصیت نے بابائے قومؒ کا پورٹریٹ بنایا تھا، وہ اتفاق سے میرا دوست ہمایوں طلعت تھا۔ سی ڈی اے نے قومی اسمبلی کے ہال کی از سرِ نو تعمیر کے دوران ہمایوں طلعت سے قائداعظمؒ کی موجودہ تصویر بنوائی جو سپیکر کی نشست کے پیچھے دیوار پر لگائی گئی ہے۔ میں نے اُن سے بابائے قومؒ کی تصویر بنوانے کے علاوہ قائدِاعظم سے تب تک کے تمام پریذائیڈنگ آفیسرز و سپیکرز کی تصاویر بنوائیں جو سپیکرز گیلری میں آویزاں ہیں اور ہماری پارلیمانی تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔

قومی اسمبلی میں آگ لگنے کے چند روز بعد وزیرِ اعظم میرے دفتر تشریف لائیں۔ انہوں نے چیئر مین سی ڈی اے سعید مہدی کو معطل کرنے کا فیصلہ سنایا اور ساتھ ہی مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں اسمبلی میں آگ لگنے کی پاداش میں قومی اسمبلی کے سیکرٹری جنرل خان احمد گورایہ کو معطل کر کے اُن کے خلاف انکوائری کرواؤں۔ مجھے محترمہ نے اپنے پرنسپل سیکرٹری احمد صادق کے

ذریعے بھی قائل کرنے کی کوشش کی کہ رولزآف بزنس کے مطابق قومی اسمبلی میں آگ لگنے کی ذمہ داری سیکرٹری جنرل کی بنتی ہے مگر میں نے اتفاق نہ کیا۔ وزیرِ اعظم نے اسٹیبلشمنٹ ڈویژن کے ذریعے خان احمد کو اُن کے اپنے محکمے میں repatriate* کر کے معطل کر دیا۔ دراصل حکومت میں صرف گورا یہ ہی وہ واحد سیکرٹری تھے جو سیکرٹری جنرل کہلاتے تھے۔ روایتی سیکرٹری جنرل کا عہدہ وزیرِ اعظم کے پرنسپل سیکرٹری یا اسٹیبلشمنٹ سیکرٹری کا ہوتا ہے، اس لیے پرنسپل سیکرٹری انہیں برداشت نہیں کر رہے تھے۔

میرا چیئرمین سی ڈی اے سعید مہدی کے چھوٹے بھائی علی عارف سے پرانا تعلق ہے۔ اُن کا تعلق محکمہ ریلوے سے تھا۔ میں نے 1986ء میں بطورِ وفاقی وزیرِ ریلوے انہیں اپنا سٹاف افسر مقرر کیا۔ انہیں اپنے کام میں بڑی مہارت تھی۔ 1988ء میں جب نواز شریف وزیرِ اعلیٰ پنجاب بنے تو انہوں نے بھی علی عارف کو اپنے سٹاف میں شامل کیا۔ پیپلز پارٹی کے دور میں اسٹیبلشمنٹ ڈویژن میں واضح گروپنگ تھی، پرنسپل سیکرٹری نے وزیرِ اعظم کو مشورہ دیا کہ علی عارف، میاں صاحب کے پرنسپل سیکرٹری کا بھائی ہے، لہٰذا اسے اسمبلی میں نہیں ہونا چاہیے۔ اس پر وزیرِ اعظم نے مجھ سے علی عارف کو قومی اسمبلی سے ہٹانے کا مطالبہ کر دیا۔ میں نے انہیں قائل کرنے کی بہت کوشش کی کہ وہ فرض شناس افسر ہے۔ لیکن انہوں نے اتفاق نہ کیا۔ دوسرے روز علی عارف خود میرے پاس آئے اور میرا شکریہ ادا کیا کہ میں اُن کے بارے میں اچھی رائے رکھتا ہوں اور ساتھ ہی اپنے تبادلے کی اجازت چاہی جو میں نے دے دی۔

سپیکر قومی اسمبلی منتخب ہونے کے بعد میں نے پہلا دورہَ آسٹریلیا 1993ء میں کیا۔ میرے ساتھ وفد میں اراکینِ قومی اسمبلی جاوید علی شاہ اور میاں ممتاز احمد تیانہ کے علاوہ سینیٹر راشد ربانی، سینیٹر طارف خان مندوخیل اور سیکرٹری جنرل قومی اسمبلی خان احمد شامل تھے۔ ہمیں دارالخلافہ کینبرا میں 'پارلیمنٹ ہاؤس' لے جایا گیا جہاں ہمارا استقبال چیئرمین سینٹ اور سپیکر نے اکٹھے کیا۔ ہمیں سینٹ کے اجلاس کی کارروائی دکھائی گئی۔ مجھے سٹیج پر چیئرمین سینٹ کے ہمراہ اور دیگر اراکینِ وفد کو سینٹ ہال کے اندر بٹھایا گیا جو ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔

اس دورے کے دوران ہمارا وفد سڈنی، میلبورن، مورے اور تسمانیہ بھی گیا۔ سڈنی

* اصل محکمہ جس میں سرکاری ملازم بھرتی کیا گیا تھا میں واپسی۔

میں پاکستانی خاصی تعداد میں مقیم ہیں۔وولن گانگ میں پاکستانیوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔اُن سے میری ملاقات ہوئی جس کا اہتمام سڈنی میں مقیم پیپلز پارٹی کے کارکن حنیف مقدم نے کیا۔آسٹریلیا کی قومی اسمبلی کے سپیکر مسٹر سٹیفن مارٹن کا حلقۂ انتخاب بھی یہی تھا۔ہمیں میلبورن میں خصوصی طور پر لے جایا گیا اور وفد کو میلبورن کرکٹ گراؤنڈ کی فلڈ لائٹس میں ایک عالمی میچ دکھایا گیا جو میرا پہلا تجربہ تھا۔اس کے علاوہ ہمیں مورے میں پچاس ہزار ایکڑ رقبے پر مشتمل ایک فارم پر لے جایا گیا۔وہ فارم ہیرس فیملی کی ملکیت تھا۔اس فارم پر صرف دس بارہ افراد نے زراعت کے جدید آلات کے ذریعے سارا کام سنبھال رکھا تھا۔ہم نے فارم ہاؤس پر پورا دن گزارا۔ہمیں فارم کی سیر بھی کروائی گئی۔مسز ہیرس نے ہمارے لیے وہاں ظہرانے کا اہتمام کیا۔اس موقعہ پر میں نے ارادہ کیا کہ میں مسٹر ہیرس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے وزیرِ اعظم پاکستان سے اُن کو آسٹریلیا میں پاکستان کا اعزازی کونسل جنرل بنانے کی اجازت لوں گا۔لیکن آسٹریلین ایمبسی سے اس بابت تفصیلات میں پیش رفت نہ ہو سکی۔

ہمارے وفد نے تسمانیہ کا دورہ بھی کیا۔ہمیں وہاں ایک جانور دکھایا گیا جسے 'Tasmanian Devil' کہا جاتا ہے۔اس کے علاوہ وہاں ایک ایسا شیر دیکھنے کا موقعہ بھی ملا جس کی نسل باقی دنیا سے ختم ہو چکی ہے۔اس کا دھڑ شیر کا مگر سر کُتے کا سا تھا۔اس کے بعد ہمیں پورٹ آرتھر لے جایا گیا جو 'کالا پانی' کہلاتا ہے۔وہاں کی جیلیں اور عقوبت خانے دکھائے گئے۔جہاں معمولی جرم کی پاداش میں لوگوں کو بڑی سزائیں دی جاتی تھیں۔وہاں کے باسی اوبرجینز کے خلاف بھی داستانیں رقم تھیں۔

میں 1994ء میں دولتِ مشترکہ کی طرف سے سپیکرز کانفرنس میں شرکت کے لیے ڈھاکہ گیا۔وہاں میری ملاقات صلاح الدّین قادر چوہدری سے ہوئی جو متحدہ پاکستان کی قومی اسمبلی کے سابق سپیکر فضل قادر چوہدری کے بیٹے ہیں۔اُنہوں نے میری فیملی کو عشائیے پر مدعو کیا۔ایک دلچسپ بات اُس وقت ہوئی جب میں نے اُن کی پارٹی وابستگی کے بارے میں دریافت کیا۔اس پر انہوں نے کہا کہ میری اپنی جماعت ہے جس میں مَیں اکیلا رکن ہوں۔انہوں نے مزید کہا کہ میں اس لیے اکیلا رکن ہوں کیونکہ زیادہ ہونے کی صورت میں اراکین کی پارٹی وفاداریاں بدلنے کا خوف رہتا ہے:

ہم سفر چاہیے ہجوم نہیں
اک مسافر بھی قافلہ ہے مجھے

اُسی سال میں نے دولتِ مشترکہ کے ممالک کی سپیکرز اور پریذائیڈنگ آفیسرز کانفرنس کے لیے پاپوانیو گنی کا دورہ کیا۔ وہاں کی معیشت مضبوط اور کرنسی مستحکم تھی۔ اکثر عوام سیاحت کے کاروبار سے منسلک تھے۔ ہمیں وہاں قومی اسمبلی میں لے جایا گیا اور کئی علاقوں کا دورہ کروایا گیا۔ یہاں دولتِ مشترکہ کے سپیکرز بڑی تعداد میں موجود تھے۔ جس ہوٹل میں سپیکرز مقیم تھے اسی ہوٹل میں ان کے اعزاز میں استقبالیہ دیا گیا۔

اس ملک میں ایک نہایت خوبصورت، قیمتی اور کم یاب پرندہ 'پیراڈائیز برڈ' پایا جاتا ہے جس کی برآمد پر پابندی ہے۔ اس کانفرنس کے دوران یہاں کی اسمبلی نے کانفرنس میں شریک سپیکرز اور پریذائیڈنگ آفیسرز کے لیے یہ پابندی اٹھاتے ہوئے اجازت دی کہ وہ ایک ایک پرندہ ڈیوٹی فری، اپنے اپنے ملکوں کو لے جا سکتے ہیں۔ چونکہ مجھے یہاں سے دیگر کئی ممالک کے دوروں پر جانا تھا چنانچہ میں یہ پرندہ اپنے ساتھ نہ لا سکا۔

میں نے آئی پی یو کے صدر کے انتخاب کے موقعہ پر مصر کے سپیکر ڈاکٹر فتح سرور کو سپیکر قومی اسمبلی پاکستان کی حیثیت سے نہ صرف ووٹ دیا بلکہ اُن کی بھرپور مدد بھی کی۔ اس موقعہ پر ایشیاء اور افریقہ بلاک (Bloc) کا اتحاد ہو گیا۔ جس کی وجہ سے ڈاکٹر فتح سرور بھاری اکثریت سے صدر منتخب ہو گئے۔ گزشتہ انتخاب میں گوہر ایوب خان بھی بطورِ اُمیدوار شامل ہوئے تھے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ اس مرتبہ مجھے پاکستان کی حلیف عالمی برادری نے بطورِ اُمیدوار شامل کرنے کے لیے خواہش ظاہر کی لیکن جب ڈاکٹر فتح سرور اُمیدوار بنے تو میں نے ارادہ ترک کر دیا۔

میں نے ڈاکٹر فتح سرور کی دعوت پر مصر کا دورہ کیا جس کے دوران مجھے قاہرہ، اسکندریہ اور اہرامِ مصر خاص طور پر لے جایا گیا۔ مصر ثقافت کے لحاظ سے ایک قدیم ملک ہے۔ مجھے اسی دوران '10th Ramadan City' بھی لے جایا گیا اور اس شہر کی کنجی پیش کی گئی جو میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔

1994ء ہی میں فرانس میں آئی پی یو کی کانفرنس میں شرکت کے لیے میں نے مخدوم اَمین فہیم، میر ظفر اللہ جمالی، مخدوم فیصل صالح حیات، ہمایوں اختر خان، مخدوم خلیق الزمان اور بیگم

شہناز جاوید کو اپنے وفد میں شامل کیا۔ مخدوم اَمین فہیم 1993ء میں وفاقی وزیر ہاؤسنگ بنائے گئے تھے مگر وہ خوش نہ تھے کیونکہ ان کے پاس پیپلز پارٹی کے پہلے دورِ حکومت میں مواصلات جیسا اہم محکمہ تھا۔ انہیں موسیقی، شعروشاعری اور سیروسیاحت کا بے حد شوق تھا۔ وہ وفاقی وزیر ہونے کے باوجود اکثر بین الاقوامی کانفرنسوں میں میرے ساتھ شامل ہوتے تھے۔ دورۂ فرانس کے وفد کے لیے چیئرمین سینٹ وسیم سجاد نے ان کے چھوٹے بھائی سینیٹر مخدوم خلیق الزمان کا نام بھجوادیا۔ میں نے اس دورے کی سمری وزیرِ اعظم کو بھجوائی تو انہوں نے دونوں بھائیوں کی ایک ہی وفد میں شمولیت سے اتفاق نہ کیا۔ جہاں تک خلیق الزمان کا تعلق تھا اُن کا نام چیئرمین سینٹ وسیم سجاد نے دیا تھا جو کہ اُن کا استحقاق تھا جبکہ امین فہیم سے میں وعدہ کر چکا تھا، لہٰذا میں نے دونوں بھائیوں کا نام وفد میں شامل رکھا۔ آج مخدوم اَمین فہیم وائس چیئرمین پاکستان پیپلز پارٹی ہیں اور اُن کے بھائی مخدوم خلیق الزمان نے بھی حال ہی میں پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی ہے۔

حزبِ اختلاف نے 1994ء میں قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے کے لیے ریکوزیشن بھیج دی۔ میں اُن دنوں چین اور شمالی کوریا کے دورے پر تھا۔ مجھے چین میں پاکستان کے سفیر اکرم ذکی نے بیجنگ ائرپورٹ پر پیغام دیا کہ آپ کو وزیرِ اعظم نے ہنگامی طور پر واپس بلایا ہے کیونکہ حزبِ اختلاف نے قومی اسمبلی کے اجلاس کے لیے درخواست دی ہے۔ قواعد کے مطابق سپیکر کو چودہ دن کے اندر اجلاس بلوانا ہوتا ہے۔ میں اپنا دورہ منسوخ کر کے اسلام آباد کے لیے واپس روانہ ہوا۔ اسلام آباد میں حزبِ اختلاف کے ایک وفد نے ڈپٹی قائد حزبِ اختلاف گوہر ایوب کی قیادت میں مجھ سے ملاقات کی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ اجلاس سے قبل ہمارے اسیر اراکینِ قومی اسمبلی شیخ رشید احمد، حاجی محمد بوٹا اور شیخ طاہر رشید کو رُول 90 کے تحت قومی اسمبلی میں بلایا جائے۔ رُول 90 کا متن درج ذیل ہے:

Rule 90:

Production of a member in custody for a sitting of the Assembly or meeting of a Committee -

(1) The Speaker or Chairman of a Committee may summon a member in custody on the charge of a non-bailable offence to attend a

sitting or sittings of the Assembly or meeting of a Committee of which he is a member,if he considers his presence necessary.

(2) On a Production Order, signed by the Secretary General or by any other officer authorised in this behalf, addressed to the Government of the Province where the member is held in custody or to the authorised concerned, the Provicional Government or such authority shall cause the member in custody to be produced before the Sergeant-at-Arms, who shall, after the conclusion of the sitting or the meeting deliver the member into the custody of the Provincial Government or other authority concerned.

میں نے وفد سے ایک دن کی مہلت چاہی۔اس دوران میں نے وزیر داخلہ جنرل (ر) نصیر اللہ خان بابر، وزیرِ قانون وانصاف سیّد اقبال حیدر اور وزیرِ تعلیم و پارٹی چیف وہپ سیّد خورشید شاہ پر مشتمل حکومتی وفد کو اپنے چیمبر میں بلایا اور اُن سے مشاورت کی۔ہم سب کی متفقہ رائے تھی کہ رُول 90 پر عمل درآمد جمہوریت اور ملک کے بہترین مفاد میں ہے۔

رُول 90 نواز شریف کے دورِ حکومت میں پاس ہوا تھا۔اُس وقت وزیرِ اعلیٰ سندھ جام صادق علی، صدر غلام اسحاق خان کے ایماء پر آصف زرداری کو اجلاس میں شرکت کے لیے کراچی سے اسلام آباد نہیں آنے دے رہے تھے، لہٰذا وزیرِ اعظم نواز شریف نے آصف زرداری کی حاضری یقینی بنانے کے لیے رُول 90 خصوصی طور پر قومی اسمبلی سے پاس کروایا تھا۔گوہر ایوب نے پہلی مرتبہ اس رُول کے تحت پروڈکشن آرڈر جاری کیے۔مجھ سے پہلے سپیکرز کے رُول 90 کے متعلق کوئی ایسے احکام موجود نہ تھے کہ جن پر عملدرآمد نہ کیا گیا ہو۔

میں نے حزبِ اختلاف کے وفد کو اپنے چیمبر میں بلایا اور جیسے ہی رُول 90 کے تحت پروڈکشن آرڈر پر دستخط کیے تو وہ بہت خوش ہوئے اور مجھے کہنے لگے کہ آپ کا نام تاریخ میں لکھا جائے گا۔اس موقعہ پر چوہدری نثار علی نے کہا کہ سپیکر صاحب! آج آپ کا رُول 90 کا فیصلہ کرنا آپ کے دس سالہ سیاسی کیریئر پر بھاری ہے۔حزبِ اختلاف کو اس فیصلے کی اہمیت کا بخوبی اندازہ

تھا مگر اس فیصلے کے نتائج سے حکومت بے خبر تھی۔ یہ اتنا بڑا فیصلہ تھا کہ دوسرے روز اخبارات کے پہلے صفحے کی زینت بنا'' قومی اسمبلی کے سپیکر یوسف رضا گیلانی نے اراکینِ قومی اسمبلی شیخ رشید احمد، شیخ طاہر رشید اور حاجی محمد بوٹا کو رُول 90 کے تحت قومی اسمبلی میں طلب کر لیا''۔

میں نے انہی دنوں اسلام آباد کے ایک مقامی ہوٹل میں پیپلز پارٹی کے پارلیمانی اُمور کے سیکرٹری اظہار امروہی کے بیٹے کی شادی میں شرکت کی۔ وہاں میری گورنر پنجاب چوہدری الطاف حسین سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ سپیکر صاحب! آپ نے رُول 90 کے تحت پروڈکشن آرڈر جاری کیے ہیں مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم نے اس پر عملدرآمد نہیں کرنا۔ گورنر پنجاب نے جب یہ بات کی تو میں نے اُن سے کہا کہ میں نے یہ فیصلہ حکومت کی مشاورت کے بعد کیا ہے۔ میں نے وہاں پر موجود وزراء کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ میں نے اُن سے مشاورت کی تھی۔ جس پر انہوں نے برجستہ کہا کہ یہ غیر ذمہ دار وزیر ہیں۔ وزراء نے بھی اس بات کا بُرا منایا۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ کسی اور سپیکر کا چناؤ کر لیں۔ یہ کہہ کر میں احتجاجاً کھانا کھائے بغیر شادی کی تقریب سے چلا گیا۔ جب یہ بات ہو رہی تھی تو صحافی بھی موجود تھے۔ انہوں نے یہ خبر دوسرے روز کے اخبارات میں شائع کر دی۔ میں جس رات شادی کی تقریب کو احتجاجاً چھوڑ کر گھر پہنچا تو چند وفاقی وزراء بھی میرے پیچھے پیچھے پہنچ گئے۔ انہوں نے مجھے یقین دہانی کروائی کہ وہ وزیرِ اعظم سے اس واقعہ کا ذکر کریں گے۔

جب وزیرِ اعظم اپنے غیر ملکی دورے سے وطن واپس پہنچیں تو ملک میں اس مسئلے پر آگ لگی ہوئی تھی اور حزبِ اختلاف بڑی بے چینی کے ساتھ 'ڈراپ سین' کا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے معلوم نہیں اور نہ ہی آج تک میں نے کسی سے دریافت کیا کہ وزیرِ اعظم اور اُن کے وزراء کے درمیان کیا گفتگو ہوئی؟ مگر مجھے یہ ضرور معلوم ہے کہ وزیرِ اعظم سے اُن کی ملاقات کے بعد مجھے ایک وزیر کا فون آیا کہ وزیرِ اعظم نے ہماری بہت سرزنش کی ہے اور یہ کہ ہم نے اُن سے معذرت کر لی ہے اور آپ بھی اُن سے معذرت کر لیں۔ یقین دہانیاں کروانے والوں کی یہ بات سن کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ کچھ ہی دیر بعد وزیرِ اعظم کا فون آیا اور انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ گیلانی صاحب! اسمبلی کا کیا حال ہے؟ میں نے انہیں کہا کہ سب نارمل ہے۔ میں نے اُن سے مزید کہا کہ میں نے پروڈکشن آرڈر جاری کیا ہے جو ملک و قوم اور جمہوریت کے حق میں بہتر

ہے۔انہوں نے کہا کہ آپ سے اسمبلی میں ملاقات ہوگی۔ جب میں اسمبلی ہال کے اندر پہنچا تو حزبِ اختلاف نے مجھ سے پروڈکشن آرڈر پر عملدر آمد کروانے کا مطالبہ شروع کر دیا۔ میں نے اس اہم اور سنجیدہ مسئلے پر ایوان میں بحث کی اجازت دے دی۔

عوام کی رائے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور اگر پارلیمنٹ میں بھی اظہار رائے کا موقعہ نہ دیا جائے تو پھر ایسا طوفان برپا ہوتا ہے جسے کنٹرول کرنا ممکن نہیں رہتا۔ جب میں اجلاس کے دوران اپنے چیمبر میں گیا تو وہاں وزیرِ اعظم تشریف لے آئیں۔ انہوں نے مجھ سے رُول 90 پر گفتگو کی۔ میں نے کہا کہ میں نے آپ کے وزراء کے ساتھ مشاورت کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا تھا اب اگر وہ اس کی پابندی نہیں کر سکتے تو میرے لیے ممکن نہیں کہ میں سپیکر کے عہدے پر قائم رہ سکوں۔ وزیرِ اعظم نے مجھ سے کہا کہ آئیں آپ میرے ساتھ چلیں۔ وزیرِ اعظم اور میں ایک کار میں سوار ہو گئے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ میں نے انہیں دورانِ سفر کہا کہ مجھے گورنر پنجاب کے رویئے پر بہت دُکھ ہوا ہے۔ ہم چند منٹوں بعد ایوانِ صدر پہنچ گئے۔ ہمارا صدر لغاری نے استقبال کیا۔ بیٹھتے ہی وزیرِ اعظم نے کہا کہ صدر صاحب! کیا آپ ہمیں کھانا نہیں کھلائیں گے؟ انہوں نے کہا کہ کھانا تیار ہے اور گورنر پنجاب چوہدری الطاف حسین بھی یہاں موجود ہیں۔ وزیرِ اعظم نے کہا کہ انہیں اندر بلوا لیں۔ صدر لغاری ابھی انہیں بلوانے ہی والے تھے کہ میں نے کہا کہ انہوں نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اس لیے اگر وہ یہاں آنے والے ہیں تو پھر آپ مجھے اجازت دے دیں۔ صدر لغاری نے انٹر کام پر کہا کہ انہیں رہنے دیں۔ کھانے کے دوران تفصیل سے بات ہوئی۔ وزیرِ اعظم نے مجھے رولنگ واپس لینے کے لیے کہا۔ میں نے حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے وزیرِ اعظم سے مہلت طلب کی اور اپنے گھر چلا گیا۔

مجھے گھر پہنچنے کے بعد اطلاع ملی کہ گورنر پنجاب مجھ سے ملاقات کے لیے آئے ہیں۔ میں نے اُن سے ملاقات کی۔ انہوں نے کہا کہ گیلانی صاحب! میرے آپ کے ساتھ دوہرے تعلقات ہیں، ایک تو آپ میرے بھتیجے ہیں چونکہ میں آپ کے والد کے ساتھ کام کر چکا ہوں اور دوسرا یہ کہ آپ میرے پیر خانہ ہیں، سنا ہے کہ آپ مجھ سے ناراض ہیں، اس لیے میں آپ کے پاس چل کر آیا ہوں۔ میں نے کہا کہ ہماری خاندانی روایت کے مطابق اگر کوئی خود چل کر آ جائے تو ہم دل میں کوئی بات نہیں رکھتے، لہٰذا میں نے اپنا دل صاف کر لیا ہے۔ ساتھ ہی میں

اپنے مئوقف پر بھی قائم رہا کہ اسیر اراکینِ قومی اسمبلی کو ایوان میں پیش کیا جانا چاہیے۔ انہوں نے اتفاق کیا کہ میں آپ کے راستے میں حائل نہیں ہوں گا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وزیرِ اعظم نے انہیں میرے پاس بھیجا تھا۔

وزیرِ اعظم نے حامد ناصر چٹھہ کو بھی میرے پاس بھیجا۔ میں نے اُنہیں واضح طور پر کہہ دیا کہ اگر پروڈکشن آڈرز پر عملدرآمد نہ ہوا تو میں مستعفی ہو جاؤں گا۔ انہوں نے یہ بات وزیرِ اعظم سے بھی کہہ دی۔ دوسرے روز وزیرِ اعظم نے میرے ساتھ فون پر بات کی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ اُن کا رویّہ میرے ساتھ سخت تھا۔ وہ مجھے عام طور پر یوسف یا گیلانی صاحب کہہ کر پکارتیں تھیں، اُس دن انہوں نے سپیکر صاحب کہہ کر پکارا اور کہا کہ مجھے آپ سے ملاقات کا وقت چاہیے۔ میں نے کہا کہ میں خود آپ کے پاس آجاتا ہوں۔ میں حسبِ پروگرام 'وزیرِ اعظم ہاؤس' گیا۔ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا جہاں ایک اور صاحب بھی موجود تھے جن سے میرا تعارف نہیں تھا۔ وزیرِ اعظم چند اخبارات اٹھائے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ ایک دو اخبارات میری گود میں ڈال دیے اور کہا کہ پڑھیں اپنی خبریں۔ جب وہ بیٹھ گئیں تو میں نے کہا کہ میرے ساتھ کون صاحب تشریف فرما ہیں؟ انہوں نے غصیلے انداز میں جواب دیا کہ یہ قاضی جمیل ہیں اور اٹارنی جنرل پاکستان ہیں (جو بعد میں سپریم کورٹ بار کے صدر بھی رہے)۔ میں نے کہا کہ میں آپ سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے جواب میں وزیرِ اعظم نے کہا کہ میں نے انہیں قانونی مشاورت کے لیے بلایا ہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں نے آپ سے کسی قانونی نقطہ پر بات نہیں کرنی، میں آپ سے صرف ذاتی بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر انہوں نے سخت لہجے میں کہا کہ مسٹر اٹارنی جنرل! میرے سپیکر کو آپ کی موجودگی پسند نہیں آئی۔ اٹارنی جنرل نے میری طرف سوالیہ انداز سے دیکھا تو میں نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ وہ اُٹھ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے وزیرِ اعظم سے کہا کہ میں آپ کے وزراء کی مشاورت سے اپنی رولنگ دے چکا ہوں جس کو بدلنا میرے بس میں نہیں، آپ مہربانی فرما کر میرا اسپیکر قومی اسمبلی کے عہدے سے استعفیٰ منظور کر لیں، میں پارٹی کے ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے کام کرتا رہوں گا۔ وزیرِ اعظم نے کہا کہ یوسف! آپ میرے بھائی ہیں، میں پہلے ہی مشکلات میں ہوں، آپ مہربانی فرما کر استعفےٰ کی باتیں نہ کریں۔

میرے پاس اس مسئلے کو استحقاق کمیٹی کے سپرد کر دینے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ میں نے وزیرِ اعظم سے کہا کہ میرے پاس ایک ہی حل ہے کہ میں اس معاملے کو استحقاق کمیٹی کے سپرد کر دوں۔ وزیرِ اعظم نے کہا کہ یہ بات میرے لیے مزید سبکی کا باعث بنے گی۔ میں نے کہا کہ میں ایوان کا مزاج دیکھ کر فیصلہ کروں گا مگر سرِ دست میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں نے شام کے اجلاس میں ایوان کا مزاج دیکھا تو اس معاملے کو استحقاق کمیٹی کے سپرد کر دیا۔ جس سے حزبِ اختلاف مطمئن ہو گئی کہ اس کے علاوہ کوئی اور منصفانہ فیصلہ نہیں ہو سکتا تھا۔

استحقاق کمیٹی کے سربراہ لاڑکانہ سے ایم این اے شبیر احمد چانڈیو (جو اَب مسلم لیگ (ق) میں ہیں) مجھے اکثر کہا کرتے تھے کہ آپ نے ہمیں مشکل میں ڈال دیا ہے، آپ حق پر ہیں ہم آپ کے خلاف کیسے فیصلہ دے سکتے ہیں؟ میں نے اجلاس کے دوران یہ بیان دیا کہ استحقاق کمیٹی منتخب اور بااختیار ہے جس میں حکومتی اراکین کے علاوہ حزبِ اختلاف بھی موجود ہے، اگر کمیٹی نے میرے خلاف فیصلہ دیا تو میں اس فیصلے کو تسلیم کرتے ہوئے مستعفی ہو جاؤں گا۔ لہٰذا استحقاق کمیٹی کے لیے اور بھی مشکل ہو گیا کہ ایک طرف حکومت اور دوسری طرف سپیکر کے خلاف فیصلہ دینے کا ردِ عمل سامنے تھا۔ وہ ایک مشکل اور پیچیدہ مسئلے میں ڈال دیئے گئے تھے۔ اُن کے لیے 'نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن' والا معاملہ بن گیا لیکن استحقاق کمیٹی کے فیصلے سے قبل ہی قومی اسمبلی تحلیل کر دی گئی۔ پارلیمانی روایات میں کسی وفاقی وزیر کا اصولوں پر مستعفی ہونا بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے* پیپلز پارٹی کے سپیکر کا رُول 90 پر جو مؤقف تھا اُسے آج بھی احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

کچھ عرصے بعد بے نظیر بھٹو نے مجھے کہا کہ یوسف! آپ ہمیشہ کہتے تھے کہ رُول 90 پر چوہدری الطاف حسین عملدرآمد نہیں ہونے دے رہے، آج میں محسوس کر رہی ہوں کہ آپ حق بجانب تھے، واقعی انہوں نے مجھے روکا تھا کہ اس پر عملدرآمد نہیں کرنا۔

وزیرِ اعظم کے ساتھ رُول 90 کے تحت پروڈکشن آرڈر جاری کرنے کے باعث جس کشیدگی نے جنم لیا اس پر سابق وزیرِ قانون و ایم این اے افتخار حسین گیلانی خاصے متحرک

* کیونکہ رول 90 کے مسئلے پر وفاقی وزیر قانون وانصاف و پارلیمانی امور سید اقبال حیدر کو مستعفی ہونا پڑا۔

ہو گئے۔ کچھ عرصہ قبل انہوں نے پیپلز پارٹی چھوڑ کر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی تھی۔ وہ اب مسلم لیگ میں رہتے ہوئے بھی نواز شریف سے خوش نہیں تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اُن کے لیے مشکل ہے کہ وہ مسلم لیگ چھوڑ کر دوبارہ پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کریں۔ سپیکر قومی اسمبلی کا عہدہ غیر جانبدار تصور ہوتا ہے، لہٰذا اُن کی خواہش تھی کہ وہ سپیکر بن جائیں اور میں وفاقی وزیر۔

اُنہی دنوں بہاولپور سے ایم این اے ریاض حسین پیرزادہ کے والد میاں شاہ نواز پیرزادہ کا قتل ہو گیا۔ انہوں نے ایف آئی آر میں میرے کزن تسنیم نواز گردیزی کا نام درج کروادیا جس کی وجہ سے وہ گرفتار کر لیے گئے۔ شاہ نواز پیرزادہ کا بنیادی طور پر گیلانی گروپ سے تعلق تھا۔ میں نے تسنیم نواز سے نہ صرف ڈسٹرکٹ جیل، ملتان میں ملاقات کی بلکہ انہیں اُن کے لاہور والے گھر میں نظر بند کروادیا۔ جس کی وجہ سے ریاض پیرزادہ مجھ سے ناراض ہو گئے۔

افتخار حسین گیلانی نے ریاض پیرزادہ کے ساتھ اتحاد کر لیا۔ انہوں نے پیپلز پارٹی کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ اُن کے گروپ میں خاصی تعداد میں اراکینِ قومی اسمبلی ہیں اور اگر اراکین کی اتنی بڑی تعداد حکومت کا ساتھ دے تو آئینی ترامیم کرنے کے علاوہ آسانی سے حکومت بھی چلائی جا سکتی ہے۔ اسی دوران اس گروپ کی جانب سے میرے خلاف عدم اعتماد کے لیے دستخطی مہم شروع ہو گئی۔ مجھے شجاع آباد سے ایم این اے جاوید علی شاہ نے بتایا کہ مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی مل کر آپ کے خلاف تحریکِ عدم اعتماد پر دستخط کروا رہی ہیں۔

مجھ سے ملاقات کے بعد جاوید علی شاہ نے نواز شریف سے ملاقات کر کے دریافت کیا کہ کیا آپ نے اپنی پارٹی کو ہدایت دی ہے کہ سپیکر صاحب کے خلاف عدمِ اعتماد کی تحریک کے سلسلے میں دستخط کروائے جائیں؟ انہوں نے کہا کہ نہیں! میں نے اس قسم کے احکامات جاری نہیں کیے، آپ بالکل دستخط نہ کریں اور دوسروں کو بھی روک دیں۔ اسی رات نو بجے کی خبروں میں وزیرِ اعظم کی طرف سے بھی بیان آیا کہ ہم سپیکر قومی اسمبلی کے خلاف تحریکِ عدم اعتماد نہیں لا رہے۔

عجیب اتفاق ہے کہ جب محترمہ کی حکومت برطرف کر کے اسمبلی تحلیل کر دی گئی تو میری طرف سے اس فیصلے کے خلاف مقدمے میں افتخار گیلانی وکیل تھے۔ آج جب میں سنٹرل جیل اڈیالہ، راولپنڈی میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہا ہوں تو میری ہمشیرہ اور والدہ کی وفات پر

تعزیت کے لیے ریاض پیرزادہ دومرتبہ جیل آئے جس پر میں اُن کا شکر گزار ہوں۔ چند دوست جن سے توقعات زیادہ تھیں اُن کی مجبوریاں آڑے آئیں اور وہ مجھ سے تعزیت کرنے بھی نہ آسکے، خیر یہ موقعہ شکایت کا نہیں۔

میں نے پارلیمنٹ کی اعلیٰ روایات کو فروغ دیا'ہاؤس آف کامنز' میں ان اعلیٰ روایات کے حامل سپیکر کے مدِ مقابل حزبِ اختلاف عموماً اپنا اُمیدوار کھڑا نہیں کرتی۔ میں دوہری اذیت سے گزر رہا تھا،ایک طرف حکومت کے خلاف مَوقف اختیار کرنے کا ردِّعمل اور دوسری جانب حزبِ اختلاف کی طرف سے اُن کے اُمیدوار کا مقابلہ کرنا تھا۔ہمیں ایسی مثالیں قائم کرنی چاہئیں کہ سپیکر کے غیر جانبدارانہ کردار ادا کرنے پر حزبِ اختلاف کی طرف سے اس کے مدِ مقابل اُمیدوار کھڑا نہیں کرنا چاہیے۔

جن دنوں رُول 90 پر میرے اور حکومت کے درمیان اختلافِ رائے تھا اُنہی دنوں وزیرِ اعظم نے مجھے ظہرانے پر مدعو کیا جس میں وفاقی وزیرِ تعلیم و چیف وہپ سید خورشید شاہ بھی شریک تھے۔کھانے کی میز پر وزیرِ اعظم نے کہا کہ میں اپنی کابینہ میں ردّوبدل کرنا چاہتی ہوں۔ انہوں نے قومی اسمبلی کے حلقہ نمبر 1 سے آخری حلقے تک ایک ایک نام پر ہماری رائے لی۔ جب مظفر گڑھ کی باری آئی تو وزیرِ اعظم نے کہا کہ گیلانی صاحب! مصطفیٰ کھر کو کابینہ میں شامل کیا جائے تو وہ کیسے رہیں گے؟ میں نے کہا کہ آپ اُنہیں کابینہ میں ضرور شامل کریں۔اس پر انہوں نے کہا کہ کارکنوں کا کیا ردِّعمل ہوگا؟ میں نے اُن سے کہا کہ جب سیاسی فیصلہ کرنا ہو تو اس میں کئی اور عوامل بھی شامل ہو جاتے ہیں۔

اس حوالے سے میں نے انہیں یہ بھی کہا کہ 1985ء کی جونیجو کابینہ میں وزیرِ داخلہ اسلم خٹک وزیرِ اعظم کے بارے میں اچھی رائے کا اظہار نہیں کرتے تھے۔چند وزراء نے میری موجودگی میں وزیرِ اعظم سے کہا کہ خٹک صاحب آپ کے بارے میں کھلے عام شکایت کرتے ہیں۔جواباً وزیرِ اعظم نے کہا کہ مجھے معلوم ہے کون کس کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے،آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ کچھ لوگ کابینہ سے باہر رہ کر زیادہ مشکلات پیدا کرتے ہیں، میں انہیں وزیر بنا کر اُن کی بہت سی باتوں سے محفوظ ہو گیا ہوں۔ میں نے اسی تناظر میں محترمہ سے کہا کہ اگر کھر صاحب کابینہ سے باہر ہوں گے تو وہ آپ کے لیے مشکلات پیدا کریں گے۔ جب کابینہ میں توسیع

ہوئی تو کھر صاحب پانی و بجلی کے وفاقی وزیر بنا دیئے گئے۔

اس میٹنگ میں وزیرِ اعظم نے شاہ محمود کے بارے میں بھی میری رائے لی کہ کیا انہیں کابینہ میں شامل کیا جائے یا نہیں؟ میں نے اُن کی بھی کابینہ میں شمولیت کی حمایت کی۔ انہیں وزیرِ مملکت برائے پارلیمانی اُمور بنا دیا گیا۔ اسی موقعہ پر انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ گورنر پنجاب کسے ہونا چاہیے؟ ہم نے دو ناموں پر اتفاق کیا جن میں اعتزاز احسن اور مصطفیٰ کھر شامل تھے۔ اعتزاز احسن کا نام اس لیے تجویز کیا گیا کیونکہ وہ ماہرِ قانون تھے اور صوبہ پنجاب میں آئینی پیچیدگیاں تھیں جنہیں دور کرنے کے لیے اُس وقت ایک قانون دان کا گورنر ہونا بہت ضروری تھا۔ میں نے مختلف مواقع پر وزیرِ اعظم کو اعتزاز احسن کے بارے میں یاد دہانی بھی کروائی اور وہ مجھ سے مسلسل وعدہ بھی کرتی رہیں۔ میں یہ خوشخبری اعتزاز احسن تک بھی پہنچا چکا تھا۔ چند دنوں بعد 'وزیرِ اعظم ہاؤس' میں وزیرِ اعظم نے اراکینِ پارلیمنٹ کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔ اُس موقعہ پر نصرت فتح علی خان کا پروگرام خصوصی طور پر رکھا گیا۔ جونہی وزیرِ اعظم پنڈال میں داخل ہوئیں تو میری طرف آ کر کہنے لگیں کہ یوسف! میں معذرت خواہ ہوں کہ میں اعتزاز احسن کو گورنر پنجاب نہیں بنا سکی، مجھ پر خاصا دباؤ تھا اور مجھے یقین ہے آپ میری مجبوری کو سمجھ چکے ہوں گے۔ انہوں نے جنرل سروپ خان کو گورنر پنجاب بنا دیا۔

وزیرِ اعظم اور آصف زرداری پہلے سے طے شدہ پروگرام کے بغیر اچانک میرے دفتر آ گئے۔ میں نے انہیں چائے کی پیشکش کی جو انہوں نے قبول کر لی۔ وزیرِ اعظم نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ سندھ کے سابق وزیرِ اعلیٰ جام صادق علی ہمارے حریف تھے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہم آپ کے پاس ایک کام سے آئے ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایم این اے جام معشوق علی جو کہ جام صادق علی کے بیٹے ہیں، طویل عرصے سے ملک سے باہر ہیں۔ قومی اسمبلی کے رولز آف بزنس کے مطابق جو رکن اسمبلی چالیس سٹنگز سے متواتر غیر حاضر رہے، اسمبلی سے ایک قرارداد پاس ہونے کی صورت میں نااہل ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم آج یہ قرارداد پیش کرنا چاہتے ہیں، آپ اسے منظور کریں۔ میں نے اُن سے کہا کہ آج تک قومی اسمبلی کی کوئی ایسی مثال نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ صوبائی اسمبلی سندھ کے سپیکر غوث بخش مہر نے جام معشوق علی کے چچا زاد بھائی جام مدد علی کو انہی رولز کے تحت نااہل کیا ہے، لہٰذا آپ کے لیے یہ

مثال موجود ہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ صوبائی اسمبلی کی یہ غلط مثال قومی اسمبلی کو نہیں اَپنانی چاہیے۔ وزیرِ اعظم نے رخصت ہوتے ہوئے کہا کہ ہم یہ قرارداد آج پیش کریں گے۔

میں نے قومی اسمبلی کے سیکرٹری جنرل سے مشورہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر قومی اسمبلی جام معشوق علی کے غیر حاضر رہنے کی درخواست منظور کر لے تو وہ نااہلی سے بچ سکتے ہیں۔ جام معشوق علی نے دوبئی سے بذریعہ فیکس درخواست بھجوا دی اور قومی اسمبلی نے اُن کی غیر حاضر رہنے کی درخواست منظور کر لی۔ مجھے معلوم نہیں کہ وزیرِ اعظم نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا یا نہیں مگر اتنا ضرور ہوا کہ سابق سپیکر سندھ اسمبلی غوث بخش مہر جنہوں نے جام مدد علی کو نااہل قرار دیا تھا، پیپلز پارٹی کی حکومت برطرف ہوتے ہی مسلم لیگ (ن) میں شامل ہو گئے اور جب نواز شریف کی حکومت برطرف ہوئی تو انہوں نے مسلم لیگ (ق) میں شمولیت اختیار کر لی اور آج وفاقی وزیر ہیں مگر غلط روایات کی تقلید نہ کرنے والا آج جیل میں ہے۔ اگر مہر صاحب کی طرح میں بھی ایک غلط مثال قائم کرتا تو نواز شریف کے دور میں بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کی طویل عرصے کی جلاوطنی کی وجہ سے وہ بھی نااہل ہو چکی ہوتیں اور یہ پارلیمانی تاریخ کی ایک بدترین مثال ہوتی۔

پارلیمانی روایات کے مطابق سال کے آغاز پر صدر کو قومی اسمبلی اور سینٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرنا ہوتا ہے۔ اتفاق کی بات ہے، مشترکہ اجلاس سے چند دِن قبل پیپلز پارٹی کی حکومت نے قائدِ حزبِ اختلاف نواز شریف کے والد میاں محمد شریف کو گرفتار کر لیا۔ اس اقدام نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور سارا ماحول خراب ہو گیا۔ پہلے ہی دکھائی دے رہا تھا کہ مشترکہ اجلاس بڑا ہنگامہ خیز ہوگا۔ میں نے حکومت کو بھی اس بات سے آگاہ کر دیا۔ عوام نے اس اجلاس کی کارروائی دیکھنے کے لیے بڑی بے چینی کے ساتھ داخلہ passes کے حصول کے لیے درخواستوں کی بھرمار کر دی۔ میں نے وزیرِ اعظم کو مشورہ دیا کہ اس اجلاس کو براہِ راست ٹی وی پر نشر کروائیں۔

میرے ایک دوست نے فون کر کے میر مرتضٰی بھٹو کے لیے صدر کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کی کارروائی دیکھنے کے لیے پاس مانگا، میں نے پاس جاری کر دیا۔ مجھے مرتضٰی بھٹو سے ایک گِلہ تھا جس کا میں نے غالباً اسحاق خان خاکوانی یا خلیق الزمان سے ذکر کیا کہ کچھ عرصہ پہلے مرتضٰی بھٹو نے ایک اخباری بیان میں کہا تھا کہ میرے والد کے قاتل یوسف رضا ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ شاید طویل عرصہ ملک سے باہر رہنے کی وجہ سے اُنہیں اصل حقائق معلوم نہ

ہوں۔ جب انہوں نے مرتضیٰ بھٹو سے اس بات کا ذکر کیا تو انہوں نے ایک تو دعوت نامے کا شکریہ ادا کیا اور دوسرا اس الزام پر معذرت بھی کی کہ میں نے صحیح حقیقت اُن تک پہنچائی ہے۔ اہم واقعہ اس وقت پیش آیا جب مشترکہ اجلاس سے قبل وزیرِ اعظم، چیئرمین سینٹ اور میں، صدر لغاری کا استقبال کرنے کے لیے اسمبلی کے صدر دروازے کی طرف جا رہے تھے تو اچانک مرتضیٰ بھٹو ہمارے سامنے آ گئے۔ وزیرِ اعظم نے اپنی عینک لگا کر اُن کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے کہا کہ یوسف! کیا یہ میر مرتضیٰ ہیں؟ میں نے کہا کہ جی ہاں۔ انہوں نے دریافت کیا کہ انہیں کس نے بلایا ہے؟ میں نے کہا کہ اُنہیں میں نے بلایا ہے۔ اس دوران وہ محترمہ کو دیکھتے ہی اسمبلی ہال کے اندر داخل ہو گئے۔ جب ہم لفٹ میں سوار ہوئے تو وزیرِ اعظم نے کہا کہ

" Today my brother has recognized my Speaker, Soon he shall recognize me. "

ترجمہ: آج میرے بھائی نے میرے سپیکر کو تسلیم کر لیا ہے، جلد ہی وہ مجھے بھی تسلیم کر لیں گے۔

جب وزیرِ اعظم یہ کہہ چکیں تو چند لمحوں کے لیے بالکل خاموش ہو گئیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ خاصی جذباتی ہو گئی ہیں اور اُنہیں اپنے جذبات چھپانے کے لیے خاموشی کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آیا۔ میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ اس موضوع پر مزید گفتگو نہ کی جائے مگر ان تمام واقعات کے باوجود وزیرِ اعظم نے کسی بات کا بُرا نہ منایا اور نہ ہی انہوں نے مجھ سے اس کی تفصیل دریافت کرنے کی کوشش کی۔

جب صدر لغاری مشترکہ اجلاس سے خطاب کرنے سے پہلے میرے چیمبر میں آئے تو اُن کے سٹاف نے الگ سے ایک زائد شیروانی اٹھائی ہوئی تھی۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ شیروانی ساتھ کیوں لائے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ مجھے ہنگامے کے پیشِ نظر شاید خطاب کے بعد شیروانی تبدیل کرنا پڑے گی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حالات کس قدر کشیدہ تھے۔ جب میں صدر صاحب کے ہمراہ اسمبلی ہال میں داخل ہوا تو کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ اراکینِ اسمبلی نے بینرز اٹھائے ہوئے تھے جن پر صدر لغاری کے خلاف نعرے درج تھے۔ ہال میں

میرے سُسر سینیٹر پیر اسرار حسین بھی تشریف فرما تھے۔ انہوں نے میری طرف دیکھا اور شریر بچے کی طرح اپنی جیب سے لغاری مخالف ایک سٹیکر نکالا اور اپنے بازو پر لگا لیا۔ میں نے صدر سے مختصر تقریر کرنے کے لیے استدعا کی۔ صدر پسینے سے شرابور تھے۔ تہمینہ دولتانہ، راجہ نادر پرویز، میاں عباس شریف، کبیر خان اور کئی دوسرے ارکانِ اسمبلی سٹیج کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

میں اجلاس کے اختتام پر صدر لغاری کو اپنے چیمبر میں لے گیا، وہاں وزیرِ اعظم، بیگم نصرت بھٹو، حامد ناصر چٹھہ اور نوابزادہ نصر اللہ خان بھی آ گئے۔ مجھے کامیاب مشترکہ اجلاس پر سب نے مبارکباد دی۔ یہاں سے ہم سب باہر لان میں گئے جہاں چائے کا اہتمام تھا۔ اسی دوران ہمیں اسمبلی ہال میں ہنگامے کی اطلاع دی گئی۔ اُن دنوں اعجاز الحق ٹانگ میں تکلیف کے باعث چھڑی کا سہارا لے کر چلتے تھے۔ گیلری میں بیٹھے مہمانوں میں سے کسی نے اعجاز الحق پر چند فقرے کس دیے جس کی وجہ سے ہنگامہ ہو گیا۔ غیر ملکی میڈیا نے اراکین کو لڑتے ہوئے دکھایا۔ فیصلے کے مطابق جب اسمبلی کی کارروائی ٹیلی ویژن پر براہِ راست نہیں دکھائی گئی تو اس سے حکومتی مئوقف کو نقصان پہنچا۔ میں نے وزیرِ اعظم سے احتجاج کیا کہ آپ کو اسمبلی کی کارروائی براہِ راست دکھانی چاہیے تھی تاکہ عوام پر اچھا تاثر پڑتا۔ وزیرِ اعظم نے یہ دلائل دیے کہ ٹی وی کے پروگرام کئی ممالک میں دکھائے جاتے ہیں اور ہم جونیئر فوجی افسران کو نہیں دکھانا چاہتے کہ پارلیمنٹ میں کیا ہو رہا ہے کیونکہ اس سے اُن پر غلط اثر پڑتا ہے۔ وزیرِ اعظم کا مئوقف تھا کہ جنرل ضیاءُ الحق ہمارے ساتھ تھے مگر جونیئر افسران نے انہیں بھٹو صاحب کے خلاف انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا، اَب جنرل عبدالوحید کاکڑ بھی ہمارے ساتھ ہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی ان کے دباؤ میں آ کر مجبور ہو جائیں۔

صدر لغاری نے قومی اسمبلی میں ہنگامے کے واقعہ پر سخت احتجاج کیا۔ مجھ سے ملاقات کے لیے حزبِ اقتدار کا وفد میرے دفتر آیا۔ اُن میں آفتاب شعبان، خورشید شاہ، این ڈی خان، احمد صادق، قاضی جمیل، شیخ ریاض، آئی جی اور ایس پی اسلام آباد شامل تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں وزیرِ اعظم نے خصوصی طور پر بھیجا ہے کہ ہنگامہ کرنے والے حزبِ اختلاف کے اراکینِ اسمبلی پر مقدمہ درج کروایا جائے۔ ساتھ ہی اراکینِ قومی اسمبلی کی فہرست دے کر کہنے لگے کہ اِن کے خلاف مقدمہ درج کروائیں۔ میں نے اُن سے متعلقہ قانون کا دریافت کیا تو انہوں نے Section 196 Cr.P.C کا حوالہ دیا جس کے مطابق نامزد آفیسرز کی شکایت کے بغیر صدر یا

گورنر پر حملہ آوروں کے خلاف مقدمہ درج نہیں کیا جا سکتا۔ اٹارنی جنرل قاضی جمیل نے کہا کہ ہم آپ کے پاس اس لیے آئے ہیں تا کہ آپ ان کے خلاف مقدمہ درج کروائیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ مجھے اراکینِ پارلیمنٹ کے خلاف مقدمہ درج کروانے کا نہیں کہہ سکتے۔ انہوں نے کہا کہ ہم سیکرٹری قومی اسمبلی کو حکم دے سکتے ہیں کیونکہ وہ سرکاری اَفسر ہیں۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ خود ایوان میں وزیرِ اعظم کی نشست کے پیچھے بیٹھتے ہیں تو حکومت آپ کو نامزد کیوں نہیں کرتی؟ انہوں نے کہا کہ میں نے مستقبل میں پریکٹس کرنی ہے، لہٰذا میں خود مقدمہ درج نہیں کروانا چاہتا۔ میں نے اُنہیں کہا کہ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ میری زندگی کا آخری الیکشن ہے؟ جس پر انہوں نے سیکرٹری قومی اسمبلی عبدالرؤف لغمانی (جو کہ بعد میں ہائی کورٹ کے جج تعینات ہوئے) سے کہا کہ میں آپ کو حکم دیتا ہوں کہ آپ مقدمہ درج کروائیں۔ میں نے کہا کہ آپ اُنہیں حکم نہیں دے سکتے۔ قاضی جمیل نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا کہ نہیں! میں حکم دے سکتا ہوں۔ میں نے دوبارہ کہا کہ آپ حکم نہیں دے سکتے۔ جب تیسری مرتبہ انہوں نے کہا:

" Sir! I differ with you. I can order him." (جناب! میں آپ سے اختلاف کرتا ہوں، میں اسے حکم دے سکتا ہوں)۔ تو میں نے اُن سے کہا کہ اَب آپ چلے جائیں اور وزیرِ اعظم سے کہیں کہ میں آج کے بعد احتجاجاً اجلاس کی صدارت نہیں کروں گا جب تک وزیرِ اعظم خود اس بات پر معذرت نہ کریں۔ اُن میں بااصول شخص وزیرِ دفاع آفتاب شعبان میرانی تھے جو مسئلے کی نزاکت کو بھانپ گئے اور مجھے کہنے لگے کہ میں ان کی طرف سے آپ سے معذرت کرتا ہوں۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں اس واقعہ کو وزیرِ اعظم کے نوٹس میں لاؤں گا۔

میں نے بیس دن تک اجلاس کی صدارت نہ کی۔ حکومت نے ڈپٹی سپیکر ظفر علی شاہ سے رابطہ کیا تو انہوں نے بھی صدارت کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ آپ سپیکر سے رابطہ کریں۔ حکومت نے خود مجھ سے رابطہ نہ کیا بلکہ اپنی طرف سے کچھ لوگوں کو میرے پاس بھیجتے رہے۔ حکومت کی طرف سے جو لوگ مجھے ملتے رہے وہ میری ہی تائید کرتے رہے۔ وفاقی وزراء بھی آ کر میری ہی حمایت کرتے تھے۔ اس دوران خفیہ اداروں نے وزیرِ اعظم کو غلط رپورٹیں بھیجنا شروع کر دیں کہ یوسف رضا وزیرِ اعظم بننا چاہتے ہیں۔ ان رپورٹوں کو وزیرِ اعظم نے اپنے ریمارکس کے ساتھ مجھے بھیج دیا۔ میں نے اس دوران وزراء سے بھی ملاقاتیں کیں، فاٹا کے لوگ بھی ملے اور کئی

مذہبی جماعتوں کے دوستوں نے بھی مجھ سے رابطہ کیا اور میرے اصولی مؤقف پر اپنی حمایت کی یقین دہانی کروائی۔ اس دوران سیف الرحمٰن کے بھائی مجیب الرحمٰن نے مجھ سے رابطہ کر کے کہا کہ قائدِ حزبِ اختلاف نواز شریف آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ انہی دنوں اعجاز الحق بھی میرے چیمبر میں آئے اور میرے سامنے میاں صاحب کی خواہش ظاہر کی کہ وہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں پارلیمنٹ کی بالادستی کے لیے جنگ لڑ رہا ہوں اگر قائد حزبِ اختلاف مجھ سے ملاقات کریں گے تو میرا مؤقف کمزور پڑ جائے گا، میں کسی عہدے کا خواہش مند نہیں ہوں، اُصولی مؤقف پر قائم ہوں، لہٰذا ملاقات کے لیے یہ وقت مناسب نہیں ہے۔

بالآخر حکومت کو احساس ہو گیا کہ بیس روز سے ایوان کی کارروائی متاثر ہو رہی ہے، لہٰذا وزیرِ اعظم نے خود مجھ سے فون پر رابطہ کیا اور ایوان میں آنے کے لیے کہا۔ میں نے اُنہیں اپنے تحفظات کے بارے میں آگاہ کیا جس پر ہم دونوں کی 'وزیرِ اعظم ہاؤس' میں ظہرانے پر ملاقات طے ہوگئی۔ یہ ملاقات دو گھنٹے جاری رہی اور بالآخر انہوں نے میرے اصولی مؤقف کو تسلیم کرلیا کہ حکومت سپیکر کو حکم نہیں دے سکتی اور مزید کہا کہ میں اٹارنی جنرل سے کہتی ہوں کہ وہ آپ سے معذرت کریں۔ میں نے اُن سے کہا کہ میرا اٹارنی جنرل سے کوئی تعلق نہیں، لہٰذا اگر آپ نے احساس کیا ہے تو حکومت کا مؤقف ایوان کے سامنے آنا چاہیے۔ جس پر وزیرِ اعظم نے کہا کہ حکومت کی طرف سے نوابزادہ نصراللہ خان ایوان سے معذرت کریں گے۔ نوابزادہ صاحب نے اُسی روز ایوان میں حکومت کی طرف سے معذرت کی اور اس طرح ایک نہایت ہی پیچیدہ مسئلے کا حل نکل آیا۔ اس بات سے پارلیمنٹ کی بالادستی تسلیم ہوئی کہ سپیکر کو ڈکٹیٹ نہیں کیا جاسکتا اور یہ کہ ایوان کے اندر اظہارِ رائے کی آزادی کو کسی قانون کے تابع نہیں کیا جاسکتا۔

مرتضیٰ بھٹو کے قتل سے قبل میرے دوست ممتاز میمن کا مجھے فون آیا۔ اُن دنوں وہ یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ، لندن میں جنرل منیجر تعینات تھے۔ میری ان سے پہلی ملاقات 1986ء میں پیر صاحب پگاڑو کی سالگرہ کے موقعہ پر 'کنگری ہاؤس' کراچی میں ہوئی۔ انہوں نے اپنا تعارف کروائے بغیر کہا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ ایک ملٹری ماڈل جیپ میں سوار ہیں اور آپ کی ایک ٹانگ جیپ کے اندر اور دوسری جیپ سے باہر ہے، مجھے یہ دکھائی دے رہا ہے کہ آپ کو اقتدار میں

آنے اور جانے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ اُس وقت میں ریلوے کا وفاقی وزیر تھا اور پیر صاحب پگاڑو کی عزیز داری، وزیرِ اعظم جونیجو کی قربت اور علاقائی طور پر دونوں اضلاع ملتان اور خانیوال پر مکمل گرفت کی وجہ سے سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں وزارت سے ہاتھ دھو سکتا ہوں۔ لیکن جب چند دنوں بعد کابینہ میں ردّ و بدل ہوا تو اس میں میرا نام نہیں تھا۔ میں اُس وقت سے اُن کا مداح ہوں اور اُن کی پیشین گوئیاں سن کر حیران ہوتا ہوں۔

میں نے میمن صاحب سے فون پر دریافت کیا کہ اس وقت آپ کی نئی پیشین گوئی کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ملک میں خون خرابہ (bloodshed) ہونے والا ہے اور میں وزیرِ اعظم کو ننگے پاؤں اور ننگے سر گھومتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ میں نے ایوانِ صدر کی ایک تقریب میں وزیرِ اعظم سے اس بات کا ذکر کیا تو صدر لغاری نے کہا کہ میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ مگر وزیرِ اعظم نے کہا کہ آپ مجھے اُن سے پوچھ کر بتائیں کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ میں نے ممتاز میمن سے وزیرِ اعظم کے کہنے پر اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ لگتا ہے اُن کا بہت قریبی عزیز قتل ہوگا، لہٰذا انہیں کہہ دیں کہ وہ ملک کے امن و امان کے لیے انتظامات سخت کر دیں۔ میں نے وزیرِ اعظم کو اُن کے اس جواب سے مطلع کر دیا۔ چند دنوں بعد مرتضیٰ بھٹو کا قتل ہو گیا جن کی تعزیت کے لیے میں لاڑکانہ پہنچا۔ جونہی وزیرِ اعظم نے مجھے دیکھا تو کہا کہ یہ کیا ہو گیا، آپ نے چند دن پہلے ہی مجھ سے اس بات کا ذکر کیا تھا۔ مجھے خود بھی بڑی حیرانی ہوئی کہ اتفاق سے ممتاز میمن کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔ وزیرِ اعظم نے مجھ سے کہا کہ ممتاز میمن سے آئندہ آنے والے حالات کے بارے میں پیشین گوئی لوں۔ میں نے ممتاز میمن سے رابطہ کیا تو انہوں نے مجھے کہا کہ وزیرِ اعظم 4 رنومبر 1996ء سے قبل عمرہ کی ادائیگی کے لیے جائیں اور وہاں اللہ تعالیٰ سے دعا کریں۔ مانگیں۔ میں نے وزیرِ اعظم کو مطلع کر دیا۔ اسی دوران وزیرِ اعظم کے ملٹری سیکرٹری (ایم ایس) تبدیل ہو گئے۔ جب نئے ایم ایس نے چارج سنبھالا تو اُنہوں نے مجھ سے رابطہ کر کے کہا کہ وزیرِ اعظم کے پروگرام میں ملک سے باہر جانے اور تاریخ آپ سے کنفرم کرنے کا لکھا ہے۔ میں نے تاریخ بتا دی مگر وزیرِ اعظم بوجہ مصروفیات عمرہ کی ادائیگی پر نہ جا سکیں۔

مرتضیٰ بھٹو کے قتل کے بعد حکومت سیاسی لحاظ سے خاصی کمزور ہو گئی۔ وزیرِ اعظم شدتِ غم سے دلبرداشتہ ہو گئیں۔ میں انہیں ملنے 'وزیرِ اعظم ہاؤس' اسلام آباد گیا تو انہوں نے مجھے کہا کہ

میں آئندہ انتخابات میں حصہ نہیں لوں گی، کسی اور کو وزیر اعظم بنا دوں گی اور خود پیچھے ہٹ جاؤں گی۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ چاہے انتخابات میں حصہ لیں یا نہ لیں مگر خود ایسی بات اپنے منہ سے نہ نکالیں۔ میرے اصرار پر انہوں نے کہا کہ میں آپ کے ساتھ ضد نہیں کرتی مگر میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ میں آئندہ انتخاب نہیں لڑوں گی۔ مجھے آصف زرداری علیحدہ لے گئے اور کہنے لگے کہ اس وقت وہ بہت پریشان ہیں کیونکہ اُن کا جوان بھائی قتل ہو گیا ہے، کچھ عرصے بعد وہ ٹھیک ہو جائیں گی، ابھی آپ اُن سے ضد نہ کریں۔

1995ء میں میرے دورۂ عمان کے دوران خصوصی طور پر شہنشاہ شاہ حسین سے میری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں انہوں نے پاکستان کی بے حد مدد کی تھی۔ میں نے وہاں ایک استقبالیے میں ملائیشیا کے صدر مہاتیر محمد سے بھی ملاقات کی۔ اس دورے کے دوران Dead Sea (بحیرۂ مُردار) جانے کا بھی موقعہ ملا۔ وہاں جگہ جگہ جلدی بیماریوں کے علاج کے لیے کلینک بنائے گئے تھے جو دنیا بھر سے آئے ہوئے مریضوں سے بھرے ہوئے تھے۔ وہاں مشہور تھا کہ بحیرۂ مُردار کی مٹی میں ایک خاص تاثیر ہے جس سے جلدی بیماریوں کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ میں نے اپنے وفد کے ہمراہ اس سمندر میں تیراکی کی۔

1995ء میں نئے سال کے آغاز پر دولتِ مشترکہ کی طرف سے رکن ممالک کے سپیکرز کو سڈنی بندرگاہ، آسٹریلیا میں مدعو کیا گیا۔ نیو ائیر نائٹ کے موقعہ پر وہاں کئی بحری جہاز چلائے جاتے ہیں، ان میں بیٹھ کر لائٹ شو دیکھنا دنیا کے بہترین مناظر میں شمار ہوتا ہے۔ پوری دنیا سے سیاح اس مقام پر کئی دن پہلے ہی پہنچنا شروع ہو جاتے ہیں۔ میں نے اور سیکرٹری قومی اسمبلی عبدالرؤف لغمانی نے بحری جہاز کے لیے بکنگ کروائی اور مقررہ وقت پر اس میں سوار ہو گئے۔ ہمیں بحری جہاز کے اندر رنگارنگ پروگرام دکھائے گئے، عشائیے کا بھی خاص اہتمام تھا اور ساتھ ہی لائٹ شو بھی دکھایا گیا جو واقعی دنیا کے چند یادگار مناظر میں سے ایک خوبصورت منظر تھا۔ میری آنکھیں اس منظر کو ابھی تک نہیں بھول پائیں۔ جب ہم پروگرام کے اختتام پر بندرگاہ پہنچے تو وہاں کی دنیا بدل چکی تھی۔

اسی سال میرے پرائیویٹ سیکرٹری نے مجھے سعودی عرب کے ایک وفد کی آمد کی اطلاع دی۔ میں نے وفد سے ملاقات کی تو معلوم ہوا کہ اُن کا تعلق 'رابطہ عالم اسلامی' سے ہے۔

اُن میں سے ایک رکن اَمین اتاس ڈپٹی سیکرٹری 'رابطہ عالم اسلامی' تھے۔انہوں نے کہا کہ ہم وزیرِ اعظم سے ملاقات کرنا چاہتے تھے جو نہیں ہو سکی۔انہوں نے مزید کہا کہ ہم حکومتِ پاکستان کو گھروں کی تعمیر کے لیے کثیر رقم دیتے ہیں تاکہ وہ بہاریوں کے لیے مکانات تعمیر کروائیں مگر حکومت اس کے باوجود بہاریوں کو ملک میں نہیں لا رہی، ہم اس پالیسی کی وجہ سے اس کثیر رقم کو روک لیں گے جو ہم پاکستان کو دے رہے ہیں۔ میں نے اُنہیں یقین دہانی کروائی کہ میں آپ کا پیغام وزیرِ اعظم تک پہنچا دوں گا۔مگر وہ اپنا مطالبہ دوہراتے رہے۔انہوں نے جاتے ہوئے اپنے وفد کے دوسرے ارکان سے بھی میرا تعارف کروایا۔اُن میں سے ایک شخص وہ بھی تھے جس کے خاندان کے ایک فرد کو آقائے نامدار رسول کریمؐ نے فتح مکہ کے موقعہ پر خانہ کعبہ کی کنجی دی تھی جو آج بھی اُس خاندان کے پاس ہے۔دوسرے روز مجھے اُن کی طرف سے ایک فیکس موصول ہوا جس میں انہوں نے مجھے 'غسل کعبہ' میں شمولیت کی دعوت دی۔

اس کے چند دنوں بعد میری 'گورنر ہاؤس' لاہور میں وزیرِ اعظم سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے 'رابطہ عالم اسلامی' کے وفد سے ہونے والی ملاقات کا تفصیلی ذکر کیا۔انہیں بڑی خوشی ہوئی کہ میرے سپیکر کو 'رابطہ عالم اسلامی' نے غسل کعبہ میں شمولیت کی دعوت دی ہے۔انہوں نے کہا کہ مجھے میرے پہلے دور میں خانہ کعبہ کے اندر جانے کی اجازت نہیں ملی تھی اور اس دور میں بھی نہیں ملی اور نہ ہی ابھی تک صدر لغاری کو اجازت ملی ہے، میری خواہش ہے کہ آپ 'رابطہ عالم اسلامی' سے میرے لیے بھی اجازت لیں۔ میں نے اُن سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ وزیرِ اعظم ہونے کی حیثیت سے انہیں دفترِ خارجہ سے رجوع کرنا چاہیے۔ ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ اگر کوئی اور نام آپ کے ذہن میں ہو تو ہم اُسے اجازت دے دیں گے۔ میں نے اپنے بھائی سیّد احمد مجتبیٰ کا نام دے دیا جو انہوں نے فوراً منظور کر لیا۔میرا بھائی اس سے پہلے پاکستان سے باہر نہیں گیا تھا۔وہ خوش قسمت ہے کہ 'حجِ اکبر' اور 'غسلِ کعبہ' کی سعادت حاصل کرنے کے لیے ملک سے پہلی بار باہر گیا۔

ہمیں خادم الحرمین الشریفین شاہ فہد نے حج کے بعد منیٰ میں اپنے محل میں ضیافت دی۔ جس میں وہاں آئے ہوئے تمام مندوبین کو مدعو کیا۔حکومتِ پاکستان کی طرف سے وزیرِ دفاع آفتاب شعبان میرانی، وزیرِ حج و مذہبی اُمور سیّد خورشید شاہ اور چیف آف آرمی سٹاف جنرل

عبدالوحید کاکڑ اور میں 'رابطہ عالم اسلامی' کی طرف سے شامل تھا۔ میں نے بس میں جاتے ہوئے 'رابطہ عالم اسلامی' کے نمائندے سے دریافت کیا کہ کیا میں شاہ فہد سے وزیرِ اعظم کی خانہ کعبہ کے اندر عبادت کرنے کی خواہش کے بارے میں بات کروں یا نہ کروں؟ انہوں نے کہا کہ شاہ فہد سے مصافحہ کرنے کے علاوہ آپ کو موقعہ ہی نہیں ملے گا کہ آپ ان سے بات کر سکیں۔ میں نے بات کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ جب شاہ فہد نے سب سے مصافحہ کر لیا اور ہال خالی ہو گیا۔ مترجم نے مجھے اشارتاً کہا کہ آپ بھی مصافحہ کر لیں۔ شاہ فہد ایک گیلری کے راستے ضیافت ہال کی طرف چل پڑے تھے جس میں دو آدمیوں کے چلنے کی گنجائش تھی۔ میرا اُن سے چلتے چلتے تعارف کروایا گیا۔ جب انہوں نے مجھ سے ملاقات کر لیا تو میرے منہ سے بے ساختہ نکلا کہ آپ کو صحیح معنوں میں خادم الحرمین کہا جاتا ہے، میں نے حج کے موقعہ پر کیے گئے انتظامات کی تعریف کی۔ وہ ایک لمحے کے لیے رُک گئے اور کہا کہ مجھ سے ایسی بات کسی اور نے نہیں کہی بلکہ ہمیشہ تنقید ہی کی ہے، میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ کو ہماری مشکلات کا احساس ہے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں وزیرِ اعظم کی ایک خواہش آپ کے گوش گذار کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے بڑی فراخ دلی سے اجازت دے دی۔ میں نے کہا کہ وہ خانہ کعبہ کے اندر عبادت کرنا چاہتی ہیں۔ شاہ فہد نے کہا کہ یقیناً! کیوں نہیں، وہ جب بھی چاہیں ان کے لیے خانہ کعبہ کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا، اس دوران ہم ضیافت ہال میں داخل ہو گئے اور اُن تمام شخصیات کے ساتھ مل کر کھانا کھایا جو پہلے شاہ فہد سے ملاقات کر چکی تھیں۔

پاکستان واپسی پر وزیرِ اعظم میرے دفتر تشریف لائیں اور مجھے حج کی مبارکباد دی۔ میں نے اُنہیں شاہ فہد کی طرف سے اُن کے لیے خانہ کعبہ کے دروازے کھولنے کی اجازت مل جانے کی خوشخبری دی جس پر وہ بہت خوش ہوئیں اور اپنے پرس میں سے ہیروں اور فیروزوں سے جڑی ایک تسبیح مجھے دیتے ہوئے کہا کہ یہ مجھے شاہ فہد نے اُس وقت دی جب میں چند روز قبل عمرے کی ادائیگی کے لیے گئی تھی، میں اُن سے ملاقات کے وقت تسبیح پڑھ رہی تھی، انہوں نے مجھ سے وہ لے کر اس کی جگہ یہ دے دی اور کہا کہ یہ تسبیح آپ کے شایانِ شان ہے۔ وزیرِ اعظم نے مجھے کہا کہ یہ آپ میری طرف سے اپنی بیگم صاحبہ کو تحفے میں دے دیں۔

کچھ دنوں بعد وزیرِ اعظم نے مجھے ایک ضیافت میں کہا کہ مجھے پھر اجازت نہیں دی گئی

کہ میں خانہ کعبہ کے اندر عبادت کر سکوں۔ میری سعودی عرب کے سفیر یوسف متقبانی سے دوستی تھی۔ وہ گزشتہ سات سال سے اسلام آباد میں تعینات تھے۔ ہم ایک مرتبہ مالدیپ کے جزیرے میں اکٹھے رہ چکے تھے۔ میں نے انہیں اس واقعہ کی مکمل تفصیل بیان کی۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ سعودی ائرلائنز کے جنرل منیجر پاکستان آئے ہوئے ہیں، آپ ایک خط شاہ فہد کے نام لکھیں اور اپنی سابقہ ملاقات جو آپ نے اُن سے منیٰ میں کی تھی، کا حوالہ دیں اور آئندہ کی تاریخ جس پر وزیرِ اعظم عمرے کی ادائیگی کے لیے جانا چاہتی ہیں وہ بھی تحریر کریں۔ یہ خط آپ چیف آف پروٹوکول سعودی عرب کے نام بھیجیں اور پاکستان کے سفیر شاہد امین سے فون پر کہیں کہ وہ یہ خط انہیں پہنچا دیں۔ میں نے پاکستان کے سفیر کو فون کر کے تفصیلاً آگاہ کیا جس سے اتفاق کرتے ہوئے انہوں نے وہ خط شاہ فہد تک بذریعہ چیف آف پروٹوکول سعودی عرب پہنچا دیا۔ جب وزیرِ اعظم عمرہ ادا کرنے گئیں تو ان کے لیے خانہ کعبہ کے دروازے کھول دیے گئے۔

اسلام آباد میں شیخ زید بن سلطان النہیان کے اعزاز میں وزیرِ اعظم نے ظہرانہ دیا۔ وزیرِ اعظم کے دائیں طرف شیخ زید اور بائیں طرف میں بیٹھا ہوا تھا۔ وزیرِ اعظم نے شیخ زید سے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ میرے سپیکر نہ صرف روحانی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ بہت اچھے شاعر بھی ہیں۔ محترمہ مجھے واقعی شاعر سمجھتی تھیں کیونکہ میں کئی مواقع پر اُن کی موجودگی میں اشعار پڑھ چکا تھا لیکن انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اشعار میرے اپنے نہیں ہیں۔

میں بہت پریشان ہوا اور میں نے وزیرِ اعظم سے سرگوشیانہ انداز میں کہا کہ میں شاعر نہیں ہوں۔ انہوں نے کہا کہ اَب تو بات ہو چکی ہے۔ ہمیں یہ خیال نہ تھا کہ اس تعارف کے بعد اس موضوع پر مزید کوئی گفتگو ہو سکتی ہے۔ شیخ زید کے مترجم نے مجھے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ عزت مآب دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ آپ انگریزی میں شاعری کرتے ہیں یا اُردو میں؟ میں نے جواب دیا کہ دونوں میں۔ مترجم نے مزید دریافت کیا کہ آپ رومانوی شاعری بھی کرتے ہیں؟ میں نے کہا کہ جی ہاں۔ مجھے پریشانی تھی کہ گفتگو طویل ہوتی جا رہی ہے۔ اُس محفل میں وزیرِ اعظم کی بات پر پورا اُترنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ مترجم نے کہا کہ عزت مآب آپ کے تازہ کلام جس میں آپ کی رومانوی شاعری ہو، کا کوئی شعر سننا چاہتے ہیں۔ میں نے ایک شعر جو مجھے یاد تھا وہ سنایا جو یہ تھا:

؎ تجھے چاہا تیری دہلیز پہ سجدہ نہ کیا
وہ میرا عشق تھا یہ میری خودداری ہے

اب مسئلہ دَرپیش تھا کہ اس کا ترجمہ کرکے شیخ زید کو کون سنائے گا۔ آصف زرداری نے کہا کہ یہ کام میں انجام دونگا۔ انہوں نے ترجمہ کیا۔ مترجم نے کہا کہ شیخ زید کوئی اور شعر سننا چاہتے ہیں۔ میں نے دوسرا شعر سنایا:

؎ یہ تو ہو ہی گئی تم سے محبت ورنہ
ہم وہ خود سر ہیں کہ اپنی بھی تمنا نہ کریں

اس پر شیخ زید نے کہا کہ سپیکر صاحب! آپ کی رومانوی شاعری میں بڑا تکبر ہے، یہ شاعری عرب مزاج اور ماحول کے مطابق نہیں ہے، ہماری شاعری میں انکساری ہے۔ انہوں نے بھی کچھ رومانوی اشعار سنائے جس میں ننگے پاؤں، ریگستان اور پھٹے کپڑوں کا ذکر تھا۔ جب بات طویل ہونے لگی تو وزیرِ اعظم نے کہا کہ ہمیں اس موضوع پر مزید گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ میں پہلے ہی دعا کر رہا تھا کہ میری جان بخشی ہو، وہ اللہ تعالیٰ نے سن لی۔ مہمانوں پر بھی میری دھاک بیٹھ گئی۔ میں نے انہیں یہ احساس نہ ہونے دیا کہ میں شاعر نہیں ہوں۔

دلچسپ بات اُس وقت پیش آئی جب ائر پورٹ پر میں نے گورنر چوہدری الطاف حسین کو یہ تمام واقعہ سنایا۔ اس وقت تک شیخ زید ائر پورٹ نہیں پہنچے تھے اور ہم انہیں رخصت کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ میں نے گورنر پنجاب سے دریافت کیا کہ اگر شیخ زید مجھ سے یہ مطالبہ کریں کہ مجھے اپنا دیوان بھجوائیں تو اس کا میرے پاس کیا جواب ہوگا؟ انہوں نے کہا کہ سپیکر صاحب! آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، آپ کسی کا دیوان خرید کر اُس پر اپنی تصویر چھپوالیں اور انہیں ارسال کر دیں۔ یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ شیخ زید تشریف لے آئے۔ وزیرِ اعظم اُنہیں سب سے ملواتی جا رہی تھیں۔ جب انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا تو کہا کہ سپیکر صاحب! آپ مجھے اپنا دیوان ضرور بھجوائیں۔ میں نے جواب دیا کہ جی ضرور۔ اُس کے بعد وہ طیارے کی جانب بڑھ گئے۔

مجھے 1995ء میں اقوامِ متحدہ کی گولڈن جوبلی کے موقعہ پر آئی پی یو کی طرف سے نیویارک میں خطاب کرنا تھا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اقوامِ متحدہ میں ہندوستان کے وفد میں سپیکر

لوک سبھا شیوراج پاٹیل کے ہمراہ قائد حزبِ اختلاف اٹل بہاری واجپائی بھی شامل ہیں۔ میں نے فوری طور پر اپنی حکمتِ عملی تبدیل کر دی اور یہ لائحہ عمل طے کیا کہ پاکستان کی طرف سے میرے علاوہ نوید قمر اور اعجاز الحق اقوامِ متحدہ سے خطاب کریں گے۔ میں نے اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے مستقل مندوب احمد کمال سے کہا کہ میری تقریر کو تین حصوں میں تقسیم کر دیں۔ کچھ صحافیوں نے سپیکر کی تقریر میں تبدیلی کو سازش قرار دیتے ہوئے خبر لگوا دی کہ ہندوستان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے احمد کمال نے ہندوستان کے سفیر سے تقریر تبدیل کروائی ہے۔ اخبارات میں واویلا شروع ہو گیا کہ احمد کمال کو برطرف کیا جائے۔

میں نے پاکستان واپس آ کر قومی اسمبلی میں اس معاملے پر بحث شروع کروا دی۔ بحث میں اُن ارکان نے بھی حصہ لیا جو میرے ساتھ امریکہ جانے والے وفد میں شامل تھے۔ دورانِ بحث پیپلز پارٹی کے نوید قمر، نوریز شکور اور اَسد عابد نے کہا کہ تقریر میں تبدیلی ہم سب کی مشاورت سے ہوئی تھی۔ حزبِ اختلاف نے احتجاج کیا کہ اس تبدیلی میں وہ شامل نہیں تھی۔ فیصلہ ہوا کہ حزبِ اختلاف کے ایم این اے اعجاز الحق سے دریافت کیا جائے کہ تقریر کی تبدیلی میں انہیں شامل کیا گیا تھا یا نہیں؟ جب اعجاز الحق ایوان میں جواب دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو حزبِ اختلاف نے اُن پر دباؤ ڈالا کہ وہ اُن کے مؤقف کی تائید کریں مگر انہوں نے نہایت ہی صاف گوئی سے وہ بات بیان کی جو اقوامِ متحدہ میں پیش آئی تھی۔ اُن کے اس بیان سے نہ صرف احمد کمال من گھڑت الزام سے بری ہوئے بلکہ ایک سفارت کار کی ساکھ بھی بحال ہوئی۔

اقوامِ متحدہ سے خطاب کے بعد ہم پاک پیک* کی دعوت پر لاس ویگاس گئے۔ یہ تنظیم پاکستانی ڈاکٹروں کی امریکہ میں لابی سمجھی جاتی ہے جس کے امریکن اراکین کانگریس کے ساتھ خاصے مراسم تھے۔ وفد نے ایم جی ایم گرینڈ ہوٹل میں قیام کیا جو اُس وقت دنیا میں کمروں کی تعداد کے لحاظ سے سب سے بڑا ہوٹل تھا۔ وہاں کمروں کی تعداد دس ہزار تھی۔ اس شہر میں دنیا کے سب سے بڑے casinos (جوا خانے) ہیں۔ نواڈا کی سٹیٹ اسمبلی نے میرے وفد کے اعزاز میں استقبالیے کا اہتمام کیا جس میں تقریباً تمام اراکین نے شرکت کی۔ نواڈا کے گورنر مسٹر برائن

* Pakistan Physicians Public Affairs Committee (PAK-PAC)

نے فرمان* جاری کیا جس میں میرے اور میرے وفد کے نام سے منسوب ایک دن مقرر کیا گیا۔ وہاں کی میئر نے مجھے 'لاس ویگاس شہر کی کنجی' پیش کی جو کہ بہت بڑا اعزاز ہے۔

میرے وفد میں حکومت کے علاوہ حزبِ اختلاف، سفارت کار اور پاکستانی کمیونٹی شامل تھی۔ حکومت کی طرف سے نوید قمر، نوریز شکور اور اسد عابد، حزبِ اختلاف کی طرف سے اعجاز الحق، سفارت کاروں کی طرف سے امریکہ میں پاکستان کی سفیر ملیحہ لودھی، کونسلر (پولیٹیکل) سیّد جلیل عباس جیلانی اور پاکستانی کمیونٹی کی طرف سے پاک پیک کے صدر ڈاکٹر اکرام نمائندگی کر رہے تھے۔ اس دورے کے دوران واشنگٹن میں ہماری سینیٹرز و اراکین کانگریس کے ساتھ امریکی 'براؤن ترمیم' پر بات ہوئی۔ ہم نے امریکی 'پریسلر ترمیم' میں 'براؤن ترامیم' کے ذریعے چند ترامیم کروانے کے لیے کوشش کی جس کے ذریعے پاکستان پر کئی قدغنیں لگائی گئی تھیں جن میں دفاعی سامان کی ترسیل اور دوسری تجارتی پابندیوں کا لگایا جانا شامل تھا۔ اس دورے کے دوران ہمارے وفد کی تقریباً اٹھائیس اراکینِ کانگریس بشمول فارن افیئرز کمیٹی برائے سینٹ اور ہاؤس کمیٹی برائے انٹرنیشنل افیئرز سے ملاقات کروائی گئی۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ صرف ڈیڑھ دن کے دورانیے میں یہ ملاقاتیں کروائی گئیں جو ایک ریکارڈ ہے کہ کسی پاکستانی سیاستدان کو اتنے کم وقت میں اتنی زیادہ تعداد میں اراکین کانگریس سے ملوایا گیا ہو۔ اس تمام پروگرام کو پاک پیک نے ملیحہ لودھی اور جلیل عباس کے ساتھ مل کر ترتیب دیا۔ جلیل عباس نے میرے لیے ایک پریس کانفرنس کا اہتمام بھی کیا۔

میں امریکہ سے واپسی پر ایک ضیافت میں شریک تھا، وہاں وزیرِ اعظم سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ کی حکومت کتنی مضبوط ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس کا دارومدار امریکہ میں 'براؤن ترمیم' پاس ہونے پر ہے۔ اور مزید کہا کہ مجھے امریکہ سے رپورٹ موصول ہوئی ہے جس کے مطابق وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ترمیم پاس ہو جائے گی۔ میں نے وہاں بیٹھے ہوئے مہمانوں سے کہا کہ اراکینِ کانگریس نے اس ترمیم کو پاس کرنے کی حامی بھری ہے، لہٰذا یہ ترمیم پاس ہو جائے گی۔ گفتگو کے دوران ہی امریکہ سے اطلاع موصول ہوئی کہ 'براؤن ترمیم' پاس ہو گئی ہے۔ وہاں پر موجود مہمانوں نے میرے تجزیے کو بہت سراہا۔

---

* Proclamation

کچھ عرصے بعد پاک پیک (جنہوں نے براؤن ترمیم پاس کروانے میں اہم کردار ادا کیا تھا) نے پاکستان کا دورہ کیا۔ میں نے اُن کے اعزاز میں عشائیہ دیا جس میں صدر، وزیرِ اعظم، چیئرمین سینٹ، اراکینِ حزبِ اقتدار وحزبِ اختلاف اور سفیر ملیحہ لودھی نے بھی شرکت کی اور پاک پیک کے کردار کو سراہا۔

اسی سال دولتِ مشترکہ کی طرف سے دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے پچاس سال مکمل ہونے پر لندن، برطانیہ میں ایک عالمی تقریب منعقد ہوئی۔ اس تقریب میں تقریباً 64 ممالک کے مندوبین شریک ہوئے۔ پاکستان کی نمائندگی میں نے اور میری اہلیہ نے کی۔ ہمیں ایک جلوس کی شکل میں مئیر کی دعوت میں لے جایا گیا۔ سڑک پر کھڑے ہوئے ہزاروں لوگوں نے ہاتھ ہلا ہلا کر ہمارا استقبال کیا۔ اس استقبالیے میں ہماری ملاقات برطانوی وزیرِ اعظم جان میجر اور قائدِ حزبِ اختلاف ٹونی بلیئر (موجودہ وزیرِ اعظم) سے ہوئی۔ دوسرے روز ایک تقریب ملکہ برطانیہ الزبتھ کی طرف سے 'بکنگھم پیلس' میں ہوئی۔ اس موقعہ پر مادرِ ملکہ الزبتھ اوّل کے ساتھ مجھے اور میری اہلیہ کو بٹھایا گیا، یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ دوسری جنگِ عظیم میں وہ خود برطانیہ کی ملکہ تھیں۔ ہمیں اس تقریب میں مادرِ ملکہ کے ساتھ اظہارِ خیال کا موقعہ ملا۔ اُس وقت ان کی عمر پچانوے برس تھی اور وہ بالکل تندرست تھیں۔ اُسی میز پر میرے ساتھ ہی اُردن کے شاہ حسین کی نشست تھی۔ ایک اور استقبالیے میں میری اور میری اہلیہ کی ملاقات شہزادی ڈیانا سے ہوئی۔ میں نے اُنہیں پاکستان آنے کی دعوت بھی دی۔

اسی سال دہلی میں دولتِ مشترکہ کے رکن ممالک کے سپیکرز کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس دوران لوک سبھا ہندوستان کے اُس وقت کے قائدِ حزبِ اختلاف اٹل بہاری واجپائی نے ہمیں عشائیہ دیا۔ میرے وفد میں اراکینِ قومی اسمبلی اَسفندیار ولی، تھرپارکر سے رانا چندر سنگھ (جو مہاراجہ جے پور کے کزن ہیں) کراچی سے جماعتِ اسلامی کے ایک رکن مظفر حسین اور جاوید علی شاہ شامل تھے۔ جہاں لوک سبھا کے علاوہ بھارت کی راجیہ سبھا کے اراکین بھی موجود تھے۔ تقریب میں بھارت کی نائب صدر اور راجیہ سبھا کی چیئرپرسن مسز نجمہ ہیبت اللہ بھی شریک تھیں۔ وہ مولانا ابوالکلام آزاد کی نواسی ہیں۔ اُن کا تعلق کانگریس آئی سے ہے اور وہ صدر آئی پی یو بھی رہ چکی ہیں۔ اٹل بہاری واجپائی نے جو کہ نہایت نفیس اور دھیمے مزاج کے شخص ہیں، مسز ہیبت اللہ سے کہا کہ یہ

پاپڑ کھائیے۔ پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے ہاں جس مہمان سے جان چھڑانی ہو ہم اسے پاپڑ کھلاتے ہیں۔ پھر مسز نجمہ ہیبت اللہ کی طرف گویا ہوئے کہ یہ پاپڑ کھائیے اور ہماری جان چھوڑیئے۔ اَز راہِ مذاق مجھ سے کہنے لگے کہ یہ لوگ جائیں گے تو ہمیں حکومت کرنے کا موقعہ ملے گا۔

ہندوستان کے صدر اور وزیرِ اعظم نے دولتِ مشترکہ کے سپیکرز کے اعزاز میں الگ الگ عشائیے بھی دیے۔ جب ہندوستان کے وزیرِ اعظم نرسیما راؤ نے عشائیہ دیا تو اُس کے اختتام پر گروپ فوٹو بھی لیا گیا۔ ہم سب اُن کے ہمراہ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور ہمارے پیچھے قائد حزبِ اختلاف اٹل بہاری واجپائی بھی کھڑے تھے۔ انہوں نے ہم میں سے کسی سے کہا کہ آپ مجھ سے بھی مصافحہ کر لیں کیونکہ میں مستقبل میں بھارت کا وزیرِ اعظم ہوں گا۔ اس کانفرنس کے موقعہ پر شیوراج پاٹیل لوک سبھا کے سپیکر تھے۔

مجھے ہینسائیڈل فاؤنڈیشن (Heinsidel Foundation) کی طرف سے 1995ء میں جرمنی کا دورہ کرنے کی دعوت دی گئی۔ یہ ادارہ دُنیا میں جمہوریت کو مستحکم و مضبوط کرنے، سیاسی جماعتوں کی کارکردگی بہتر بنانے اور اُن کی بہتر تنظیم سازی کرنے میں فعال کردار ادا کرتا ہے اور ان سیاسی جماعتوں کی طرف سے مختلف قومی اور بین الاقوامی مسائل پر مباحثوں کا اہتمام کرتا ہے۔ میرے وفد میں جاوید ہاشمی اور میری اہلیہ شامل تھیں۔ اُس دورے کے دوران وہاں کی پارلیمنٹ، سیاسی پارٹیوں اور لوکل گورنمنٹ کے کام کرنے کا طریقۂ کار دیکھنے کا موقعہ ملا۔ ہمیں جرمنی کے صدر کے علاوہ حکومت کے سرکردہ لوگوں سے بھی ملوایا گیا۔ پارلیمنٹ اور کئی میونسپل کمیٹیوں کا دورہ کروایا گیا اور کئی سیمیناروں میں بھی لے جایا گیا جہاں بین الاقوامی موضوعات پر پارٹی کارکن بحث میں حصہ لے رہے تھے۔ جرمنی کے نظام میں جو بات سب سے اہم تھی وہ ووٹروں کی تعداد کے تناسب سے قومی بجٹ میں پارٹیوں کے لیے رقم مختص کرنا تھی۔ اس رقم سے پارٹیوں کو فعال اور منظم کیا جاتا ہے۔ ہمیں بھی ایسے اقدامات کی پیروی کرنی چاہیے جو جمہوری روایات کو تقویت دیں۔

1996ء میں ایران کی پارلیمنٹ کے سپیکر ناطق نوری میری دعوت پر پاکستان آئے اور انہوں نے مجھے بھی اُسی سال ایران کی پارلیمنٹ سے خطاب کی دعوت دی۔ میں نے دعوت قبول

کرتے ہوئے ایک وفد کے ہمراہ ایران کا دورہ کیا۔میرے وفد میں سیّد ظفر علی شاہ، ریاض پیرزادہ، ملک محمد اسلم خان آفریدی، ارباب محمد ظاہراور چوہدری علی اکبر وینس شامل تھے۔ ہماری وہاں کئی اہم شخصیات سے ملاقات کروائی گئی۔ میں نے ایران کی پارلیمنٹ سے خطاب بھی کیااور میرے وفد کو ایران کی پارلیمنٹ کے اندر بیٹھنے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ مجھے میری خواہش پر اصفہان اور مشہد لے جایا گیا۔ہمیں دورۂ مشہد کے دوران حضرت امام علی رضا علیہ السلام کے روضۂ مقدس پر نماز ادا کرنے کے لیے لے جایا گیااور ہماری ملاقات وہاں کے رہبر سے کروائی گئی۔ میں نے وہاں منبر پر کھڑے ہو کر لاکھوں افراد کے اجتماع سے خطاب بھی کیا۔ریاض پیرزادہ جو تسنیم نواز کی مدد کرنے پر مجھ سے ناراض تھے، نے کہا کہ آپ کو حضرت امام علی رضا علیہ السلام کے روضۂ مبارک پر خطاب کرنے کا جو موقعہ ملا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امامؑ آپ سے راضی ہیں۔

سپیکر ہاؤس آف کامنز برطانیہ، بیٹی بوتھ رونڈ سے میری کئی ملاقاتیں سپیکر کانفرنسوں، آئی پی یو اور سی پی اے کے اجلاسوں میں ہوئیں۔اُن کا تعلق حزبِ اختلاف سے تھا اور اُن کے حلقۂ انتخاب میں پاکستانیوں کی کثیر تعداد تھی۔ وہ نہایت ہی تجربہ کار اور ذہین خاتون ہیں۔اسی وجہ سے وہ حزبِ اختلاف میں رہنے کے باوجود دو مرتبہ سپیکر منتخب ہو چکی تھیں۔ میں نے ان کے ہمراہ کئی ممالک کا دورہ بھی کیا جس میں پاپوانیوگنی، ملائیشیا، سری لنکا اور قبرص شامل تھے۔ برطانوی سپیکر کی پسندیدہ جگہ سری لنکا تھی جہاں وہ ہر سال چھٹیاں گزارنے جایا کرتی تھیں۔ میں 1996ء کے دورۂ برطانیہ کے دوران اُن سے ملاقات کرنے پارلیمنٹ ہاؤس گیا۔اس موقعہ پر انہوں نے مجھے بتایا کہ آپ کی تحفے میں دی گئی سواتی تصویر کو میں نے فریم کروا کے اپنے دفتر میں لگایا ہوا ہے۔ جب وزیرِاعظم پاکستان بے نظیر بھٹو مجھے ملنے کے لیے میرے دفتر آئیں اور انہوں نے یہ تصویر دیکھی تو خاصی متاثر ہوئیں اور مجھ سے دریافت کیا کہ آپ کو یہ تصویر کہاں سے ملی ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے یہ تصویر آپ کے سپیکر قومی اسمبلی یوسف رضا نے دی ہے۔ جب وزیرِاعظم پاکستان واپسی پر مجھے ملنے کے لیے میرے دفتر آئیں تو کہا کہ گیلانی صاحب! آپ جہاں بھی جاتے ہیں اُن کے لیے اچھے اچھے تحفے لے جاتے ہیں اور اپنی یاد چھوڑ آتے ہیں۔انہوں نے ایک تجویز دی کہ آئندہ ہم دونوں مل کر تحفے خریدیں گے۔ساتھ ہی انہوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ بیرونِ ملک کسی

اہم شخصیت سے ملاقات پر میری طرف سے انہیں دیا گیا ایک قالین کا تحفہ انہوں نے مجھے دکھایا تو اس کا معیار وہ نہیں تھا جو مجھے خریدتے وقت دکھایا گیا تھا۔ انہوں نے مزید کہا کہ اکثر اس قسم کے تحفے سرکاری طور پر دیے جاتے ہیں۔ اُس دن کے بعد سے ہم غیر ملکی شخصیات کو ایک جیسے تحائف دیتے رہے۔

1996ء میں ایم این اے اسد سکندر کی شادی میں شرکت کے لیے کراچی جاتے ہوئے میری اور مصطفیٰ کھر کی جہاز میں نشستیں اکٹھی تھیں۔ اس موقعہ پر مصطفیٰ کھر نے کہا کہ وہ اپنے محکمے میں حکومت کی بار بار مداخلت کے باعث غیر مطمئن ہیں، اس لیے مستعفی ہونا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ نواز شریف سے آپ کے تعلقات اچھے نہیں اور اَب اگر آپ پیپلز پارٹی کی حکومت کو بھی چھوڑ دیں گے تو سیاسی لحاظ سے نقصان میں رہیں گے۔ مصطفیٰ کھر نے مستعفی ہونے کا ارادہ ترک کر دیا۔

انہی دنوں میں نے ملتان کا دورہ کیا۔ مجھے وہاں اطلاع ملی کہ ممتاز آباد، ملتان کی ایک مسجد میں اکیس افراد کو قتل کر دیا گیا ہے۔ مجھے ڈپٹی کمشنر، ملتان جنید اقبال نے پیغام بھیجا کہ اس سانحہ کے سلسلے میں امن کمیٹی میٹنگ میں مصروف ہے کہ آپ کو جنازے میں شرکت کے لیے بلایا جائے یا نہ بلایا جائے؟ کچھ دیر بعد ڈپٹی کمشنر نے اطلاع دی کہ کمیٹی نے آپ کے غیر جانبدارانہ کردار کی وجہ سے آپ کے حق میں فیصلہ دیا ہے۔ میں انتظامیہ کے ہمراہ ممتاز آباد پہنچ گیا۔ جب مسجد سے اکیس جنازوں کو میدان کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو میں بھی اُن کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس دوران کچھ نوجوانوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ آپ نے اراکینِ قومی اسمبلی شیخ رشید، شیخ طاہر رشید اور حاجی محمد بوٹا کے پروڈکشن آرڈر جاری کیے ہیں مگر ہمارے قائد مولانا اعظم طارق کے پروڈکشن آرڈر جاری کیوں نہیں کیے؟ میں ابھی جواب بھی نہ دے پایا کہ کسی شر پسند نے نعرہ لگایا: ''قاتل قاتل حکومت قاتل''۔ یہ کہنا تھا کہ اچانک پتھراؤ شروع ہو گیا میری پیٹھ پر بھی دو تین پتھر لگے۔ ہجوم کا ایک ایسا زبردست ریلا آیا کہ میں ایک زوردار دھکے کے باعث ہجوم سے دور ہو گیا۔ اسی دوران ایک کار میرے قریب آ کر رُکی اور اُس کے دروازے کھل گئے، چند لوگ پہلے ہی سے اس میں سوار تھے۔ انہوں نے ڈپٹی کمشنر کے کہنے پر مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیا اور جونہی کار واپس جنازے کی جگہ جانے لگی تو ڈپٹی کمشنر کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا، اُس نے کار کو رُکوا لیا اور وائرلیس

پر پیغام دے کر میری سرکاری جیپ منگوالی اور مجھے جیپ میں بٹھا کر ائر پورٹ روانہ کر دیا۔ وہاں پرائیویٹ جہاز کا بندوبست تھا جس پر میں اسلام آباد روانہ ہو گیا۔

اُسی روز شام کو قومی اسمبلی کا اجلاس ہونا تھا۔ صدر لغاری نے ایک ریفرنس چیئر مین سینٹ اور سپیکر قومی اسمبلی کو بھجوایا۔ یہ ریفرنس حکومت کی بدعنوانی سے متعلق تھا۔ قانون کے مطابق یہ ریفرنس اسمبلی میں چیئر مین سینٹ اور سپیکر کی طرف سے پڑھا جانا تھا جس سے حکومت گھبرائی ہوئی تھی کیونکہ اپنے ہی صدر کی طرف سے اس قسم کا ریفرنس موصول ہوا تھا۔ جب میں قومی اسمبلی میں اپنے دفتر پہنچا تو کسی کو میرے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کا علم نہیں تھا۔ بس اُن کے سر پر ایک ہی دُھن سوار تھی کہ کسی نہ کسی طریقے سے ریفرنس کو روکا جائے۔ پریس اور حزبِ اختلاف حکومت سے بھی زیادہ بیتاب تھی۔ میں ریفرنس کی اہمیت کو بھانپ چکا تھا۔ میں نے ایوان میں داخل ہوتے ہی ریفرنس پڑھ کر سنا دیا اور اس پر بحث کا وقت مقرر کر دیا۔ تمام معاملات نہایت خوش اسلوبی سے طے پا گئے۔ حزبِ اختلاف اور حزبِ اقتدار دونوں اس ریفرنس پر بحث کے لیے راضی ہو گئے۔ میرے نزدیک مسائل سے چشم پوشی نئے مسائل کو جنم دینے کے مترادف ہے۔ میں نے اس سلسلے میں فوری طور پر خصوصی کمیٹی تشکیل دی جس میں مختلف جماعتوں کے سربراہان کو شامل کیا۔ وزیرِ اعظم اور قائدِ حزبِ اختلاف کی اس قدر معیاری تقاریر تھیں کہ 'ہاؤس آف کامنز' جیسا ماحول پیدا ہو گیا۔

قائدِ حزبِ اختلاف نواز شریف نے خود احتساب بل ایوان میں پیش کیا۔ اس بل کے مطابق احتساب عدلیہ کے ذریعے کروانے، احتساب کا عمل صاف اور شفاف بنانے کے لیے اس کا سربراہ جج یا سابق جج مقرر کرنے کے علاوہ ایک تجویز اور دی گئی کہ احتساب سیل کے سربراہ کی تقرری کے لیے قائد ایوان اور قائد حزبِ اختلاف کا متفق ہونا لازم ہو جس کی حکمت یہ تھی کہ اس سیل کو ایوان کا مکمل اعتماد حاصل ہو۔ اس میں فوج اور عدلیہ کے احتساب کو بھی شامل کیا جانا تھا مگر حکومت کی برطرفی اور اسمبلی تحلیل ہو جانے کی وجہ سے یہ بل پاس نہ ہو سکا ورنہ آج خود کو پاک صاف کہنے والے کئی پردہ نشین بھی احتساب کے کٹہرے میں کھڑے ہوتے۔ اجلاس کے دوران میرے ملتان کے واقعہ کی خبر دی گئی۔ ایوان کے لیے باعثِ حیرت تھا کہ چند گھنٹے پہلے حملہ ہوا اور میں اس کے باوجود اجلاس کی صدارت کر رہا ہوں۔ پورے ایوان نے اس واقعے کی مذمت کی۔

اس واقعہ سے چند ہفتے قبل سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سیّد سجاد علی شاہ نے مجھ سے گھر پر ملاقات کا وقت مانگا۔ میں نے انہیں اُسی شام سپیکر ہاؤس، اسلام آباد چائے کے لیے مدعو کر لیا۔ ججوں کی تقرری کے مسئلہ پر چیف جسٹس کے تعلقات وزیرِ اعظم سے کشیدہ تھے۔ میرے خیال میں وہ اس بات کا جائزہ لینے آرہے تھے کہ اسمبلی تحلیل ہونے کی صورت میں سپیکر کا ردِّ عمل کیا ہوگا۔ میں نے انہیں عِندیہ دیا کہ اسمبلی کو اپنی مدت پوری کرنی چاہیے۔ گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ چیف جسٹس، اٹارنی جنرل قاضی جمیل کے رویّے سے بھی خاصے ناخوش تھے۔ ملاقات کے فوراً بعد وزیرِ اعظم کا فون آیا اور انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ آپ کے دوست کیا فرماتے ہیں؟ اُن دِنوں سب کے فون ٹیپ ہوتے تھے۔ میں نے وزیرِ اعظم سے ملاقات کر کے انہیں چیف جسٹس سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں آگاہ کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ چیف جسٹس نے میرے ساتھ قاضی جمیل کے رویّے کے بارے میں شکایت کی ہے اور کہا ہے کہ اٹارنی جنرل حکومت اور عدلیہ کے درمیان پُل کا کردار ادا کرنے کی بجائے دیوار کا کام کر رہے ہیں۔ وزیرِ اعظم نے میری گفتگو سننے کے بعد اپنا کوئی ردِّ عمل ظاہر نہ کیا۔ دوسرے روز اخبار کی شہ سُرخی تھی ''اٹارنی جنرل، پاکستان قاضی جمیل نے استعفیٰ دے دیا''۔ مجھے وزیرِ اعظم نے فون پر دریافت کیا کہ آپ نے خبر پڑھ لی ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا جس پر وزیرِ اعظم نے کہا کہ اب آپ اپنے دوست کو بتائیں کہ جو وہ چاہتے تھے وہ ہو گیا ہے۔ جب میں نے چیف جسٹس کو فون کر کے یہ اطلاع دی تو انہوں نے کہا کہ سپیکر صاحب! اب بہت دیر ہو چکی ہے۔

حزبِ اختلاف نے قومی اسمبلی کے اجلاس کے لیے ریکوزیشن کی درخواست دے دی۔ میں نے وزیرِ اعظم کو مشورہ دیا کہ آپ صدر صاحب کو مشترکہ اجلاس سے خطاب کرنے کی دعوت دیں تاکہ مجھے حزبِ اختلاف کی طرف سے دی گئی درخواست پر اجلاس نہ بلانا پڑے۔ وزیرِ اعظم نے وزیرِ قانون، وزیرِ پارلیمانی اُمور اور چیف وہپ کو صدر صاحب کے پاس بھیجا کہ وہ انہیں مشترکہ اجلاس سے خطاب کی دعوت دیں۔ صدر صاحب نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ اُن کے پاس وقت نہیں ہے، دوسرا انہیں بیرونِ ملک دورے پر جانا ہے اور تیسرا یہ کہ اس اجلاس کے لیے وہ خود تقریر لکھنا چاہتے ہیں جبکہ برطانیہ جیسے جمہوری ملک میں بھی ملکۂ برطانیہ کو حکومت کی لکھی ہوئی تقریر اجلاس میں پڑھنے کے لیے پیش کی جاتی ہے اور وہ تقریر من وعن پڑھتی ہیں۔ مجھے

وزیرِ اعظم نے صدر صاحب کے مشترکہ اجلاس سے خطاب نہ کرنے کے متعلق اطلاع دی۔ میں نے وزیرِ اعظم سے کہا کہ اگر صدر صاحب آپ کی ایڈوائس پر خطاب نہیں کرتے تو مجھے خدشہ ہے کہ قومی اسمبلی اپنی مدّت پوری نہیں کر سکے گی۔ میں نے وزیرِ اعظم سے مزید کہا کہ آپ حزبِ اختلاف کی فکر نہ کریں کیونکہ میرے ان کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں وہ صدر کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کا معاملہ ایوان میں نہیں اٹھائیں گے، آپ صرف صدر صاحب کو مطمئن کریں کہ جب بھی وہ مناسب سمجھیں مشترکہ اجلاس سے خطاب کریں۔

وزیرِ اعظم نے پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے موریشس کے صدر کو عشائیے پر مدعو کیا۔ عشائیے کے بعد انہوں نے مجھے اپنی صدر لغاری کے ساتھ چند روز قبل ہونے والی ملاقات کے بارے میں اعتماد میں لیا۔ اس ملاقات میں آفتاب شیر پاؤ نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ان کی صدر لغاری سے نہایت ہی کامیاب میٹنگ ہوئی ہے، انہوں نے اکٹھے کھانا کھایا اور تمام غلط فہمیاں دور ہو گئی ہیں، وہ نہایت خوش نظر آ رہی تھیں۔ ہماری گفتگو کے دوران ایک فون آیا جسے سنتے ہوئے وزیرِ اعظم کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہوتے گئے۔ جب انہوں نے فون نیچے رکھا تو میری طرف مخاطب ہو کر کہا کہ میں کتنی خوش تھی مگر چند لوگوں کو میری خوشی راس نہیں آئی اور میرے مخالفین نے دوبارہ سازشیں شروع کر دی ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آفتاب شیر پاؤ کا فون تھا کہ صدر لغاری ناراض ہیں کہ میں نے لاہور میں 'لغاری غدار' اور 'میر مرتضیٰ کا قاتل لغاری' جیسی تحریریں دیواروں پر لکھوا دی ہیں جبکہ آپ خود گواہ ہیں کہ مجھے صدر لغاری سے کوئی بدگمانی نہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے میرے سامنے گورنر پنجاب جنرل (ر) سروپ خان، پنجاب کے سینئر وزیر مشتاق اعوان اور مس ناہید خان کو فون کر کے اس بارے میں دریافت کیا اور برہمی کا اظہار بھی کیا۔ انہوں نے فون سے فارغ ہو کر مجھے کہا کہ آپ میرا ایک کام کریں، آپ صدر لغاری سے رابطہ کریں اور انہیں بطورِ گواہ میری تمام گفتگو کا حوالہ دیں اور بتائیں کہ میرا ان واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

میں نے اپنے گھر سے فون پر ان واقعات کے حوالے سے صدر لغاری سے گفتگو کی جس پر انہوں نے کہا کہ وزیرِ اعظم غلط بیانی سے کام لے رہی ہیں، دراصل انہوں نے خود ہی سپیشل برانچ کے ذریعے یہ تحریریں لکھوائی ہیں۔ مجھے اُن کی غلط فہمی پر خاصا دکھ ہوا۔

مجھے ملتان جانا تھا جہاں پہنچ کر میری کئی اراکینِ قومی اسمبلی سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اُن سے کہا کہ صدر لغاری نے اسمبلی تحلیل کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے لہٰذا آپ آئندہ انتخابات کی تیاری کریں۔

حکومت کی برطرفی سے ایک رات قبل چیف آف آرمی سٹاف جنرل جہانگیر کرامت نے ایک غیر ملکی کمانڈران چیف کے اعزاز میں عشائیے کا اہتمام کیا۔ انہوں نے اپنی کرسی میرے ساتھ رکھوائی اور نہایت رازداری کے ساتھ کچھ باتوں پر مجھے اعتماد میں لیا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ آپ کھانے کے فوراً بعد وزیرِ اعظم سے ملیں اور انہیں بتائیں کہ آپ کی صدر لغاری کے متعلق جو رائے ہے وہ درست نہیں، صدر صاحب نے اسمبلی تحلیل کرنے اور حکومت کو برطرف کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ میں نے یہ پیغام سیکرٹری دفاع سیّد سلیم عباس جیلانی کو بھی دے دیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ وزیرِ اعظم تک یہ بات پہنچا چکے ہوں گے۔ انہوں نے کہا کہ چند دن پہلے نواز شریف کا مری میں فون ٹیپ ہوا تھا جس میں انہوں نے کہا کہ رئیس (صدر) نے اسمبلی تحلیل کرنے، نئے انتخابات کروانے کا وعدہ کیا ہے اور دوسرا انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ (آئی ایم ایف) کے وفود کے ساتھ ملاقات میں صدر نے حکومت کی کارکردگی پر عدم اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ اس عشائیے سے قبل وزیرِ اعظم نے مجھے فون کرکے کہا کہ میرے پاس ایک مخبر آیا ہوا ہے، اس نے مجھے اطلاع دی ہے کہ صدر حکومت کو برطرف کر رہے ہیں جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں کہ اس مخبر کی بات پر یقین کروں یا آپ پر؟ چونکہ میں انہیں ہمیشہ ایک ہی مشورہ دیتا رہا کہ آپ صدر صاحب پر اعتماد کریں۔ میں نے دوبارہ صدر صاحب پر اعتماد کرنے کو کہا۔

جنرل جہانگیر کرامت نے یہ بھی کہا کہ آپ وزیرِ اعظم سے یہ بات بھی کریں کہ میں، صدر اور آپ کے درمیان ضامن کا کردار ادا کرنے کو تیار ہوں۔ یہی بات انہوں نے اس وقت بھی کی جب صدر لغاری اور وزیرِ اعظم نواز شریف کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے اور وہ اُن کے درمیان ضامن بنے تھے۔ دوسری مرتبہ ترکی کے قومی دن کے موقعہ پر جنرل جہانگیر کرامت نے پھر وہی بات دوہرائی کہ اگر میں صدر لغاری اور وزیرِ اعظم بے نظیر بھٹو کے درمیان ضامن ہوتا تو صدر صاحب اسمبلی تحلیل نہ کرتے۔ میں نے جب اس بات کا ذکر بے نظیر بھٹو سے کیا تو انہوں نے کہا کہ مجھے اس بات پر شرم آتی ہے کہ میں اپنے ہی صدر کی ضمانت آرمی چیف سے لیتی

پھروں۔

میں نے 3 رنومبر 1996ء کو حزبِ اختلاف کی دی گئی ریکوزیشن درخواست پر قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا۔قومی اسمبلی میں آگ لگنے کے بعد ہال کی مکمل طور پر تزئین و آرائش میں تقریباً دو سال لگے ۔مرمت کے دوران ہال کی چھت پر خطاطی کا عمدہ کام بھی کروایا گیا۔ وزیرِ اعظم نے اُسی روز نئے ہال کا افتتاح کیا اور یہ اجلاس بھی اسی نئے ہال میں کروایا گیا۔میں نے حزبِ اختلاف کے رہنما چوہدری نثار علی کو مشتر کہ اجلاس کے متعلق نکتۂ اعتراض نہ اُٹھانے کے لیے کہا تو انہوں نے کہا کہ ایک دِن کے لیے اجلاس ملتوی کر دیا جائے جسے میں نے مان لیا۔

میں 4 رنومبر 1996ء کو حسبِ معمول رات بارہ بجے کے قریب سو گیا کہ فون اٹینڈنٹ نے دروازہ کھٹکھٹایا اور مجھے فون دیا کہ وزیرِ اعظم آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔میرے ہیلو کہنے تک فون بند ہو چکا تھا۔میں نے گرین لائن کے ذریعے وزیرِ اعظم سے بات کرنا چاہی تو وہ لائن بھی کٹ چکی تھی۔کچھ دیر بعد میرا اسٹاف افسر طارق خان میرے کمرے میں آیا اور کہنے لگا کہ حکومت برطرف کر کے وزیرِ اعظم کو حراست میں لے لیا گیا ہے۔اس طرح ممتاز میمن کی 4 رنومبر سے متعلق پیشین گوئی بھی درست ثابت ہوگئی۔میں نے اسے پیغام دے کر محترمہ سے ملاقات کے لیے روانہ کیا مگر اسے ملاقات کی اجازت نہ دی گئی۔صبح آٹھ بجے ڈپٹی کمشنر اور سپر نٹنڈنٹ پولیس اسلام آباد نے مجھ سے ملاقات کی اور مجھے حالات کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی نقل و حرکت پر کوئی پابندی نہیں ہے، آپ قومی اسمبلی جا سکتے ہیں مگر اراکینِ پارلیمنٹ سے ملاقات نہیں کر سکتے۔میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی ہے اور باقی کیا کرنا ہے۔اس کے بارے میں آپ مجھ پر دباؤ نہیں ڈال سکتے۔

میں صبح دس بجے کے قریب 'پارلیمنٹ ہاؤس' پہنچا تو گیٹ پر صحافیوں کا ہجوم پہلے ہی سے میرا منتظر تھا۔انہوں نے مجھے گھیرے میں لے لیا اور اسمبلی کی برطرفی پر میری رائے طلب کی۔ میں نے کہا کہ میں اس فیصلے کو تسلیم نہیں کرتا اور اسے سابق سپیکر مولوی تمیز الدین کی طرح اعلیٰ عدالتوں میں چیلنج کروں گا۔اس کے بعد میں اپنے چیمبر میں چلا گیا اور سارا دن سابق وزراء و اراکینِ پارلیمنٹ سے ملاقاتیں کرتا رہا۔وزراء کے دفاتر سیل کر دیے گئے تھے اور انہیں اجازت نہیں تھی کہ وہ وہاں سے کسی قسم کی فائل یا دستاویزات اٹھا سکیں۔

حکومت برطرف کرنے کے بعد وزیرِ اعظم کو چند گھنٹے نظر بند کیا گیا۔ میں نے آفتاب شیر پاؤ سے ملاقات کی اور بے نظیر بھٹو سے ملنے کے لیے حکومت کے ساتھ رابطہ کرنے کے لیے کہا۔ انہوں نے ہمیں محترمہ سے ملاقات کی اجازت دِلوادی۔ میں پارٹی کے چند سرکردہ رہنماؤں کے ساتھ 'وزیرِ اعظم ہاؤس' پہنچا تو مین گیٹ پر ہماری گاڑی کی تلاشی لی گئی۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو پورچ تک ہُو کا عالم تھا اور جگہ جگہ لوہے کی باڑ لگائی گئی تھی۔ یہ احساس بھی نہیں ہو رہا تھا کہ یہاں وزیرِ اعظم رہائش پذیر ہیں۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو ہر طرف خاموشی تھی۔ ہمیں محترمہ کے کمرے کی طرف لے جایا گیا تو ہمیں دیکھتے ہی وہ بولیں کہ آپ پہلے لوگ ہیں جن سے میں ملاقات کر رہی ہوں ورنہ ظالم لغاری نے مجھے یہاں اکیلا بند کیا ہوا ہے اور آصف زرداری پہلے ہی 'گورنر ہاؤس' لاہور سے گرفتار ہو چکے ہیں۔ ہمیں دیکھ کر ان کے چہرے پر رونق آ گئی اور انہوں نے حکومت کی برطرفی پر تفصیلی گفتگو کی۔ میں نے انہیں اس فیصلے کو چیلنج کرنے کے لیے عدالت جانے کے متعلق آگاہ کیا۔

بے نظیر بھٹو نے اپنے والد کی طرح ہمیشہ اپنی سیاست کو عوامی رکھا اور اسی طاقت کے بل بوتے پر دو مرتبہ انتخاب جیت کر وزارتِ عظمیٰ پر فائز ہوئیں۔ انہیں پہلی مسلمان خاتون وزیرِ اعظم بننے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ بے نظیر بھٹو نے اپنے دورِ اقتدار میں سیاست کو نیا رُخ دیا۔ پرائیویٹائزیشن (نجکاری) اور ڈی ریگولیشن جیسی پالیسیاں اپنا کر معاشی اصلاحات کی گئیں جس سے ملک میں معاشی استحکام پیدا ہوا اور توانائی کے شعبے کے ساتھ ساتھ دیگر شعبوں میں بھی قابلِ ذکر سرمایہ کاری ہوئی۔ اڑتالیس ہزار نئے پرائمری و مڈل سکول تعمیر کیے گئے اور شرح خواندگی کو بڑھایا گیا۔ خاص طور پر خواتین کی تعلیم و تربیت پر توجہ دی گئی۔ انہوں نے خواتین ججوں کا تقرر کرنے کے علاوہ خواتین کے لیے الگ پولیس سٹیشن اور مخصوص بینک قائم کیے۔ خواتین کی کھیلوں میں شرکت پر پابندی ہٹا کر انہیں ملکی اور غیر ملکی سطح پر کھیلوں میں شرکت کے مواقع فراہم کیے۔ مزدور و طلبہ یونین بحال کیں۔ سزائے موت کے تمام قیدیوں کی سزا عمر قید میں تبدیل کر کے کئی خاندانوں کی زندگیوں کو تحفظ فراہم کیا۔ اُن کے دور کا بہترین کارنامہ کراچی میں امن و امان کا قیام ہے۔ ملک کو میزائل ٹیکنالوجی کی فراہمی اور ہمسایہ ممالک سے تعلقات کی فضاء کو سازگار بنانے میں اُن کی کوششیں قابلِ تحسین ہیں۔ اُن کے دورِ حکومت میں ہندوستان کے ساتھ دہشت گردی کے

خلاف اور ایک دوسرے کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ نہ کرنے کے متعلق مذاکرات میں خاطر خواہ پیش رفت ہوئی۔ ہندوستان کے علاوہ دیگر ہمسایہ ممالک کے ساتھ آزادانہ تجارت کو فروغ دینے کے لیے South Asian Preferential Tariff Agreement کیا گیا۔ انہوں نے مسئلہ کشمیر کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر زندہ رکھا اور اُس کے حل کے لیے کوششیں کیں۔ انہی کے دور میں پاکستان کو دولتِ مشترکہ کا دوبارہ رکن بنایا گیا جو ایک اہم فیصلہ تھا۔ انہوں نے اپنے والد کی جمہوری اَقدار کو فروغ دینے اور آمر کے سامنے ڈٹ جانے کی روایات کو زندہ رکھا۔ جیلیں کاٹیں، صعوبتیں برداشت کیں۔ اُن کے شوہر آصف علی زرداری کو آٹھ سال تک قید رکھا گیا مگر انہوں نے آمر کے سامنے گھٹنے ٹیکنے سے انکار کر دیا۔ آج بھی وہ پاکستان کی سیاست میں خاص مقام رکھتی ہیں۔

میں نے قومی اسمبلی تحلیل ہونے کے بعد سابق اراکینِ قومی اسمبلی کے اعزاز میں پارلیمنٹ بلڈنگ میں عشائیہ دیا جس میں پیپلز پارٹی اور دیگر جماعتوں کے تقریباً ایک سو اکیس سابق اراکین نے شرکت کی۔ اُن میں بے نظیر بھٹو، مولانا فضل الرحمٰن، محمود خان اَچکزئی، افتخار حسین گیلانی اور جنوبی پنجاب سے تعلق رکھنے والے صدر لغاری کے اپنے ضلع ڈیرہ غازی خان سے بھی تمام اراکین شامل تھے۔ محترمہ بہت خوش ہوئیں کہ اسمبلی تحلیل ہونے کے باوجود تمام جماعتوں سے اتنی بڑی تعداد میں سابق اراکین نے شرکت کی ہے۔

❀ ❀ ❀

باب ہشتم

میاں محمد نواز شریف کا دوسرا دورِ حکومت (1997ء۔1999ء)

میں نے بے نظیر حکومت کی برطرفی اور اسمبلی تحلیل ہونے کے بعد ملتان سے اسلام آباد میں موجود اپنے چچا حامد رضا سے فون پر بات کی۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں آپ سے بہت ضروری ملنا چاہتا ہوں، لہٰذا آپ وقت مقرر کریں۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ ایجنڈا کیا ہو گا؟ میں نے اُن سے کہا کہ آئندہ انتخاب کے حوالے سے بات کرنی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ فون پر کرنے کی بات نہیں، آپ کل اسلام آباد میرے فلیٹ پر آ جائیں، ہم دوپہر کا کھانا اکٹھے کھائیں گے۔ میں حسبِ پروگرام ملتان سے اسلام آباد پہنچ گیا۔ جب اُن کے فلیٹ پر پہنچا تو وہاں سیّد تنویر الحسن موجود تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ چچا، صدر لغاری سے ملاقات کے لیے ایوانِ صدر گئے ہیں۔ کچھ دیر بعد چچا واپس پہنچ گئے۔ ہم نے مل کر کھانا کھایا۔ اس دوران دنیا بھر کے موضوعات پر گفتگو ہوئی سوائے اُس موضوع کے جس کے لیے میں خاص طور پر اُن کے پاس آیا تھا۔ میں نے اَز خود اُس موضوع پر گفتگو شروع کی اور چچا کو مطلع کیا کہ میں نے صدر لغاری کے حکومت کی برطرفی اور اسمبلی تحلیل کرنے کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں رِٹ دائر کر دی ہے۔ میں نے اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مجھے لگتا ہے کہ اوّل تو حکومت مجھے انتخاب میں حصہ نہیں لینے دے گی اور اگر اجازت دی بھی تو جیتنے نہیں دے گی، لہٰذا میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ اس حلقے سے انتخاب میں حصہ لیں جہاں سے میں تین مرتبہ انتخاب جیت چکا ہوں۔ میرے اور چچا کے درمیان اسی حلقۂ انتخاب کی وجہ سے غلط فہمی پیدا ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ بے شک آپ اس حلقے

میں نہ آئیں، انتخاب کے تمام اخراجات میرے ذمے ہوں گے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ میں ابھی صدر لغاری سے ملاقات کر کے آ رہا ہوں، میں نے اس سلسلے میں اُن سے بھی مشورہ کیا ہے، صدر لغاری نے مجھے کہا کہ آپ پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب نہ لڑیں۔ جس پر میں نے جواب دیا کہ میں نواز شریف کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ صدر نے اس کا حل یہ تجویز کیا کہ میں آزاد حیثیت سے انتخاب میں حصہ لوں اور اپنا انتخابی نشان 'تانگہ' رکھوں کیونکہ یہ انتخابی نشان اُن کا ہے، اس لیے انتظامیہ میری مکمل مدد کرے گی۔ چچا نے کہا کہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں انتخاب میں حصہ نہیں لوں گا۔ جب انتخابات شروع ہوئے تو واقعی انہوں نے نہ کسی جماعت کی حمایت کی اور نہ انتخابات میں حصہ لیا۔ پیپلز پارٹی پنجاب بھر سے قومی اسمبلی کی ایک بھی نشست حاصل نہ کر سکی اور میں بھی اپنے سیاسی کیریئر میں پہلی مرتبہ انتخاب ہار گیا۔

1997ء میں عام انتخابات کے موقعہ پر محترمہ نے مجھے ملتان میں فون پر رابطہ کر کے کہا کہ آپ سے ملنے کے لیے سابق وزیرِ مملکت برائے قانون و انصاف میاں رضا ربانی کراچی سے آ رہے ہیں، وہ جہاز کی سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے آپ سے چند دستاویزات پر دستخط کروائیں گے۔ اُس دن میرے والد کی برسی تھی۔ میں وہاں سے نکل کر ملتان ائرپورٹ پر گیا اور جہاز تک اپنی کار لے گیا۔ جب میری ملاقات میاں رضا ربانی سے ہوئی تو انہوں نے مجھے چند دستاویزات دیں اور کہا کہ محترمہ چاہتی ہیں کہ آپ ان پر دستخط کر دیں۔ جب میں نے دستاویزات پڑھیں تو معلوم ہوا کہ میں نے اسمبلی تحلیل ہونے پر صدر لغاری کے خلاف سپریم کورٹ میں جو رِٹ دائر کی تھی، وہ اُس رِٹ کو واپس لینے کے لیے درخواست تھی۔ میں بہت حیران ہوا۔ انہوں نے مجھے یہ بھی کہا کہ محترمہ بھی اپنی رٹ واپس لے رہی ہیں۔ میں نے دستخط کر دیئے مگر محترمہ نے رِٹ واپس لینے کی درخواستیں سپریم کورٹ میں پیش نہ کیں۔ چند دِن بعد ہمارے خلاف فیصلہ ہو گیا۔ افواہ یہ تھی کہ اسمبلیاں بحال ہو رہی ہیں۔ اگر طے شدہ پروگرام کے مطابق وزیرِ اعظم اور سپیکر قومی اسمبلی اپنی دائر شدہ رِٹ واپس لے لیتے تو عدلیہ کے فیصلہ کی ساکھ متاثر ہوتی۔ میں نے محترمہ سے کچھ عرصے بعد دریافت کیا کہ انہوں نے مجھ سے دستخط لینے کے باوجود رِٹ واپس کیوں نہیں لی؟ انہوں نے کہا کہ مجھے خبر دی گئی تھی کہ فیصلہ ہمارے حق میں آ رہا ہے، لہٰذا میں مطمئن تھی کہ اسمبلیاں بحال ہو جائیں گی۔

پارلیمانی روایات کے مطابق سپیکر نئے سپیکر کے انتخاب تک اپنے فرائض ادا کرتا رہتا ہے۔ میں نے بھی انہی روایات کے مطابق اپنے فرائض ادا کیے۔ اُن دنوں چین کے صدر Jiang Zemin پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے تھے۔ اُنہیں چیئرمین سینٹ وسیم سجاد نے سینٹ سے خطاب کی دعوت دی۔ مجھ سے وسیم سجاد نے اس تقریب کے لیے قومی اسمبلی کے ہال کی اجازت مانگی جو میں نے بخوشی دے دی۔ مجھے بھی اس اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ میں نے محترمہ سے اجازت چاہی تو انہوں نے نہ صرف شرکت کی اجازت دی بلکہ یہ بھی کہا کہ چین کے ساتھ ہمارے مثالی تعلقات ہیں اور وہ پاکستان کا قابلِ اعتماد دوست ہے، اس لیے آپ کو ضرور شریک ہونا چاہیے۔ میں اس تقریب میں شریک ہوا۔ صدر لغاری نے قومی اسمبلی کی نئی چھت کی بہت تعریف کی۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔

میں نے نومنتخب اراکینِ قومی اسمبلی سے حلف لیا۔ الٰہی بخش سومرو قومی اسمبلی کے سپیکر منتخب ہو گئے۔ میں نے انہیں اپنی تقریر میں مبارکباد دیتے ہوئے، اُن کے تجربہ کار سیاستدان ہونے کی تعریف کی۔ میں نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ خواہ آج میں اس ایوان کا رکن نہیں ہوں، اس کے باوجود میں دعا گو ہوں کہ یہ اسمبلی اپنی پانچ سالہ مدت پوری کرے۔ میں نے قائدِ ایوان اور قائدِ حزبِ اختلاف سے بھی درخواست کی کہ وہ اپنے اندر ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کریں۔ میں نے خوشگوار موڈ میں سپیکر سومرو کے بارے میں کہا کہ 1985ء میں جب میں ایم این اے منتخب ہوا تو اس وقت الٰہی بخش سومرو وفاقی وزیر ہاؤسنگ وتعمیرات تھے اور میں نے کابینہ میں شامل ہونے کے بعد ان سے اس وزارت کا قلمدان لیا تھا، آج اُسے with all back benefits (سود سمیت) لوٹا رہا ہوں۔ میں نے انہیں سپیکر کی کرسی پر بٹھایا اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔

1997ء کے عام انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی کی ناکامی کے کئی اسباب تھے جن کے تجزیے کے لیے بے نظیر بھٹو نے پنجاب کے تمام ٹکٹ ہولڈرز کو سابق سینیٹر گلزار احمد خان کی رہائش گاہ گلبرگ، لاہور پر مدعو کیا۔ محترمہ نے سٹیج پر بیٹھی امریکی خاتون مس گیلیئن فلائیس (Gillian Flyce) سے میرا تعارف کروایا۔ وہ این ڈی آئی* کی طرف سے پاکستان میں کنٹری مینیجر تعینات تھیں اور عام انتخابات کا جائزہ لینے کے بعد اپنی رپورٹ مرتب کر رہی تھیں۔ اُن سے

میری اتفاقیہ ملاقات انتخابات کے موقعہ پر میرے حلقۂ انتخاب شیر شاہ، ملتان کے پولنگ سٹیشن پر بھی ہو چکی تھی جہاں وہ انتخابات کا جائزہ لینے کے لیے بطورِ مبصر موجود تھیں۔ میں نے اجلاس میں پیپلز پارٹی کی شکست کا موجب بننے والے چند اسباب پیش کیے جو حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ پیپلز پارٹی کے اپنے ہی صدر کے ہاتھوں حکومت کی برطرفی پر عوام میں یہ تاثر عام تھا کہ اب پیپلز پارٹی دوبارہ اقتدار میں نہیں آئے گی۔

۲۔ پیپلز پارٹی کی مخالف لابی کو نگران حکومت میں لایا گیا۔

۳۔ عدلیہ کے تاخیری فیصلے کی وجہ سے پیپلز پارٹی کو انتخابی مہم چلانے میں دشواری پیش آئی۔

۴۔ میر مرتضیٰ بھٹو کے قتل میں آصف زرداری کی ذات کو ملوث کرنے سے پیپلز پارٹی کو نقصان پہنچا۔

۵۔ میر مرتضیٰ بھٹو کے قتل سے پیپلز پارٹی سے سندھ کارڈ چھن چکا تھا۔

۶۔ پیپلز پارٹی کی حکومت اس وقت ختم کی گئی جب پارٹی کا گراف بہت گر چکا تھا۔

۷۔ پیپلز پارٹی کے خلاف الیکٹرانک میڈیا اور سرکاری وسائل کا بے دریغ استعمال کیا گیا۔

۸۔ انتخابات سے قبل نیشنل سیکورٹی کونسل کے قیام کا اعلان پیپلز پارٹی کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا۔

مس گیلیئن نے بھی میرے دلائل غور سے سنے اور مجھ سے اتفاق کیا۔

بے نظیر حکومت کے خاتمے کے بعد مجھے این ڈی آئی* کی طرف سے جنوبی افریقہ کے دورے کی دعوت دی گئی۔ اس وفد میں پیپلز پارٹی کی طرف سے میں اور نوید قمر، مسلم لیگ کی طرف سے چوہدری انور بھنڈر، ایم کیو ایم کی طرف سے سینیٹر نسرین جلیل اور عوامی نیشنل پارٹی کی طرف سے صوبہ سرحد سے ایک ایم پی اے شامل تھے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ این ڈی آئی کی طرف سے اس وفد کی تشکیل مس گیلیئن نے کی تھی۔ وہ خود بھی اس وفد میں شامل تھیں۔ جب اُن کا نام پکارنے میں ہمیں دقت پیش آتی تو وہ کہتیں کہ گیلانی کے نام سے آخری حرف آئی ہٹا دیں تو گیلیئن بن جائے گا۔ ہمیں جنوبی افریقہ کے احتساب کے نظام کا مطالعہ کرنے کے لیے لے جایا گیا، اس لیے

* National Democratic Institute for International Affairs (NDI)

وزارتِ داخلہ، وزارتِ قانون، احتساب سے متعلقہ پارلیمانی کمیٹی کے اراکین، چیف جسٹس، محتسب اعلیٰ اور پبلک پراسیکیوٹر سے ہماری ملاقاتیں کروائی گئیں۔ ہمیں وہاں کی پارلیمنٹ میں بھی لے جایا گیا۔ جنوبی افریقہ ایسا ملک ہے جہاں نسلی امتیاز کے خلاف طویل جدوجہد کی گئی۔ اس دوران کئی سیاسی رہنماؤں کو سزائیں دی گئیں، نیلسن منڈیلا کو طویل عرصے تک جیل کی سلاخوں کے پیچھے رکھا گیا۔ طویل جدوجہد کے بعد وہاں نسلی امتیاز کی جڑیں کمزور ہوئیں۔ جدوجہد کرنے والے عظیم رہنما نیلسن منڈیلا آج ساری دنیا کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

ہمیں 'سچائی اور ہم آہنگی کمیشن*' کا بھی مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا جس میں کھلے دل کے ساتھ اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا گیا۔ یہ روایت ہمیں بھی اپنانی چاہیے کیونکہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ انتقامی کارروائی تو کرتے ہیں مگر اپنی غلطی ماننے سے انکار کردیتے ہیں۔

ہمیں دورۂ جنوبی افریقہ کے دوران کیپ ٹاؤن، پریٹوریا، جوہینس برگ کے علاوہ دیگر کئی علاقوں کا دورہ بھی کروایا گیا۔ وہاں ابھی تک امنِ عامہ کی حالت تسلی بخش نہیں ہے۔ سیاحوں کو رات دیر گئے تک ہوٹل سے باہر رہنے سے روکا جاتا تھا۔ ایک قابلِ ذکر واقعہ اس وقت پیش آیا جب ہمارے وفد کی ملاقات وہاں کے چیف جسٹس سے کروائی گئی جو مسلمان تھے۔ وہاں سینیٹر نسرین جلیل نے گفتگو کے دوران کہا کہ پاکستان میں مہاجروں کے ساتھ امتیازی سلوک برتا جارہا ہے حالانکہ ہم حکومت کے ساتھ ہیں، اس کے باوجود ہمیں جیلوں میں رکھا جاتا ہے۔ اُن دنوں نواز شریف کی حکومت تھی۔ وفد کے کسی رکن نے کہا کہ اگر ایم کیو ایم کے ساتھ اتنا امتیازی سلوک برتا جارہا ہے تو وہ اپنی حمایت حکومت سے واپس کیوں نہیں لے لیتے؟ جس پر سینیٹر صاحبہ بولیں کہ ابھی ہم اُن کے ساتھ ہیں تو ہمارے ساتھ یہ سلوک ہورہا ہے، اگر ہم ان کے مخالف ہوتے تو معلوم نہیں ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا، اب بھی میں جیل سے پیرول (عارضی رہائی) پر یہاں آئی ہوں۔ اس پر چیف جسٹس نے سینیٹر نسرین جلیل پر تنقید کرنے والے رکن سے کہا کہ میں آپ سے اتفاق نہیں کرتا، پاکستان کو بنے پچاس سال سے زائد ہوچکے ہیں مگر ابھی تک عوام نے اپنے آپ کو لوکل اور مہاجر میں تقسیم کر رکھا ہے جبکہ ہمارا ملک ابھی آزاد ہوا ہے اس کے باوجود ہم فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم ساؤتھ افریقن ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کے نظام میں کہیں نہ کہیں نقص ضرور ہے۔ چیف جسٹس کی یہ بات ہمارے دلوں کو گھائل کر گئی اور

---

* Truth and Reconciliation Committee

ع پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات

والا معاملہ تھا۔کاش ہم نے اپنے رویّوں کا جائزہ لیا ہوتا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ پاکستان بننے کے نصف صدی بعد بھی پیدا ہونے والا ہر بچہ اپنے آپ کو لوکل مہاجر کی تقسیم میں پاتا ہے:

؎ دوریاں دِلوں کی کچھ کم نہ تھیں ادا

کیا ڈھونڈنے گئے تھے مسافر خلاؤں میں

1997ء میں ایک دلچسپ واقعہ اس وقت پیش آیا جب میں ملتان کی ایک بستی گرا میں ایک استقبالیے میں شریک تھا۔ میں نے وہاں ریڈیو پر نئی کابینہ کے محکموں کا اعلان سنا۔میرے کزن سیّد احمد محمود کو نواز شریف نے وزیرِ مملکت برائے خوراک وزراعت بنانے کا وعدہ کیا ہوا تھا۔ جب اعلان ہوا تو اس کے برعکس وہ بلدیات ودیہی ترقی کے وزیرِ مملکت بنادیئے گئے۔ میں نے انہیں فون کر کے مبارکباد دی۔اس وقت تک انہیں اپنے محکمے کا علم نہیں تھا۔ میں نے اَز راہ مذاق کہا کہ میں آپ کو وزارتِ خوراک وزراعت کی بجائے بلدیات ودیہی ترقی کی وزارت دے رہا ہوں۔انہوں نے مجھے کچھ دیر بعد لاہور سے فون کر کے کہا کہ آپ سچ سچ بتائیں کہ مجھے یہ وزارت مل گئی ہے۔میرے ہاں کہنے پر انہوں نے کہا کہ یوسف بھائی! میں نے اپنے دوستوں سے بھی مشورہ کرلیا ہے، یہ بہت اچھی وزارت ہے،اب آپ نے اسے تبدیل نہیں کرنا۔ میں نے کہا کہ میں آپ کو وزارتِ ماحولیات کا اضافی چارج بھی دے رہا ہوں۔انہوں نے دریافت کیا کہ ماحولیات وہی وزارت ہے جو آصف زرداری کے پاس تھی؟ میں نے کہا کہ ہاں! وہی محکمہ ہے اوراس کا دفتر دیکھنے کے لائق ہے، وہاں سے خوبصورت قدرتی مناظر بھی نظر آتے ہیں۔ انہوں نے دریافت نہ کیا کہ میں پیپلز پارٹی میں ہوں اورحکومت مسلم لیگ کی بن رہی ہے مگر وہ مجھے کہتے جارہے تھے کہ اب یہ وزارتیں تبدیل نہیں کرنی۔ میں وزارتوں کی مکمل تفصیل سن چکا تھا میں نے کہا کہ آپ انچارج وزیر ہوں گے اور میں کسی کو ان محکموں کا وفاقی وزیر نہیں بناؤں گا۔وہ بہت خوش ہوئے غالباً وہ سمجھتے تھے کہ میری دوستی چوہدری نثار علی کے ساتھ ہے اوراسی لیے انہوں نے مجھ سے ایک آدھ مرتبہ سرسری ساذکر بھی کیا کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ میں نے بھی کہہ دیا کہ آپ تو ہمارے تعلقات جانتے ہیں۔وہ ان محکموں کی خوشی میں اتنے محو ہو چکے تھے کہ انہوں نے مزید سوالات سے گریز کیا۔ میں بعدُ میں کئی مرتبہ انہیں ملنے ان کے دفتر ماحولیات گیا تو وہ

بہت خوش تھے۔ وہ عام زندگی میں کئی چیزوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں مگر سنجیدہ معاملات کے بارے میں ان کا مؤقف سخت ہوتا ہے۔ انہیں اپنی عزت نفس کا بہت خیال رہتا ہے۔ وہ قسمت کے دھنی شخص ہیں۔ احمد محمود نے سیاسی طور پر اپنے آپ کو خاصا مضبوط کر لیا ہے۔ انہوں نے اپنے حلقۂ انتخاب سے ہمایوں اختر خان، جہانگیر خان ترین کو ایم این اے اور چوہدری پرویز الٰہی کو ایم پی اے منتخب کروایا ہے۔ یہ اُن کی مقبولیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

بے نظیر بھٹو نے کراچی میں پیپلز پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے اہم اجلاس کی صدارت کی۔ اجلاس کے بعد وہ مجھے، چوہدری احمد مختار، شاہ محمود اور مس ناہید خان کو لے کر سٹاک ایکسچینج بلڈنگ گئیں۔ انہوں نے وہاں ایک کارکن کی تعزیت کی جو اُنہی دنوں قتل ہوا تھا۔ تعزیت کے بعد وہ ہمیں دربار حضرت سیّد محمد شاہ دولہا سبزواریؒ پر لے گئیں اور کہا کہ انہیں اس دربار سے بے حد عقیدت ہے، انہیں کوئی مسئلہ پیش آئے تو وہ دعا کے لیے اس دربار پر حاضری دیتی ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ جب وہ وزیرِ اعظم بنیں تو انہوں نے اس مزار پر مقبرہ بنوایا تھا۔ ہمارے دربار پہنچنے پر کسی عقیدت مند نے انہیں دھاگے پیش کیے تاکہ وہ مَنت کے طور پر مزار پر باندھ سکیں۔ انہوں نے دھاگے کھولنے شروع کر دیے اور اپنی گفتگو جاری رکھی اور کہا کہ میں فاروق لغاری کو صدر بنانے سے قبل اس مزار پر لائی تھی۔ انہوں نے مزید کہا کہ انہوں نے جو میرے ساتھ کیا وہ سب کے سامنے ہے۔ اس دوران دھاگے کھل گئے اور انہوں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر چند دھاگے میرے ہاتھ میں تھما دیے اور کہا کہ اَب آپ بھی مَنت کے طور پر مزار پر باندھیں۔ جب میں نے ان کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ میں نے بے اختیار سوچا کہ محترمہ نے کتنے خلوص کے ساتھ فاروق لغاری کو صدر بنایا ہوگا، اُن کی کامیابی پر کتنی خوش ہوئی ہوں گی، سوچتی ہوں گی کہ اپنی ہی پارٹی کا صدر، سپیکر اور خود وزیرِ اعظم مگر ان کا دل کتنا رویا ہوگا جب اپنے ہی بنائے ہوئے صدر نے خواہ کسی بھی وجہ سے ان کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا۔ مگر مجھے پورا یقین ہے کہ جو غم محترمہ کو ہوا ہوگا سو ہوا ہوگا مگر یہ بھی ضرور ہے کہ سردار صاحب نے بھی کئی راتیں جاگ کر کاٹی ہوں گی۔

سابق صدر فاروق لغاری نے جب ملّت پارٹی کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت کے قیام کا اعلان کیا تو میں نے محترمہ کو مشورہ دیا کہ آپ ملّت پارٹی کے اعلان کے دو دِن بعد

16/اگست کو مظفر گڑھ میں جلسۂ عام سے خطاب کریں۔ جلسۂ عام سے قبل غلام مصطفیٰ کھر ملتان میرے گھر آئے۔ اُن کے ہمراہ الطاف کھر بھی تھے۔ میں نے کھر صاحب سے کہا کہ محترمہ مظفر گڑھ میں جلسہ عام سے خطاب کرنا چاہتی ہیں، میری خواہش ہے کہ یہ جلسۂ عام آپ منعقد کروائیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے آپ سے علیحدگی میں بات کرنی ہے۔ ہم نے علیحدگی میں بات کی اور طے ہوا کہ اُن کی محترمہ سے ملاقات کروائی جائے۔

دوسرے روز اسلام آباد میں پیپلز پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کی میٹنگ تھی۔ میں نے اس سلسلے میں مخدوم امین فہیم کو اعتماد میں لیا اور ہم دونوں نے محترمہ کو کھر صاحب سے ملاقات کرنے کے لیے قائل کیا۔ انہوں نے 'گلزار ہاؤس' لاہور میں ملاقات کا وقت مقرر کر دیا۔ دوسرے روز اخبار میں کھر صاحب سے منسوب ایک خبر چھپی کہ آصف زرداری نے انڈیپنڈنٹ پاور پلانٹ (آئی پی پی) کے معاملے میں بے جا مداخلت کی اور مجھے اعتماد میں لیے بغیر میری وزارت پانی و بجلی میں چیئرمین واپڈا کا تبادلہ کروایا۔ اس خبر پر محترمہ نے بہت ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور کہا کہ گیلانی صاحب! آپ کھر صاحب کی اور سفارش کریں۔ اس بیان کے بعد محترمہ نے مجھے مظفر گڑھ میں اپنے طور پر جلسۂ عام کا اہتمام کرنے کے لیے کہا۔ انتظامیہ نے جلسۂ عام سے قبل مظفر گڑھ سٹیڈیم میں پانی چھوڑ دیا مگر اس کے باوجود ہم نے اُسی سٹیڈیم میں جلسۂ عام کیا۔ مظفر گڑھ کی تاریخ کا یہ سب سے بڑا جلسہ تھا۔ جنوبی پنجاب ملّت پارٹی کا گڑھ بن سکتا تھا مگر ہمارے کامیاب جلسے کی وجہ سے وہ اُبھر نہ سکی اور پیپلز پارٹی پہلے سے زیادہ مضبوط اور موثر ہو گئی۔

اس جلسے سے قبل سردار عبدالقیوم خان جتوئی (جو حال ہی میں ایم این اے کی نشست سے مستعفی ہو کر ناظمِ اعلیٰ مظفر گڑھ منتخب ہوئے ہیں)، پیر محسن قریشی (جن کی اہلیہ عام نشست سے ایم این اے منتخب ہوئی ہیں)، مخدوم ارشاد، ایم پی اے چوہدری احسان الحق نولاٹیہ، یونین ناظم ملک احد سنانواں، یونین ناظم مہر ارشاد احمد سیال اور اللہ نواز خان کے علاوہ کئی اہم شخصیات نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔

1997ء کے عام انتخابات میں عمران خان، نواز شریف کے بھاری مینڈیٹ کا فائدہ اٹھا سکتے تھے کیونکہ انتخابات سے قبل میاں صاحب نے انہیں قومی و صوبائی اسمبلی کی کچھ نشستیں دینے کے لیے رضامندی ظاہر کی تھی مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ اگر وہ یہ پیشکش مان لیتے تو جب میاں

صاحب کی حکومت کو برطرف کیا گیا اور بے نظیر بھٹو بھی ملک سے باہر تھیں تو وہ ملک میں متبادل قیادت کے طور پر اُبھر سکتے تھے اور پاکستان کی سیاست میں اہم کردار ادا کر سکتے تھے مگر وہ اس کا فائدہ نہ اٹھا سکے۔

میرے سسر پیر اسرار حسین کو جن دنوں دل کی تکلیف تھی میں اتفاق سے اُن دنوں لاہور میں تھا۔ میں نے انہیں فوری طور پر ڈاکٹر جاوید اکرم کے نجی ہسپتال اکرم کمپلیکس میں داخل کروا دیا۔ محترمہ کی طرف سے پیپلز پارٹی پنجاب کے سابق صدر راؤ سکندر اقبال (موجودہ وفاقی وزیر دفاع) اور سیکرٹری پیپلز پارٹی پنجاب (صوبائی اسمبلی پنجاب کے موجودہ قائدِ حزبِ اختلاف) قاسم ضیاء اُن کی تیمارداری کے لیے آئے۔ کچھ دنوں بعد اُنہیں مصنوعی سانس کی ضرورت پڑ گئی، جس کے لیے انہیں وینٹی لیٹر (ventilator) پر منتقل کر دیا گیا۔ اُن کی فیملی نے اُن سے شکوہ کیا کہ آپ کو نواز شریف کی طرف سے ملنے کوئی نہیں آیا؟ اس پر انہوں نے پنجابی کا یہ شعر پڑھا:

ے جے توں میرے جنازے تے نہیں آیا
راہ تکدا اے تیری مزار آجا

پیر اسرار حسین 18 / جون 1998ء کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اُن کی وفات سے بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا۔ پیر صاحب بھی میرے نانا کی طرح لجپال تھے۔ اُن کی امداد سے کئی غریبوں کے گھر آباد تھے۔ سیاسی اثر و رسوخ کے لحاظ سے اُن کا کئی قومی اور صوبائی اسمبلی کے حلقوں میں عمل دخل تھا۔ اُن کے قریبی دوستوں میں چوہدری فضل الٰہی، مصطفیٰ کھر، غلام حیدر وائیں، چچا حامد رضا، رائے احمد نواز، چوہدری اشفاق، ریاض فتیانہ، خالد احمد کھرل اور سید علی رضا شاہ شامل تھے۔ ہم دونوں مختلف جماعتوں میں رہتے ہوئے بھی ذہنی ہم آہنگی رکھتے تھے۔ اُن کی وفات کے بعد اُن کے بیٹے میرے بہنوئی ابرار حسین گدی نشیں ہوئے۔ سیّد ابرار حسین زبردست نیزہ باز رہے ہیں۔ وہ ایم پی اے بھی رہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ انہوں نے خرابی صحت کے باوجود مختصر عرصے میں اپنے بزرگوں کی درگاہ پیر قطبیہ و مسجد سندیلیانوالی، ٹوبہ ٹیک سنگھ کو جدید طرز پر تعمیر کروایا جو اُن کے والد کی دیرینہ خواہش تھی۔

1998ء کے بلدیاتی انتخابات کے موقعہ پر میں اور میرے دوست نعیم خان سمیجہ آباد، ملتان کے جلسے میں پہنچے جہاں میرا شاندار استقبال کیا گیا۔ یہ انتخابات کے لیے جلسوں وغیرہ کے

انعقاد کی آخری رات تھی اور مجھے اپنے کزن سیّد تنویر الحسن کے جلسوں سے بھی خطاب کرنا تھا، لہٰذا میں اس جلسے میں اپنی تقریر مختصر کر کے شہر کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستے میں کار کے عقبی شیشے میں دیکھا کہ بغیر لائٹوں کے ایک موٹر سائیکل سوار گاڑی کا پیچھا کر رہا ہے۔ میں نے ایک سپیڈ بریکر پر گاڑی آہستہ کی تو وہی موٹر سائیکل سوار میری کار کی بائیں طرف سے آگے آ کر رُکا۔ اس کے پیچھے ایک اور سوار بھی تھا، وہ تیزی سے اُتر اہی تھا کہ میں نے کار چلا دی۔ میں نے کار خاصی تیز رفتاری سے چلائی کہ موٹر سائیکل سوار پیچھے رہ گیا۔ غالباً انہی کے گروہ میں سے آگے موجود ایک رکشہ ڈرائیور نے سڑک کے عین درمیان میں رکشہ کو موڑنا شروع کر دیا اور راستہ تقریباً بند کر دیا جس کی وجہ سے مجھے کار روکنا پڑ گئی۔ اس دوران تیزی سے میری بائیں طرف سے موٹر سائیکل سوار دوبارہ میرے سامنے آ نکلا۔ جیسے ہی وہ موٹر سائیکل میری کار کے آگے رُکا تو پیچھے بیٹھے شخص نے اپنی چادر اُتاری اور کلاشنکوف سے فائرنگ شروع کر دی۔ میں پہلے ہی محتاط بیٹھا تھا۔ نعیم خان نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو وہ نیچے ہو گیا۔ میں نے پوری سپیڈ میں گاڑی ریورس کرنا شروع کر دی۔ فل لائٹ اور رینج سے دور نکلنے کے باعث ہم بال بال بچ گئے۔ ہم دوبارہ جلسہ گاہ پہنچ گئے۔ عوام مجھے دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ میں نے مائیک پر اس حملے کی تفصیل سنائی جس پر عوام سیخ پا ہو گئے۔ میری سیاسی مخالفت کے سبب چند لوگوں نے اسی حلقے سے ضلع کونسل کے رکن ملک عاشق علی شجرا پر شک کا اظہار کیا۔ میں نے لوگوں کو صبر کی تلقین کی اور انہیں یقین دلایا کہ ملک عاشق اس حملے میں ملوث نہیں ہیں اور نہ ہی ان کا اس قسم کا کردار ہے۔ اس حملے کی اطلاع جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی۔ میں نے سیّد تنویر الحسن کو فون کر کے اس حادثے کی اطلاع دی۔ وہ خود آ کر مجھے اپنے جلسوں میں لے گئے۔ بعد میں مختلف ایجنسیوں نے بھی مجھ سے اس حادثے کی تفصیلات معلوم کیں*۔ آج میرے عاشق شجرا سے اچھے تعلقات ہیں۔

ان بلدیاتی انتخابات کا قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ مسلم لیگ (نواز گروپ) کے وفاقی وزیرِ صحت جاوید ہاشمی اور ایم این اے سکندر بوسن انتخابی نتائج کے باعث دو گروپوں میں تقسیم ہو گئے۔ وزیرِ مملکت برائے اُمورِ خارجہ صدیق کانجو نے دونوں گروپوں کو یہ تجویز دی کہ جس کے پاس تحصیل ملتان سے زیادہ اراکین ہوں، وہی چیئرمین ضلع کونسل، ملتان ہوگا۔ تیسرا پیپلز پارٹی

* لیکن اس معاملے کی تحقیقات نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکیں۔

کا گروپ میری قیادت میں متحد تھا۔ ہماری حیثیت فیصلہ کن ووٹ کی تھی کہ جس کی تحصیل ملتان سے ہم حمایت کرتے وہی گروپ کامیاب ہوتا۔ مقامی طور پر جاوید ہاشمی، شاہ محمود کے اور سکندر بوسن میرے حریف تھے۔ میں الیکشن سے پہلے سلیکشن کا حامی نہیں ہوں۔ اس لیے میں نے اپنے گروپ سے ملاقات کی اور طے پایا کہ الیکشن شیڈول کے اعلان پر لائحہ عمل طے کیا جائے گا اور یہ کہ ہم جاوید ہاشمی یا سکندر بوسن میں سے کسی کی حمایت نہیں کریں گے۔ میں اور شاہ محمود اس بات پر متفق ہو گئے کہ اگر مسلم لیگ کے پاس اکثریت ہے تو یہ اُن کی پارٹی کا اندرونی معاملہ ہے۔ اسی دوران جاوید ہاشمی نے چیئر مین ضلع کونسل کے انتخاب کے سلسلے میں ہماری حمایت حاصل کرنے کے لیے چچا حامد رضا کے گھر آ کر ہم سے ملاقات کی۔ ملاقات میں میرے علاوہ چچا کے داماد سیّد سلیمان گردیزی اور میرے بھانجے سیّد سمیع حسن گیلانی بھی موجود تھے۔ میں نے انہیں اپنا تجزیہ بتایا کہ وزیرِ اعظم نواز شریف، وفاقی وزارت اور چیئر مین ضلع کونسل کا عہدہ ایک ہی خاندان میں نہیں دیں گے بلکہ وہ ضلع میں توازن قائم رکھنے کی کوشش کریں گے لیکن جاوید ہاشمی نے مجھ سے اتفاق نہ کیا۔ الیکشن شیڈول کے اعلان کے ساتھ ہی وزیرِ اعظم نے شجاع آباد سے ایم این اے جاوید علی شاہ کے بھائی مجاہد علی شاہ کو چیئر مین ضلع کونسل کے لیے نامزد کر دیا اور وہ بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔

میں پیپلز پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لیے کراچی گیا۔ میٹنگ کے اختتام پر محترمہ نے حیدر آباد میں جلسۂ عام سے خطاب کرنا تھا۔ اس سلسلے میں جب ریلی حیدر آباد کے لیے روانہ ہوئی تو میں اس میں شامل ہو گیا۔ راستے میں دونوں اطراف مرد، خواتین، بوڑھے، جوان اور بچے سخت گرمی میں محترمہ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے منتظر کھڑے تھے۔ اگر لوگ اُن کی جھلک دیکھنے میں ناکام رہ جاتے تو مجھے بہت دکھ ہوتا۔ لوگ جس جذبے اور ولولے سے اُن کی طرف اُمڈ کر آ رہے تھے اس سے یہ بات عیاں تھی کہ ذوالفقار علی بھٹو عوام کے دلوں میں ایک ایسا اَنمٹ نقش چھوڑ گئے ہیں کہ جیسے ہر دل میں بھٹو دھڑکتا ہے۔ وہ بھٹو کو آج بھی زندہ محسوس کرتے ہیں۔ جو لوگ جنگلوں اور ریگستانوں سے کئی میل مسافت طے کر کے آئے وہ پیپلز پارٹی کو مظلوم طبقے کا ترجمان سمجھتے تھے۔

بے نظیر بھٹو کے دورِ حکومت میں ان کو آرمی کی طرف سے کارگل منصوبے پر بریفنگ

دی گئی جس پر اُن کا مؤقف تھا کہ فوجی قوت کے ساتھ اس منصوبے پر عمل تو کیا جا سکتا ہے مگر اس پر قائم رہنے کے لیے سفارتی سطح پر مشکلات کا سامنا ہوگا۔ کارگل ہمیشہ پاکستان آرمی کی لیڈرشپ کا ایک پسندیدہ منصوبہ رہا ہے۔ آرمی نے وزیرِ اعظم نواز شریف کو بھی اس منصوبے پر بریفنگ دی اور اس پر عملدرآمد کے لیئے منظوری طلب کی۔ نواز شریف نے سبک دوشی کے بعد یہ دعویٰ کیا کہ میں نے اس منصوبے پر عملدرآمد کی منظوری نہیں دی تھی لیکن آرمی لیڈرشپ کا دعویٰ اس کے برعکس ہے۔ اسی دور میں بھارت کے ساتھ بہتر تعلقات استوار کرنے کے اسباب بھی ڈھونڈے گئے۔ بھارت کے وزیرِ اعظم اٹل بہاری واجپائی نے اُن دنوں پاکستان کا دورہ کر کے مینارِ پاکستان پر کشمیر کو متنازعہ مسئلہ قرار دیا جو سفارتی سطح پر نواز شریف کی بہت بڑی کامیابی تھی جبکہ دوسری طرف مسلح افواج کے سربراہان نے بھارت کے وزیرِ اعظم کی لاہور آمد پر اُن کا استقبال نہیں کیا۔ اٹل بہاری واجپائی نے بھی ایک اور موقعہ پر طنزاً کہا کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ جو امن بس لاہور سے دہلی چلائی جا رہی تھی اس کی منزل کارگل تھی۔

کارگل کا واقعہ نہایت ہی متنازعہ اور کسی منصوبہ بندی کے بغیر تھا۔ اس جنگ میں دونوں اطراف سے بہت زیادہ نوجوان افسر اور فوجی جوان جان کی بازی ہارے۔ پاکستانی فوج کے جو سپاہی شہید ہوئے انہیں سرکاری طور پر شہید کہنے کی ممانعت تھی کیونکہ حکومتِ پاکستان کا مؤقف تھا کہ کارگل میں مجاہدین برسرِ پیکار ہیں نہ کہ پاکستانی فوج، جس سے آرمی کے جونیئر افسران بددل ہوئے اور سفارتی سطح پر پاکستان کے وقار کو بہت ٹھیس پہنچی۔ اس طرح مکمل تیاری اور مقاصد کا تجزیہ کیے بغیر اس منصوبے کی کامیابی کے امکانات بہت کم تھے۔ نواز شریف پر اپنی فوجیں واپس بلانے کے لیے سفارتی سطح پر عالمی دباؤ بڑھ گیا۔ انہوں نے امریکہ کے صدر بل کلنٹن سے ہنگامی طور پر ملاقات کی اور انہیں آگاہ کیا کہ اگر کارگل سے فوج واپس بلائی گئی تو اس کا فوج کی طرف سے شدید ردِ عمل ہونے کا خدشہ ہے۔ صدر کلنٹن نے انہیں اس خدشے سے محفوظ رکھنے کی یقین دہانی کروائی لیکن فوجیں واپس بلانے پر مُصر رہے۔ 'وائٹ ہاؤس' امریکہ میں one-on-one ملاقات کے فوراً بعد مشترکہ اعلامیے میں صدر کلنٹن کی موجودگی میں نواز شریف کو فوجیں واپس بلانے کا اعلان کرنا پڑا۔ فوجیں واپس آ گئیں مگر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جو تعلقات ہموار ہو رہے تھے، وہ اس جنگ کی وجہ سے خراب ہو گئے اور یوں مسئلہ کشمیر کا حل اور بھی دور ہو گیا۔

میری 1999ء میں برطانیہ کی ڈپٹی ہائی کمشنر میڈم سمتھ سے اسلام آباد میں ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھے اتوار کے دن اپنی رہائش گاہ پر ظہرانے کے لیے مدعو کیا۔ دوران گفتگو انہوں نے کہا کہ نواز شریف شہنشاہ بننا چاہتے ہیں، وہ پندرھویں ترمیم پاس کروانا چاہتے ہیں جس سے ملک میں آمریت آجائے گی، ایسا ہوا تو ہم یہاں سے پیک اَپ کر کے چلے جائیں گے۔ میں نے محسوس کر لیا کہ اَب وزیرِ اعظم یہ ترمیم پاس نہیں کروا سکیں گے۔

برطانوی ڈپٹی ہائی کمشنر کی ملاقات کے چند روز بعد آئی جی اسلام آباد اسرار احمد سے اسلام آباد کلب میں میری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ آپ میرے ذریعے نواز شریف سے ملاقات کریں کیونکہ وہ آپ کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ وہ پندرھویں ترمیم کی وجہ سے خاصے مضبوط ہو جائیں گے۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ کو باہر کے حالات کا اندازہ نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ میاں صاحب کی حکومت ختم ہو رہی ہے۔ وہ اس بات پر حیران ہوئے کہ انہوں نے حکومت کی اتنی تعریف کی اور اس کے باوجود میرا جواب یہ ہے۔ وہ دوسرے روز مجھ سے ملنے پھر اسلام آباد کلب آ گئے۔ اُنہوں نے مجھ سے آتے ہی دریافت کیا کہ گیلانی صاحب! آپ کا کیا اندازہ ہے کہ نواز حکومت کب ختم ہو رہی ہے؟ میں نے انہیں اپنے تجزیئے سے بتایا کہ مارچ 2000ء میں سینٹ کے انتخابات ہوں گے جس میں نواز شریف کو دو تہائی اکثریت حاصل ہو جائے گی اور انہیں آئینی ترامیم کرنے کا موقع مل سکتا ہے اور یہ کہ عام انتخابات کے لیئے آئینی طور پر نوے دن کا عرصہ درکار ہے، لہٰذا مارچ سے نوے دن پہلے نومبر 1999ء میں نواز شریف کی حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ کہنے لگے کہ اگر نومبر تک نواز حکومت کا خاتمہ نہ ہوا تو کیا آپ اُس کے بعد مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لیں گے؟ میں نے اُن سے کہا کہ اگر پندرھویں ترمیم پاس ہوگئی تو اس سے ملک میں آمریت قائم ہو جائے گی اور وزیرِ اعظم 'امیر المومنین' بن جائیں گے، لہٰذا مجھے نومبر میں ان دو میں سے ایک فیصلہ کرنا ہوگا کہ یا تو میں سیاست کو خیر باد کہہ دوں یا میاں صاحب کے ساتھ شمولیت اختیار کر لوں۔ میری یہ بات اُن سے جولائی کے مہینے میں ہوئی تھی۔ جنرل پرویز مشرف نے 12 اکتوبر 1999ء کو میاں نواز شریف کی حکومت برطرف کر دی اور خود ملک کے چیف ایگزیکٹو بن گئے۔ میں دو دن بعد 14 اکتوبر کو اسلام آباد پہنچا اور ملاقات کے لیے آئی جی اسلام آباد اسرار احمد کو بلوایا تو معلوم ہوا کہ

وہ اپنے گھر میں نظر بند ہیں۔

گرینڈ ڈیموکریٹک الائنس کی طرف سے نواز شریف کے خلاف کامیاب ریلیاں نکالی گئیں۔نواز شریف کے اتحادیوں نے انہیں ایک ایک کر کے چھوڑ دیا اور وہ تنہا رہ گئے۔ اختلافِ رائے کو برداشت نہ کرنا، ایک ہی صوبے سے صدر اور وزیرِ اعظم کا ہونا، ایک ہی خاندان سے وزیرِ اعظم اور وزیرِ اعلیٰ پنجاب کا ہونا، اپنی حلیف جماعتوں کو اپنے ساتھ لے کر نہ چل سکنا، کابینہ اور پارلیمانی پارٹی کا اجلاس بلانے میں تاخیر کرنا، پنجاب کا نعرہ لگانا، بھٹو مخالف نعرہ لگانا، ییلو کیب سکیم کے معاملات، کوآپریٹو سکینڈل فوج کو مختلف سول اداروں میں تعینات کرنا اور فارن کرنسی اکاؤنٹس کو منجمد کرنا، نواز شریف کی ناکامی کا سبب بنے۔

باب نہم

جنزل پرویز مشرف کا دورِ حکومت (1999ء تا حال)

کارگل کے واقعہ کے بعد نواز شریف اور فوج میں فاصلے بڑھ گئے۔ میاں صاحب نے چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف کو برطرف کر کے جنرل ضیاءُالدین بٹ کو آرمی چیف تعینات کر دیا تو اعلیٰ عسکری قیادت نے اس فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا اور بالآخر میاں صاحب پر طیارہ اغواء کیس بنا کر انہیں گرفتار کر لیا گیا اور اُن کی حکومت برطرف کر کے اسمبلی معطل کر دی گئی۔ جنرل پرویز مشرف ملک کے چیف ایگزیکٹو بن گئے۔ اسمبلی کئی ماہ معطل رہی جب مشرف حکومت کو مثبت نتائج نہ ملے تو اسمبلی تحلیل کر دی گئی۔ ابتداء میں جنرل مشرف نے سابق صدر رفیق تارڑ کو اُن کے عہدے پر تعینات رہنے دیا مگر کچھ عرصے بعد انہیں ہٹا کر خود صدر بن گئے۔

2001ء میں ریفرنڈم کا اعلان کیا گیا۔ جس طریقۂ کار سے ریفرنڈم کروایا گیا اُس سے پوری قوم تقسیم ہو گئی اور صدر مشرف ایک متنازعہ شخصیت کے طور پر سامنے آئے۔ بعد میں جنرل مشرف نے خود اعتراف کیا کہ اُن کا ریفرنڈم کروانے کا فیصلہ غلط تھا۔ 2002ء کے بلدیاتی انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر کروائے گئے۔ نتیجہ نکلا تو اکثریت پیپلز پارٹی کی تھی، کنگز پارٹی کا اعلان کر کے تمام ناظمین و نائب ناظمین کو اس پارٹی میں شامل کروایا گیا۔

عام انتخابات میں قبل اَز انتخاب اور بعد اَز انتخاب دھاندلی کروائی گئی حتیٰ کہ دھاندلی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے گئے۔ اس کے باوجود اِن عام انتخابات میں پیپلز پارٹی نے بحیثیت سیاسی جماعت تمام جماعتوں سے زیادہ ووٹ حاصل کر کے نہ صرف اپنی برتری ثابت کر دی بلکہ بے نظیر بھٹو کی مقبولیت پر بھی مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

ظفر اللہ جمالی کو تمام تر حکومتی ہتھکنڈوں کے سہارے بمشکل وزیرِ اعظم بنوایا جا سکا۔ بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کو ملک سے باہر رکھا گیا۔ مسلم لیگ کو سرکاری ایجنسیوں کی بیساکھیوں پر کھڑا کرنے کی کوشش کی گئی۔ سترھویں ترمیم پاس کروائی گئی جس سے پارلیمنٹ کی بالادستی ختم ہو کر رہ گئی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ نیشنل سیکورٹی کونسل کا ادارہ قائم کیا گیا جو پارلیمنٹ کے تابع نہیں ہے۔ آئین کی شق 91(4) کے مطابق کابینہ اور وزرائے مملکت قومی اسمبلی کو جواب دہ ہیں مگر یہ ادارہ کسی کو جواب دہ نہیں۔

10 رفروری 2001ء سے قبل کراچی میں پیپلز پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ بے نظیر بھٹو کی وطن واپسی پر اُن کا شاندار استقبال لاہور میں کیا جائے۔ میں نے اس سلسلے میں پورے ملک میں کئی طوفانی دورے کیے اور سابق صدر پیپلز پارٹی پنجاب راؤ سکندر اقبال کے ساتھ مل کر کئی جلسوں اور ریلیوں میں شرکت کی۔ پیپلز پارٹی بورے والا، وہاڑی کے دو گروپ بن گئے۔ ایک گروپ سابق ایم این اے چوہدری قربان علی چوہان اور دوسرا گروپ ارشاد ارائیں کا تھا۔ میری شرکت پر دونوں گروپوں کو مکمل اعتماد تھا۔ مجھے دونوں گروپوں نے الگ الگ جلسۂ عام کی دعوت دی۔ میں نے ایک ہفتے کے وقفے سے وہاڑی کے دو عظیم الشان جلسوں سے خطاب کیا جس کی وجہ سے پارٹی متحرک ہوئی۔ میں نے لاہور میں بھی کئی جلسوں سے خطاب کیا۔ اس کے علاوہ میں نے کمالیہ میں خالد احمد کھرل کے جلسے میں شرکت کی۔ ان جلسوں کے چند دنوں بعد میرا ایک انٹرویو انگریزی اخبار 'دی نیوز' میں شائع ہوا جس پر نیب نے میرے بے باک ہونے کا بُرا منایا۔ میں نے احتساب عدالت راولپنڈی میں انگریزی اخبار 'دی نیوز' کا انٹرویو ° اپنے پہلے ریفرنس میں Section 342 Cr.P.C کے بیان میں شامل کیا جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

بینظیر کی (وطن) واپسی (سیاسی) خلا پُر کرنے کے لیے ضروری۔ گیلانی۔ انٹرویو طارق بٹ 'روزنامہ 'دی نیوز' مورخہ 10 رفروری 2001ء

> سابق وزیرِ اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کے پاس وطن واپس آنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔ اگر وہ سیاست میں اپنا کردار ادا کرنا چاہتی ہیں۔ یوسف رضا گیلانی وائس چیئرمین پاکستان پیپلز پارٹی و سابق سپیکر قومی

° اخبار کے تراشے کا عکس آخر میں موجود ہے۔

اسمبلی نے کہا کہ نواز شریف کی ملک بدری کے بعد ملک میں ایک سیاسی خلا ہے۔ سیاسی منظر پر کوئی تیسری قوت نہیں ابھری ہے۔ اس لیے بے نظیر بھٹو کے پاس وطن واپسی کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ گیلانی نے دی نیوز کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ چند سیاسی پارٹیوں نے تیسری قوت بننے کی کوشش کی لیکن خود کو نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کا نعم البدل ثابت نہ کر سکیں۔ دونوں قومی دھارے کی سیاسی پارٹیوں کے سربراہان ملک سے باہر ہیں۔ One by design and other by default. انہوں نے کہا کہ موجودہ حکومت عوامی مشکلات کا ازالہ کرنے میں ناکام رہی ہے، لہٰذا عوام ایک بار پھر سابق سیاسی قوتوں پر اعتماد کرنے کے لیے تیار ہیں۔ گیلانی نے کہا کہ کوئی بھی نواز شریف کو وطن واپسی پر کسی قانون کے تحت روک نہیں سکتا۔ ملک بدری کی آئین میں کوئی گنجائش نہیں۔

انہوں نے کہا کہ نواز شریف حکومت کے خاتمے پر عوام کا ردِ عمل جذباتی تھا جو کہ اب ختم ہو چکا ہے اور حقائق سامنے آ چکے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مشرف حکومت کے پاس سوائے عام انتخابات کروانے کے کوئی چارہ نہیں، ملک چلانا سیاستدانوں کا کام ہے اور یہ انہی پر چھوڑنا چاہیے۔

عدالتِ عظمیٰ سے فوجی حکمرانوں کے 12/اکتوبر 1999ء کو اقتدار سنبھالنے کی توثیق 'validation' کے خلاف نظر ثانی اپیل میں حالیہ فیصلہ آنے کے بعد فوجی حکومت کے پاس عام انتخابات منعقد نہ کروانے کا کوئی اخلاقی جواز نہیں۔ گیلانی نے کہا کہ حکومت اور پی پی پی کے درمیان بے نظیر کی واپسی بارے کوئی سمجھوتہ نہیں ہوا۔ اس سمجھوتے کے بارے میں قیاس آرائیاں محض افواہ ہیں جس کے لیے انہوں نے فوجی حکومت کو الزام دیتے ہوئے مخصوص مفادات کے حامل افراد کو ذمہ دار ٹھہرانے پر اکتفا کیا۔ اگر حکومت کے ساتھ کوئی سمجھوتہ ہوا ہوتا تو پاکستان پیپلز پارٹی اپنی طاقت عوام کو متحرک کرنے پر صرف کرنے میں نہ لگی ہوتی بلکہ آرام

سے گھروں میں بیٹھی ہوتی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنما نے کہا بے نظیر کی واپسی اَشد ضروری ہے اس لیے کہ آج تو یہ خلا موجود ہے ہوسکتا ہے کل یہ نہ رہے۔ گیلانی نے کہا کہ پاکستان پیپلز پارٹی اپنی توانائیاں عوام کو جانچنے اور بے نظیر بھٹو کی وطن واپسی کے لیے صَرف کر رہی ہے۔ گیلانی نے بے نظیر کی واپسی کے لیے کوئی تاریخ نہیں دی اور کہا نہ تو بے نظیر اور نہ ہی پاکستان پیپلز پارٹی کا کوئی اور رہنما 1986ء جیسے استقبال کا تصور ذہن میں رکھتا ہے۔ اس دن کا استقبال اسی دن کے لیے تھا۔ محترمہ کی واپسی پر پُر جوش استقبال مسائل کا حل نہیں بلکہ اُن کی وطن واپسی زیادہ اہم ہے۔

انہوں نے مزید کہا کہ بے نظیر بھٹو کی واپسی پر گرفتاری خارج اَز امکان ہے۔ پارٹی کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں جب پاکستان پیپلز پارٹی اُنہیں واپسی کا سگنل دے گی یقیناً ہم ہر قسم کی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی تیار ہوں گے۔

گیلانی نے کہا کہ پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ (ن) نے ملک کو دو پارٹی سسٹم دیا اور علاقائی جماعتوں کو جاگیردارانہ سیاست کے چنگل سے آزاد کرواتے ہوئے اپنے اندر سمو لیا۔ انہوں نے کہا آج پھر صوبائیت اور 1940ء کی قرارداد کی باتیں ہو رہی ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ چھوٹی پارٹیاں، قومی دھارے میں شامل نہیں رہیں۔

چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف کے ان تاثرات پر کہ وہ سیاستدانوں کی فریب کاریوں پر بات نہیں کرتے، گیلانی نے کہا کہ سیاستدانوں کو اپنا کردار ادا کرنا ہے خواہ وہ کسی کو پسند آئے یا نہ آئے۔ ہمیں جلد یا بدیر اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ کوئی ملک سیاستدانوں کے بغیر نہیں چل سکتا۔ جب سیاستدانوں کی کردار کشی کی جائے، انہیں نکال باہر پھینکا جائے اور اُن پر تہمتیں لگائی جائیں تو علیحدگی پسند قوتیں سامنے آ جاتی ہیں۔

اس وقت بہت زیادہ مسائل دَرپیش ہیں۔ سب سے پہلے سیاسی خلا

ہے۔ مذہبی تشدد بڑھ رہا ہے۔ آئین معطل ہے اور قیمتوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنما نے کہا کہ ان مسائل کے حل کے لیے پاکستان کو ایسے رہنما چاہئیں جن میں دُور اندیشی ہو۔ ملک میں سیاسی سرگرمیاں ہوں تا کہ قومی یک جہتی کی فضا قائم کی جا سکے اور ایسی فضا جس میں عوام پاکستانی کہے جانے پر فخر محسوس کریں۔ انہوں نے کہا کہ لوگ موجودہ حکومت سے نالاں ہو گئے ہیں جنھوں نے اسے 12/اکتوبر 1999ء کو اپنی اُمیدوں کا محور سمجھ کر قبول کیا تھا مگر آج حکومت نے انہیں پسِ پشت ڈال دیا ہے۔

گیلانی نے کہا کہ اگر چہ ملک کو اس وقت مختلف مسائل درپیش ہیں تاہم وہ اس کے مستقبل کے بارے میں مایوس نہیں ہیں کہ پاکستان ایک زبردست اور بے انتہا صلاحیتوں کا حامل ملک ہے۔ احتساب کے متعلق پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنما نے کہا کہ اُن کی پارٹی احتساب کے عمل کی حمایت کرتی ہے لیکن یہ اداراتی طرز پر ہونا چاہیے۔ احتساب اور انتقام کے درمیان بہت باریک لائن ہوتی ہے۔ احتسابی ادارے کا سربراہ انتظامیہ سے نہیں بلکہ عدلیہ سے ہونا چاہیے تا کہ احتسابی عمل صاف و شفاف ہو۔ جب ہر آنے والا جانے والے کا احتساب شروع کر دے تو ایک لامتناہی سلسلۂ اذیت شروع ہو جائے گا اور سیف الرحمٰن جیسے لوگوں کا آنا جاری رہے گا۔ گیلانی نے سیاست میں نئے آغاز کے لیے سچائی اور ہم آہنگی کمیشن (Truth and Reconciliation Commission) کے قیام کا مطالبہ کیا۔

سراغ رساں اداروں میں آلاتِ جاسوسی کے متعلق انکشافات کے بارے میں سوال پر پی پی پی کے رہنما نے کہا سراغ رساں ادارے ہمیشہ اپنے وجود کے ہونے کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ اَب وقت آ گیا ہے کہ ہر ادارہ 1973ء کے آئین کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے کام کرے

ورنہ اداروں کے تصادم کی وجہ سے غیر یقینی حالات پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔انہوں نے کہا کہ 1973ء کے آئین میں حکومتی اداروں کے لیے واضح ہدایات موجود ہیں جن پر کاربند رہ کر کسی بھی تباہی کو روکا جا سکتا ہے۔گیلانی نے بے نظیر بھٹو کے ایک سخت قسم کے انٹرویو کے بارے میں جو انہوں نے سراغ رساں اداروں کے متعلق دیا تھا کہا اُن کو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ بے نظیر نے یہ بیان کس تناظر میں دیا۔جنرل ضیاءُ الحق اور جنرل پرویز مشرف کی حکومتوں میں فرق کے بارے میں گیلانی نے کہا کہ ضیاءُ الحق نے اپنے گرد بھٹو کے مخالفین کو جمع کیا مشرف،نواز کے مخالفین پر اعتماد کرنے میں ناکام ہو گئے جو جی ڈی اے میں جمع ہوئے جو اس کے پیچھے تھے۔پاکستان نیشنل الائنس نے عوام اور ضیاء حکومت کے درمیان shock absorber کے طور پر کام کیا لیکن اس دفعہ حکومت اور عوام کے درمیان کوئی شاک ابزار بر نہیں ہے۔حکومت کی کارکردگی پر عوام کی مایوسی ایک واضح ثبوت ہے۔

مجھے اُسی روز 10 رفروری 2001ء کو دوپہر تین بجے میری رہائش گاہ 155 بی ڈیفنس، لاہور سے گرفتار کر لیا گیا۔گرفتاری سے قبل تھائی لینڈ میں مقیم میرے کاروباری دوست مشتاق مگسی مجھ سے ملنے میرے گھر آئے ہوئے تھے۔جب وہ کھانا کھا چکے تو میں انہیں رخصت کرنے کے لیے کار تک گیا اور جب میں واپس آ کر ٹی وی لاؤنج میں اپنی اہلیہ کے ہمراہ چائے پی رہا تھا تو اچانک میرا ڈرائیور نوید بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوا اور کہا: ''پولیس''۔دیکھتے ہی دیکھتے ٹی وی لاؤنج پولیس نفری سے بھر گیا جس میں لیڈی پولیس بھی شامل تھی۔مجھے ڈی ایس پی نے کہا کہ آپ زیر حراست ہیں۔میں نے پولیس کے ہمراہ جانے سے پہلے اپنی اہلیہ سے کہا کہ آپ کسی سے بھی میری سفارش نہ کریں ماسوائے دو دوستوں کے۔میرا اشارہ جنرل سعید زیدی اور میجر انعام باری کی طرف تھا جو جنرل مشرف کے بہترین دوست ہیں۔جنرل سعید زیدی نے بعد ازاں پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور عام انتخابات 2002ء میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کی نشست کے لیے انتخاب میں بھی حصہ لیا۔وہ میری اسیری کے دوران مجھ سے ملنے سنٹرل جیل اڈیالہ

راولپنڈی بھی آئے۔

مجھے پولیس کی حراست میں سیدھا 'چمبہ ہاؤس' لے جایا گیا۔ ان دنوں 'چمبہ ہاؤس' کو نیب تھانہ بنایا گیا تھا۔ مجھے پہنچتے ہی کہا گیا کہ آپ گھر فون کر کے اپنا سامان منگوا لیں کیونکہ ہم نے آپ کو راولپنڈی لے جانا ہے۔ میں نے نماز ادا کرنے کے لیے جگہ دریافت کی تو انہوں نے میرے لیے دفتر کے سامنے والے کمرے کو کھول دیا۔ وہاں پہلے ہی سے ایک سرکاری ملازم فرش پر چادر بچھائے بیٹھا تھا۔ کمرے کے شیشے کالے رنگ سے پینٹ کیے گئے تھے۔ کمرے کا ملحقہ غسل خانہ توڑ دیا گیا تھا اور اس کی جگہ ایک کونے میں تقریباً 3x3 فٹ لمبائی چوڑائی اور ڈیڑھ فٹ اونچی دیوار والا غسل خانہ بنایا ہوا تھا۔ وہاں اگر وضو کے لیے بیٹھا جائے تو دوسروں کو نظر آتا تھا خیر میں نے بمشکل وضو کیا۔ اس افسر نے اپنی چادر دی جس پر میں نے نماز ادا کی۔ مجھے کچھ دیر بعد ایک دفتر میں لے جایا گیا اور دریافت کیا گیا کہ آپ راولپنڈی پولیس وین پر جائیں گے یا جہاز پر؟ میں نے کہا کہ میں جہاز پر جاؤں گا۔ انہوں نے کہا کہ آپ جہاز پر جانے کے لیے تین اور واپسی کے لیے دو ٹکٹیں منگوا لیں۔ میں نے فون کر کے جہاز کے ٹکٹ منگوا لیے۔ مجھے رات نو بجے ائرپورٹ لے جایا گیا۔ ائرپورٹ پہنچا تو وہاں پہلے ہی سے میرے بیٹوں کے علاوہ میرا داماد خرم، بھانجا شاہد اور دوست تنویر مظفر موجود تھے۔ میں نے بچوں کو دلاسہ دیا۔ جہاز پر سوار ہونے سے پہلے ائرپورٹ لاؤنج میں میری نظر ٹیلی ویژن پر پڑی تو مجھے اپنی تصویر دکھائی دی ساتھ ہی میرے ریفرنس کی کہانی بیان کی جا رہی تھی۔ میرے دوست تنویر مظفر میرے ہمراہ راولپنڈی تک آئے۔ جب میں اسلام آباد ائرپورٹ پہنچا تو وہاں بھی چند دوست موجود تھے۔

مجھے نیب تھانہ راولپنڈی لے جایا گیا جہاں مجھے چھوٹے سے کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ مجھے کمرے میں ایک چارپائی دے دی گئی۔ میرے کھڑکی کھولنے پر کہا گیا کہ یہ اندر سے ویلڈ ہے، نہیں کھلے گی۔ شیشوں پر sand blasting کی ہوئی تھی۔ مجھے وہاں جس حقارت سے لایا گیا، اس احساس سے تمام رات نہ سو سکا۔ صبح سات بجے کے قریب ایک پولیس اہلکار آیا اور کہا کہ آپ آٹھ بجے تیار رہیں کیونکہ ہم نے آپ کو کہیں لے جانا ہے۔ اتوار کا دن تھا میں نے ساتھ والے سیل میں پابندِ سلاسل ڈاکٹر عبدالقدوس سے اخبار مانگا اور جب پڑھا تو وہ میری ہی خبروں سے بھرا ہوا تھا۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ اکثر سیاسی قائدین نے میری گرفتاری پر میرے حق میں بیان دیے تھے

جن میں بے نظیر بھٹو، مخدوم امین فہیم اور خصوصاً نوابزادہ نصراللہ خان شامل تھے۔ نوابزادہ صاحب میری خوش دامن کے رشتے میں ماموں تھے۔

جب مجھے صبح نو بجے کے قریب کہیں لے جایا جارہا تھا تو میں نے دریافت کیا کہ آپ مجھے کہاں لے جارہے ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ تھانے کے نیچے عدالت ہے اور ہم نے آپ کو جج کے سامنے پیش کر کے جسمانی ریمانڈ حاصل کرنا ہے۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ چھٹی کے دن بھی عدالت لگی ہوئی تھی۔ میں نے ساتھ ہی کہا کہ مجھے وکیل رکھنے کی اجازت دی جائے مگر مجھے میرے وکیل کے بغیر ہی عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ میں نے احتساب جج سخی بخاری (جو اَب ہائی کورٹ کے جج ہیں) کے سامنے اپنی گرفتاری پر احتجاج کرتے ہوئے اپنا موَقف یوں پیش کیا کہ اگر فوج کے متعلقہ کسی شخص کا احتساب ہونا ہو تو اس کا کورٹ مارشل ہوتا ہے، اگر کسی جج کا احتساب ہونا ہو تو اُسے سپریم جوڈیشل کونسل میں لے جایا جاتا ہے اور اگر کسی عوامی نمائندے کا احتساب ہونا ہو تو وہ پبلک اَکاؤنٹس کمیٹی کر سکتی ہے، مجھے آج تک پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔ جج نے دو ہفتے کا جسمانی ریمانڈ دے دیا۔

دوسرے روز نیب تھانے میں میری اہلیہ، بچے اور دیگر عزیز و اقارب میری ملاقات کے لیے آئے، ہماری حساس ایجنسیوں کی نگرانی میں ملاقات کروائی گئی۔ ملاقات کے دوران ایک خاتون جس کا تعلق انہی اداروں سے تھا، دروازے میں بیٹھی ہماری ہر بات سن رہی تھی۔ میری اہلیہ نے کہا کہ آپ کی اچانک گرفتاری کی وجہ سے گھر پر ہمارے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے۔ میں نے اُن سے دریافت کیا کہ آپ کے پاس میری چیک بک ہے؟ انہوں نے اپنے پرس میں سے چیک بک نکال کر میرے سامنے رکھ دی اور میں نے دستخط کر دیے۔ اہلیہ سے دوسری ملاقات پر معلوم ہوا کہ گزشتہ ملاقات کے دوران ڈیوٹی پر مامور خاتون نے مجھے چیک پر دستخط کرتے دیکھ لیا تھا جس پر نیب نے میرے تمام بینک اکاؤنٹس منجمد کر دیے جو تادمِ تحریر منجمد ہیں۔ اس وجہ سے میری اہلیہ کو رقم نہ مل سکی۔ مجھے آج تک کسی ذاتی ضرورت جیسے بچوں کی سکول فیس کی ادائیگی اور یوٹیلیٹی بلز کے لیے بھی ان اکاؤنٹس میں سے کبھی کوئی رقم نکالنے نہ دی گئی حالانکہ نیب کے دیگر مقدمات میں ایسی اجازت دی گئی ہے۔ جب بچوں کو رقم کی ضرورت پڑی تو میں نے انہیں کار بیچنے کو کہا۔ کچھ عرصے بعد لاہور والا گھر بھی بیچ دیا۔ یہ دونوں چیزیں کم قیمت میں فروخت ہو سکیں، مجبوریوں کی مسافت

میں یہ کوئی بڑی قیمت نہیں۔

نیب تھانے میں میری پہلی ملاقات پر میرے تینوں جڑواں بیٹے حیدر، قاسم اور موسیٰ بھی آئے، وہ اُس وقت ساتویں جماعت میں ایکن ہاؤس ڈیفنس، لاہور میں زیرِ تعلیم تھے۔ میں انہیں گھر میں اکثر رات دس بجے کے قریب اونچی آواز میں کہا کرتا کہ بچو! آپ کی ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ وہ سمجھ جاتے اور اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ میری پہلی ملاقات کے دوران ایک پولیس اہلکار آیا اور میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ آپ کی ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے، آپ اپنے کمرے میں جائیں۔ میں نے اپنے بچوں پر نظر ڈالی تو اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

دوسرے روز تفتیش شروع ہوگئی۔ میرا تفتیشی اَفسر عبدالجلیل خان اسسٹنٹ ڈائریکٹر ایف آئی اے * نیب کے زیرِ اثر تھا جبکہ دوسرا تفتیشی اَفسر کرنل احمد یار بندیال فوج کی طرف سے تھا۔ وہ تفتیش کے لیے آتا، میرے ساتھ چائے پی کر چلا جاتا اور کہتا کہ میں بے بس ہوں، کسی کو جواب دہ ہوں۔

گرفتاری سے کچھ روز قبل میاں غلام محمد مانیکا نے مجھے کھانے پر مدعو کر کے بتایا کہ آپ کے خلاف نیب ریفرنس تیار کر رہا ہے اور یہ کیس اُن کے بیٹے کے دوست عبدالجلیل خان کے سپرد کیا جا رہا ہے لیکن میں نے ان کی اس بات پر یقین نہ کیا تھا۔ میاں غلام محمد مانیکا کے ساتھ میرے بزرگوں کے دیرینہ مراسم تھے۔ والد نے بطور وزیر بلدیات پنجاب انہیں میونسپل کمیٹی، پاکپتن کے چیئرمین کا انتخاب جیتنے میں مدد کی تھی کیونکہ اُس وقت ان کی عمر کم تھی۔

میری اہلیہ کے ماموں سابق سیکرٹری دفاع سلیم عباس جیلانی نے چیئرمین نیب جنرل خالد مقبول (موجودہ گورنر پنجاب) سے میری اہلیہ کی ملاقات کروائی۔ انہوں نے یقین دلایا کہ کچھ رقم جمع کروا دیں تو انہیں نااہل نہیں کیا جائے گا۔ مگر یہ سب کہنے کی باتیں تھیں، 'وہ' مجھے نااہل قرار دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ میرا ہر قسم کا رابطہ منقطع ہو چکا تھا اور جو رابطہ باقی تھا وہ صرف میری فیملی سے تھا۔ میری اہلیہ کو نیب والے کہتے تھے کہ آپ کے میاں کو چودہ برس جیل کی سلاخوں کے پیچھے رکھا جائے گا (جو بعد میں ثابت کر دکھایا)۔ اُن کے نزدیک رہائی کا ایک ہی ذریعہ تھا کہ میں

* Federal Investigation Agency (FIA)

plea bargain (اقبالِ جرم) کرلوں اور سیاست کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دوں۔ plea bargain کے متعلق نیب کا قانون مندرجہ ذیل ہے:

National Accountability Ordinance, 1999

Section 25 (b):

Where at any time after the authorization of investigation, before or after the commencement of the trial or during the pendency of an appeal, the accused offers to return to the NAB the assets or gains acquired or made by him in the course, or as a consequence , of any offence under this Ordinance, the Chairman, NAB, may, in his discretion, after taking into consideration the facts and circumstances of the case, accept the offer on such terms and conditions as he may consider necessary, and if the accused agrees to return to the NAB the amount determined by the Chairman, NAB, the Chairman, NAB, shall refer the case for the approval of the Court, or as the case may be, the Appellate Court and for the release of the accused.

دورانِ جسمانی ریمانڈ نیب تھانے میں سینکڑوں افراد مجھ سے ملاقات کے لیے ملک کے طول وعرض سے موسم کی سختیاں برداشت کرتے ہوئے آتے لیکن انہیں مجھ سے ملنے نہ دیا جاتا۔ یہ لوگ تھانے کے باہر سڑکوں پر کھڑے رہتے اور گھنٹوں انتظار کرتے۔ میں تھانے کی گیلری میں واک کرتے وقت اُن کے پریشان چہرے دیکھتا۔ مجھ سے ملاقات کے لیے آنے والوں میں اراکینِ قومی وصوبائی اسمبلی، پارٹی کارکنان، دوست، عزیز رشتہ دار اور سرکاری ملازمین شامل ہوتے۔ مجھے میری اہلیہ نے دورانِ ملاقات بتایا کہ آپ سے ملنے والوں کی کثیر تعداد ہم سے رابطہ

کرتی ہے، وہ مجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ نیب والے گیلانی صاحب کی رہائی کے بدلے کیا قیمت مانگتے ہیں۔ میری اہلیہ نے انہیں بتایا کہ اُن کے خلاف اَسی لاکھ روپے کے ریفرنسز بنائے گئے ہیں۔

چند دنوں بعد انہی لوگوں نے دوبارہ رابطہ کیا اور کہا کہ ہم نے پیسے اکٹھے کر لیے ہیں آپ گیلانی صاحب کی رہائی کے لیے قیمت ادا کر دیں۔ میری اہلیہ نے مجھ سے مزید کہا کہ آج تو یہ لوگ آپ سے ملاقات کے لیے آ رہے ہیں اور ایسی پیشکش بھی کر رہے ہیں لیکن جب زیادہ عرصہ گزر گیا، نہ تو لوگ آئیں گے اور نہ ہی ایسی پیشکش کریں گے۔ میں نے اہلیہ کو جواب دیا کہ میں اُصولوں پر سمجھوتہ نہیں کروں گا۔ کچھ عرصے بعد دورانِ اسیری مجھے عدالت سے علاج کے لیے جب ہسپتال جانے کی اجازت مل گئی تو ہسپتال میں اتنے لوگ میری ملاقات کے لیے آتے کہ مجھے اپنی فیملی سے ملاقات کے لیے بہت کم وقت ملتا جس کا میری اہلیہ بھی مجھ سے گلہ کرتیں۔ طویل عرصہ گزرنے کے باوجود اَب بھی جیل میں مجھ سے کثیر تعداد میں ملاقات کے لیے لوگ آتے ہیں جن کا میں شکر گزار ہوں مگر جیل رولز کی پابندی کی وجہ سے بہت سے دوست احباب ناکام لوٹ جاتے ہیں۔

اسی دوران ملتان سے نواب صلاح الدین خان اور اُن کے داماد میجر (ر) لطیف اللہ خان ڈویژنل صدر پیپلز پارٹی ڈیرہ اسماعیل خان جو بعد میں ناظمِ اعلیٰ بھی رہے، مجھ سے ملنے نیب عدالت تاریخ کے موقعہ پر آئے۔ نواب صاحب کی عزیز داری صدر مشرف کے پرنسپل سیکرٹری جنرل غلام محمد سے تھی۔ مجھے لطیف اللہ خان نے دورانِ ملاقات مطلع کیا کہ وہ جنرل غلام محمد سے مل کر آئے ہیں، انہوں نے آپ کے متعلق کہا ہے کہ اگر وہ اقبالِ جرم کر لیں اور کچھ رقم جمع کروا دیں تو اُن کی رہائی ہو سکتی ہے ورنہ انہیں کئی سالوں تک پابندِ سلاسل رہنا پڑے گا۔ میں نے کہا کہ آپ میری طرف سے جنرل صاحب کو بتائیں کہ ہم ایک ہی سرائیکی علاقے کے رہنے والے ہیں اور انہوں نے ریٹائر بھی ہونا ہے؟ دوسرے روز اخبارات میں جنرل صاحب کی حادثاتی موت کی خبر پڑھ کر مجھے دُکھ ہوا۔

ع سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

نیب راولپنڈی میں تعینات بریگیڈیئر قیصرانی نے میری فیملی کو نیب آفس بلایا۔ وہ نیب

کے سپیشل انویسٹی گیشن ونگ سے منسلک تھے۔ اُس دن اتفاق سے کیمرج، برطانیہ میں زیرِ تعلیم میرا بڑا بیٹا سیّد عبدالقادر بھی میری ملاقات کے لیے اپنی والدہ کے ہمراہ آیا۔ دورانِ ملاقات بریگیڈیئر قیصرانی نے میرے بیٹے سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ کا دِل نہیں چاہتا کہ آپ اپنے والد کے ساتھ ناشتہ کریں، اُن کے ساتھ کھانا کھائیں اور اُن کے ساتھ وقت گزاریں، ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر آپ کے والد اقبالِ جرم کرلیں تو ہم اُنہیں رہا کردیں گے اور وہ آپ کے ساتھ گھر چلے جائیں گے، وہ زیادہ سے زیادہ انتخابات کے لیے نااہل ہو جائیں گے۔ عبدالقادر کو برطانیہ سے آئے ہوئے ابھی چند گھنٹے ہوئے تھے۔ اس نے بریگیڈیئر قیصرانی سے کہا کہ جس ملک سے میں آرہا ہوں وہاں سیاستدانوں کے مستقبل کا فیصلہ عوام کرتے ہیں، مجھے یہ سن کر حیرت ہو رہی ہے کہ یہاں سیاستدانوں کے مستقبل کا فیصلہ آپ کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ بات سن کر میری اہلیہ سے کہا کہ نیب کے دفتر میں اس قسم کی بات نہیں کرنی چاہیے کیونکہ یہ بات گیلانی صاحب کے لیے مزید مشکلات پیدا کرسکتی ہے۔

دورانِ ریمانڈ میری اہلیہ اور میری بہن مسز معین بخاری نے میری ضروریات کا بہت خیال رکھا۔ میری اہلیہ نے ساری زندگی حتی الامکان طویل سفر سے گریز کیا مگر اُنہوں نے اس دوران رات دن ایک کردیا۔ وہ لاہور سے میری ملاقات کے لیے ہر ہفتے نیب تھانے اور بعد میں ہسپتال پہنچتی رہیں۔ میری بہن روزانہ کھانا، اخبارات اور اَدویات بھیجتی رہیں۔ اُن کے پاس ایک ہی کار تھی اس کے باوجود میرا بھانجا جواد معین خود روزانہ نیب تھانے ڈرائیور کے ہمراہ کھانا لے کر آتا تھا، اس وقت وہ تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ کبھی کبھار میرے دوست عمر فاروق کھوکھر بھی میرے لیے کھانا لے کر آتے تھے۔ میری اہلیہ اپنا فرض نبھا رہی تھیں اور بہن بھائی سے خلوص کا رشتہ۔ میری اہلیہ طبعاً بڑی حساس خاتون ہیں، وہ سوچتی تھیں کہ کہیں بہن اسلام آباد میں رہنے کے سبب خدمت میں اُن سے سبقت نہ لے جائیں۔

ایک بھرپور زندگی گزارنے کے بعد نیب تھانے میں قیدِ تنہائی کاٹتے ہوئے زندگی رُک سی گئی تھی۔ مختصر سے کمرے میں ایک ناقص چارپائی پر مسلسل تین ماہ گزارنے سے مجھے surviclle کی تکلیف شروع ہوگئی جس کی وجہ سے ہاتھوں میں numbness ہونے لگی۔ دورانِ جسمانی ریمانڈ میرا طبّی معائنہ راولپنڈی جنرل ہسپتال کی کارڈیالوجسٹ ڈاکٹر مس نصرت آراء سے

کروایا گیا۔انہوں نے باقی ٹیسٹ کے علاوہ دل کا ایکو ٹیسٹ بھی کیا۔ مجھے اُنہوں نے مزید معائنے کی غرض سے 72 گھنٹے کے لیے آفیسرز وَارڈ میں داخل کرلیا۔ میری فیملی بھی لاہور سے راولپنڈی پہنچ گئی۔دوسرے دن نیب سے میجر سیّد دلدار حسین ہسپتال آئے اور زبردستی میرا سامان جیل بس میں رکھوا کر بغیر معائنہ کروائے نیب تھانے واپس لے آئے۔

نوے دن کا جسمانی ریمانڈ ختم ہونے پر مجھے سنٹرل جیل اڈیالہ، راولپنڈی منتقل کر دیا گیا۔ جب مجھے جیل بھیجا جا رہا تھا تو میرے گھر والوں کی آنکھوں میں اُداسی تھی مگر انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ مجھے نیب تھانے میں کس اذیت سے گزرنا پڑا ہے۔جیل جاتے ہوئے میرے ہمراہ جیل بس میں سابق ایم پی اے چوہدری تنویر خان تھے۔انہوں نے مجھے دورانِ سفر جیل کی بہت سی باتوں سے آگاہ کیا۔جیل پہنچنے پر مجھے چوہدری تنویر اور سابق وفاقی وزیر نوید قمر نے اے کلاس میں الگ کمرہ دلوادیا۔

میں نے صبح اٹھتے ہی کچھ رقم اپنے کمرے کی مرمت کے لیے جیل کے عملے کو دے دی۔ جب اے کلاس کے ساتھیوں نے کمرے کی مرمت ہوتے ہوئے دیکھی تو انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا آپ زیادہ دِنوں کے لیے جیل آئے ہیں؟ میں نے کہا کہ مجھے حکومت دو سال کے لیے جیل میں رکھنا چاہتی ہے، عام انتخابات کے بعد رہا کر دے گی۔ بہرحال نیب تھانے کے بعد جیل کی زندگی نسبتاً مجھے کچھ سکون کا احساس دلا رہی تھی۔ایک طرف سابق سپیکر قومی اسمبلی کو نوے دن کے لیے نیب تھانے اور بعد میں سنٹرل جیل میں رکھا گیا اور دوسری طرف ایڈمرل منصور الحق کو 'سہالہ ریسٹ ہاؤس' اسلام آباد میں ٹھہرایا گیا، اس تفریق پر کبھی کبھار دکھ ہوتا تھا۔

دورانِ اسیری پہلی رات ڈیوٹی پر مامور اہلکار نے مجھ سے دریافت کیا کہ آپ کس جرم میں یہاں آئے ہیں؟ میں نے کہا کہ نوکریاں دینے کے الزام میں۔وہ خاموشی سے واپس چلا گیا۔صبح سویرے جب وہ دوبارہ آیا تو اپنے میٹرک پاس بیٹے کی ملازمت کے لیے درخواست ہمراہ لایا کہ اُسے بھی نوکری دلوادیں۔میں نے اپنے ایک دوست کے نام خط لکھا اور اُس میں یہ شعر بھی لکھا:

ہم دوہری اذیت کے ہیں سوار مسافر ؎

پاؤں ہیں شل

چلا بھی نہیں جاتا

مگر شوقِ سفر بھی نہیں جاتا

جیل کے ملازم نے چند دِن بعد مجھے مطلع کیا کہ اُس کے بیٹے کو نوکری مل گئی ہے۔ مجھے مسرت ہوئی اور میں نے سوچا کہ یہ واحد نوکری ہوگی جس پر میرے خلاف نیب ریفرنس نہیں بن سکے گا۔

جب میں جیل منتقل ہوا اُس وقت اے کلاس میں میرے ساتھ سابق وفاقی وزیرِ خزانہ نوید قمر، سابق ڈپٹی سپیکر قومی اسمبلی حاجی نواز کھوکھر، سابق ایم این اے و میئر فیصل آباد چوہدری شیر علی، سابق ایم پی اے چوہدری تنویر خان، سابق چیئرمین احتساب بیورو سیف الرحمٰن، سابق میئر فیصل آباد عامر شیر علی، سابق پرنسپل سیکرٹری برائے وزیراعظم نوازشریف سعید مہدی، ائر مارشل (ر) وقار عظیم، سابق آئی بی چیف بریگیڈیر (ر) امتیاز، سابق چیئرمین سی ڈی اے شفیع سہوانی، سابق چیئرمین پاکستان کرکٹ کنٹرول بورڈ مجیب الرحمٰن، ایڈیشنل سیکرٹری کمیونیکیشن (پی ٹی سی ایل*) خالد حبیب، ایڈیشنل سیکرٹری مواصلات (ہائی ویز) صادق سواتی، صدر انڈس بینک سیّد خورشید سہیل، اعزازی کونسلر جنرل موریشس شاہد سیٹھی، کلکٹر کسٹمز مظہر انوار نورانی، ڈی آئی جی گلگت مظفر حسین، اعتزاز نیازی، خواجہ عدنان، نصرت عظیم، سجاد عظیم اور شوکت عظیم بھی شامل تھے۔

میرے جیل کے ساتھیوں میں نوید قمر اور چوہدری تنویر نے میرا بہت خیال رکھا۔ نوید قمر میرے کمپیوٹر کے انسٹرکٹر بھی رہے۔ اُن کے جانے کے بعد اعتزاز نیازی نے میرے کمپیوٹر انسٹرکٹر کا کردار ادا کرنے کے علاوہ میرا دفتری کام بھی سنبھالا۔ اعتزاز نیازی نسان اور شیورلیٹ کمپنی اسلام آباد کے ڈیلر ہونے کے علاوہ تحریکِ انصاف اسلام آباد کے صدر بھی رہے ہیں۔ بریگیڈیر (ر) امتیاز تمام اسیران کی قانونی امداد کرتے رہے۔ انہوں نے مجھے بھی میرے نیب ریفرنس کی تیاری کروائی۔ ہم باجماعت نماز ادا کرتے رہے۔ امامت کا فریضہ چوہدری شیر علی، عامر شیر علی، مجیب الرحمٰن، چوہدری تنویر خان اور مظہر انوار نورانی ادا کرتے رہے۔

* Pakistan Telecommunication Limited

بارش میں بھیگنا میرا بچپن کا شوق ہے۔ سنٹرل جیل اڈیالہ، راولپنڈی میں پہلی مرتبہ موسلا دھار بارش میں نہ جانے کیوں بچپن کی یادیں لوٹ آئیں اور میں ائر مارشل (ر) وقار عظیم کے ساتھ بارش سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ دوسری مرتبہ اسیری کے دوران کرنل (ر) عمر چوہدری، سردار احمد رضا، ملک عامر، میجر (ر) مشہود لودھی، سیّد انور شاہ، مظہر انوار نورانی اور محمد حسین چوہدری کے اصرار پر میں نے بارش میں کچھ دیر چہل قدمی کی اور ہم محظوظ ہوئے۔

ایک صبح ہم ٹیلی ویژن کے سامنے موجود تھے کہ بریکنگ نیوز نشر کی گئی کہ امریکہ کے شہر نیویارک کے ٹوئن ٹاورز (ورلڈ ٹریڈ سنٹر) پر حملہ ہو گیا ہے۔ مجھے انہی دنوں عدالت کی طرف سے ڈش انٹینا کی اجازت ملی تھی، لہٰذا ہم نے اس واقعہ کی تفصیل غیر ملکی چینل پر دیکھی۔ 9/11 انسانی تاریخ کا سب سے بڑا دہشت گرد حملہ ثابت ہوا۔ اس حملے کی وجہ سے دنیا میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ حملہ تو امریکہ میں ہوا مگر ملبہ تمام اسلامی دنیا اور خصوصاً افغانستان اور عراق پر گرا۔ اس حملے سے قبل جنرل مشرف کی دنیا میں پہچان نہیں تھی مگر اس کے بعد انہیں نئی پہچان ملی۔

اُسامہ بن لادن اور ملا عمر کی تلاش کے لیے افغانستان پر حملہ پہلے ہی سے طے شدہ تھا۔ پاکستان نے اپنی خارجہ پالیسی یکسر تبدیل کر دی۔ نئی پالیسی کی بدولت طالبان کی حکومت ختم ہو گئی۔ امریکہ افغانستان پر مسلّط ہو گیا۔ افغانستان میں جمہوریت بحال کروانے کے لیے امریکہ نے وہاں انتخابات کروائے ہیں۔ تاہم فی الوقت امریکہ اپنے اتحادی ملک پاکستان میں فوجی حکومت پر جمہوریت کے لیئے صحیح معنوں میں دباؤ اس لیے نہیں ڈال رہا کیونکہ اُسے پاکستانی فوج کی ابھی ضرورت ہے۔

مجھے اسیری کے دوران ایک روز سیف الرحمٰن نے کہا کہ میں نے سپرنٹنڈنٹ جیل چوہدری افضل گجر سے کہہ دیا ہے کہ یوسف رضا اور ہم ایک ہیں کیونکہ انتظامیہ ہماری نا اتفاقی کی وجہ سے ہمارے لیے مسائل پیدا کر رہی تھی۔ سب نے سیف الرحمٰن کی اس تجویز سے اتفاق کیا۔ سیف الرحمٰن نے ہوم ڈیپارٹمنٹ کو شکایت کی کہ سپرنٹنڈنٹ اے کلاس کے دورے پر نہیں آتا۔ انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ جیل کا اُفسر جتنا دور رہے اُتنا ہی بہتر ہے۔ ان کی شکایت پر ایک دن صبح سویرے سپرنٹنڈنٹ اے کلاس کے دورے پر آ گیا۔ اَب صرف اسیران ہی کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کی جیل میں کیا طاقت ہوتی ہے۔ جب وہ بھرپور پروٹوکول کے ساتھ اے کلاس پہنچا تو سامراجی

دور کی یاد دلا رہا تھا۔ اُس موقعہ پر صرف میں ہی تنہا بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا اور باقی سب گہری نیند سو رہے تھے۔ مجھے علم نہیں تھا کہ جب سپرنٹنڈنٹ دورے پر آتا ہے تو تمام اسیران کو حاضر رہنا پڑتا ہے۔ انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملانے کے بعد اپنے عملے کو تحکمانہ انداز میں کہا کہ باقی سب اسیران کو یہاں لے آئیں۔ سب کو ایک ایک کر کے لایا گیا۔ سیف الرحمٰن نے سپرنٹنڈنٹ سے فاتحانہ انداز میں کہا کہ آخر ہم نے آپ کو بلوا ہی لیا ہے، آپ خود تو نہیں آنا چاہتے تھے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہمارے کئی مسائل ہوتے ہیں اگر آپ کا باقاعدگی سے اے کلاس کا دورہ ہوتا رہے تو ان مسائل پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ خاموش رہے اور وہاں سے چلے گئے۔ چند ہفتوں بعد سیف الرحمٰن نے دوبارہ ہوم ڈیپارٹمنٹ سے شکایت کر دی۔ سپرنٹنڈنٹ دوبارہ دورے پر آ گیا۔ حسبِ معمول سب سوئے ہوئے تھے اور میں عدالت گیا ہوا تھا، اُس نے غصے میں قریبی سیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کا سامان سی کلاس میں منتقل کر دیں۔ اُس سیل میں ائر مارشل وقار عظیم کے بڑے بھائی نصرت عظیم پابندِ سلاسل تھے۔ اس دوران مشقتی* پرویز نے بھاگ کر چوہدری تنویر جنہیں میں اُن کے جاہ و جلال کی وجہ سے ٹھاگر کہتا تھا، کو جگا کر اس حکم کی اطلاع دی۔ چوہدری صاحب مقامی ہونے کے ناطے خاصے بااثر تھے۔ وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آئے اور کہا کہ کون ہے جس نے اس طرح کا حکم دیا ہے؟ سپرنٹنڈنٹ دوہری اذیت میں مبتلا تھا، ایک تو وہ یہاں آنا نہیں چاہتا تھا اور دوسرا اپنے ساتھ اس قسم کے ناروا سلوک کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ وہ غصے میں واپس چلا گیا۔

اُن دنوں اے کلاس کے اسیران کے تعلقات جیل کے عملے سے کشیدہ تھے۔ فیصل آباد کے سابق میئر چوہدری شیر علی نہایت تجربہ کار شخص ہیں، وہ آنے والے وقت کی مشکلات بھانپ گئے۔ وہ ایک دن میرے سیل* میں آئے اور کہا کہ ہم آئے دن کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتے، اب آپ میری ذمہ داری پر سپرنٹنڈنٹ جیل سے ملیں اور کہیں کہ وہ سیف الرحمٰن کی بات کا بُرا نہ منائیں، آپ بھلے اے کلاس میں نہ آئیں، اگر ہمیں کوئی مسئلہ ہوا تو ہم آپ سے اَز خود رابطہ کر لیں گے۔ سپرنٹنڈنٹ جیل کے بڑے بھائی چوہدری ریاست سے میرے اچھے تعلقات تھے۔ وہ

---

* ایسے سزا یافتہ قیدی جو کام کے لیے B,A کلاس کے اسیران کو دیے جاتے ہیں۔
* جیل میں رہائش کے لیے دیا گیا کمرہ جسے جیل میں چکی کہتے ہیں۔

صادق آباد میں تحصیلدار رہ چکے تھے، وہ ایک دن اچانک میری ملاقات کے لیے آ گئے۔ اس دن کے بعد جیل انتظامیہ اور عملے کا رویّہ پہلے سے کہیں بہتر ہو گیا اور اس کا احساس سیف الرحمٰن کو بھی ہو گیا کہ اُفسر جتنا دور رہے اتنا ہی بہتر ہے۔

میں اکثر سیف الرحمٰن کے ساتھ شام کو واک کرتا تھا۔ ہم باقاعدگی سے ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر بی بی سی کی خبریں سنتے تھے اور خصوصاً سیف الرحمٰن موسم کی خبریں سننے کے لیے بے تاب رہتے تھے۔ اگر کسی مصروفیت کے باعث وہ خبریں نہ سن پاتے تو ناراض ہو جاتے کہ آپ میں سے کسی نے موسم کی خبریں کیوں نہیں سنیں۔ درحقیقت وہ سخت گرمی سے گھبراتے اور آئے دن بارش کی توقع کرتے تھے۔

ایک دِن اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل چوہدری ایوب حسبِ معمول اے کلاس آ گیا۔ وہ اس جیل میں سب سے طویل عرصہ گزارنے والا اُفسر تھا، اُسے جیل قوانین اَزبر تھے۔ اسے جتنا طویل عرصہ یہاں ہوا تھا اتنی ہی اس کی شکایات بھی تھیں۔ جب بھی اس کا کسی شکایت پر تبادلہ ہوا کسی نادیدہ قوت نے رکوا دیا لیکن اَب بحکم عدالتِ عظمیٰ اُس کا تبادلہ ہوئے عرصہ گزر گیا ہے۔ میں نے اُسے چائے کی پیشکش کی۔ سیف الرحمٰن حسبِ عادت تیز تیز واک کر رہے تھے مگر ان کا دھیان ہماری طرف تھا۔ وہ چوہدری ایوب کو پسند نہیں کرتے تھے۔ چوہدری ایوب مجھ سے اَزراہِ مذاق کہہ رہا تھا کہ گیلانی صاحب! جب آپ دوبارہ اقتدار میں آئیں تو مجھے اپنا پرائیویٹ سیکرٹری رکھیں، میری خاصیت ہے کہ کسی کا کام بھی نہیں ہوگا اور کوئی ناراض بھی نہیں ہوگا۔ یہ بات سنتے ہی سیف الرحمٰن سیخ پا ہو گئے اور واک چھوڑ دی۔ وہ سیدھا میرے پاس آئے اور کہا کہ یہ بہت بُرا آدمی ہے اس کو اپنا پرائیویٹ سیکرٹری نہیں بنانا۔ میں حیران تھا کہ ابھی تو ہم جیل میں ہیں جہاں عملے کے تعاون کے بغیر ایک دن بھی نہیں گزر سکتا مگر سیف الرحمٰن تھے کہ جب تک انہوں نے مجھ سے وعدہ نہ لے لیا کہ چوہدری ایوب کو اپنا پرائیویٹ سیکرٹری نہیں بنانا۔ اس وقت تک انہوں نے دوبارہ واک شروع نہیں کی۔

احتساب عدالت نے مجھے اپنا طبّی معائنہ کروانے کی اجازت دے دی، لہٰذا میں نے پمز * ہسپتال میں ڈاکٹر اقبال سیف اللہ سے اپنا معائنہ کروایا۔ مجھے ہاتھوں کے سُن ہونے کی

* Pakistan Institute of Medical Sciences (PIMS)

تکلیف تقریباً دو سال رہی اور اَب بھی کبھی کبھار ہو جاتی ہے۔ جیل میں قید کے دوران خوش قسمت اسیران وہ تصور ہوتے ہیں جن کی بیماری کی توثیق جیل کا ڈاکٹر کرتا ہے جس پر سب انہیں مبارک دیتے ہیں۔ انہیں بیرونِ جیل، ہسپتال منتقل کر دیا جاتا ہے یا معائنہ کے لیے لے جایا جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں وہ اپنے عزیز و اقارب سے ملاقات کر سکتے ہیں۔ مجھے بھی دورانِ سماعت احتساب عدالت نے ہفتے میں ایک مرتبہ ہسپتال جانے کی اجازت دی۔ مجھے پہلے پمز اور بعد میں این آئی ایچ * ہسپتال میں فیزیوتھراپی کے لیے لے جایا جاتا رہا لیکن 18 ستمبر 2004ء کے بعد میں بیرونِ جیل ہسپتال نہیں گیا۔ شاید میں واحد سیاسی اسیر ہوں گا جو باوجود ضرورت کے اپنے طبی معائنے کے لیے بیرونِ جیل ہسپتال نہ گیا ہو۔

دورانِ اسیری میری والدہ مجھے ملنے کے لیے پہلی مرتبہ این آئی ایچ ہسپتال آئیں۔ میں نے اُن سے ملاقات کے لیے ایک صاف ستھرے کمرے کا انتظام کروایا تاکہ اُن پر جیل کا تاثر نہ پڑے۔ میرے جیل کے ساتھی چوہدری تنویر نے وہاں میرے اور میری والدہ کے لیے کھانے کا اہتمام کیا۔ والدہ جیسے ہی مجھ سے ملیں تو دریافت کیا کہ کیا تم یہیں رہتے ہو؟ میں نے کہا کہ جی ہاں۔ وہ خوش ہوئیں اور کہنے لگیں کہ یہ کمرہ تو صاف ستھرا ہے، میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گی۔ والدہ نہایت ہی سادہ طبیعت کی مالک تھیں۔ میں نے اُنہیں تسلی دینے کے لیے تاکہ وہ دلبرداشتہ نہ ہوں کہا کہ مجھے جنرل مشرف نواز شریف کی طرح ملک سے باہر بھیجنا چاہتے ہیں، اب آپ ہی بتائیں کیا میں ملک سے باہر جاؤں یا اسی کمرے (جیل) میں رہوں؟ انہوں نے کہا کہ میں ضعیف ہونے کے سبب اتنا طویل سفر نہیں کر سکتی، تم نواز شریف کی طرح ملک سے باہر نہ جاؤ، بہتر ہے اسی کمرے میں رہو، کم از کم میں تم سے ملنے تو آ سکوں گی۔

جب ہم جیل بس میں سوار ہو کر ہسپتال میں اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ چند گھنٹے گزارتے تو وہ لمحے تپتے صحرا میں خوشگوار ہوا کا جھونکا معلوم ہوتے تھے۔

اے کلاس کے اسیران نے آپس میں چندہ جمع کر کے جیل بس کی سیٹیں، انجن، کھڑکیاں، دروازے، شیشے اور ٹوٹے ہوئے فرش کی مرمت کروائی۔ ہمیں جیل سے ہسپتال یا عدالت جاتے ہوئے یہ بس رولز رائیس کار سے بہتر لگتی تھی۔

* National Institute for Handicaps (NIH)

دورانِ اسیری میں نے جیل کی فراغت کو مصروفیت میں بدل ڈالا۔ میں صبح اخبارات کا مطالعہ کرتا اور قرآن شریف پڑھتا تھا۔ مجھے شوق پیدا ہوا کہ اپنی یادداشتیں لکھوں۔ اس طرح میری مصروفیت اور بھی بڑھ گئی۔ میں شام کو بیڈمنٹن کھیلتا اور واک کیا کرتا تھا۔ ہاتھ سُن ہونے کی وجہ سے بیڈمنٹن چھوڑ کر صرف واک پر ہی اکتفا کیا۔ جیل میں اعتزاز نیازی سے میری بے حد دوستی تھی۔ وہ حساس طبیعت کے مالک ہیں، چھوٹی چھوٹی باتوں سے چڑ جاتے تھے۔ وہ مشقتیوں سے پیار تو کرتے تھے مگر انہیں ڈانٹنے سے بھی پرہیز نہیں کرتے تھے۔ ہمیں اُن کی ناپسندیدہ بات یہ لگتی تھی کہ وہ غصے کی حالت میں محفل سے اکثر واک آؤٹ کر جاتے تھے۔ ایک مرتبہ رات کے کھانے کے وقت اُن کا چوہدری شیر علی سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ وہ حسبِ عادت واک آؤٹ کرنے ہی والے تھے کہ چوہدری صاحب نے اپنی بے عزتی محسوس کرتے ہوئے کھانے سے بھری پلیٹ اُن کے اوپر پھینک دی جس کی وجہ سے اُن کے کپڑے خراب ہو گئے۔ انہوں نے ایک اور موقعہ پر سحری کے وقت کھانے میں نمک زیادہ ہونے کی وجہ سے مشقتی کو بہت ڈانٹا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں نے کوئی بات کی تو وہ ضرور واک آؤٹ کریں گے۔ میں نے مشقتی کو ڈانٹنے پر انہیں قصوروار ٹھہرایا تو وہ حسبِ معمول واک آؤٹ کر گئے اور ساتھ ہی مجھ سے روٹھ بھی گئے۔ میں نے پہلی مرتبہ انہیں نہ منایا۔ بالآخر میرے جیل کے ساتھی شاہد سیٹھی انہیں میرے کمرے میں لے آئے اور وعدہ کیا کہ وہ آئندہ کسی مشقتی کو نہیں ڈانٹیں گے۔ چند دنوں بعد اعتزاز نیازی ضمانت پر رہا ہو گئے۔ رہائی کے بعد میری اُن سے احتساب عدالت میں ملاقات ہوئی۔ میں نے اُن سے دریافت کیا کہ آپ نے روزہ رکھا ہے کہ نہیں؟ انہوں نے کہا کہ مجھے کسی نے جگایا ہی نہیں، اس لیے میں نے سحری کھائے بغیر روزہ رکھا ہے۔ میں نے مسکرا کر کہا کہ جیل میں تو آپ زیادہ نمک بھی برداشت نہیں کرتے تھے اور یہاں بھوک برداشت کر رہے ہیں۔ اس بات پر ہم دونوں بہت محظوظ ہوئے۔ وہ آج بھی میرے قریبی دوست ہیں اور میں ان کے مخلص ہونے کی وجہ سے دل سے اُن کی قدر کرتا ہوں۔

سابق ڈپٹی سپیکر قومی اسمبلی نواز کھوکھر نے اظہر محمود کو اے کلاس میں اپنا الگ مشقتی رکھا ہوا تھا۔ جب مجھے سنٹرل جیل اڈیالہ، راولپنڈی منتقل کیا گیا تو اس وقت ائر مارشل (ر) وقار عظیم ساتھی اسیران کی طرف سے اے کلاس کے میس انچارج تھے۔ انہوں نے اپنے پسندیدہ مشقتی

امجد کو میری ڈیوٹی پر مامور کر دیا۔ امجد میرے علاوہ نوید قمر کے ساتھ بھی ڈیوٹی کرتا تھا۔ اے کلاس میں جتنے بھی اسیران تھے اُنہیں صبح دیر تک سونے کی عادت تھی اور تمام مشقتی بھی اپنے آپ کو ان کے مطابق ڈھال چکے تھے۔ میرے صبح جلد اُٹھنے کی عادت کے باعث امجد اپنی ڈیوٹی صحیح معنوں میں ادا نہیں کر رہا تھا۔ میں نے مشقتی اظہر محمود سے کہا کہ وہ میری بھی ڈیوٹی دے۔ میں نے اس سلسلے میں نواز کھوکھر سے اجازت بھی لے لی۔ انہوں نے اس وعدے پر اجازت دی کہ اظہر محمود صرف آپ ہی کا کام کرے گا اور آپ اُس کا خیال رکھیں گے۔ دوسرے ہی روز نواز کھوکھر کی ضمانت ہوگئی۔ اس کے بعد اظہر محمود میرے ساتھ مستقل طور پر ڈیوٹی انجام دینے لگا۔

اے کلاس کے مشقتیوں میں گروپنگ تھی، انہوں نے اظہر محمود کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ انہوں نے کچھ رقم دے کر جھوٹی طبی رپورٹ تیار کروائی کہ اُسے تپ دق (ٹی بی) ہے۔ مجھے اے کلاس کے اسیران نے کہا کہ ہم ٹی بی کے مریض کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔ میں نے اس میڈیکل رپورٹ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اُس کا طبی معائنہ ایک اور ڈاکٹر سے کروایا گیا تو معلوم ہوا کہ اُسے ٹی بی نہیں ہے مگر اس کے باوجود اُسے کچن کے کام سے روک دیا گیا۔ میں نے اسے اپنی ڈیوٹی پر رکھ لیا اور یوں نواز کھوکھر سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ جس دن میری ضمانت ہوئی اسی روز اظہر محمود کی بھی ضمانت ہوگئی۔

طویل عرصہ پابندِ سلاسل رہنے کی بنا پر مجھے جیلوں کے حالات بہت قریب سے دیکھنے اور جاننے کا موقعہ ملا ہے۔ بنیادی طور پر جیلوں کا ماحول معاشرے میں برائی پھیلانے والے افراد کے لیے 'اصلاح' کا ہونا چاہیے مگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہے۔ جیل کرپشن میں بدنام چند محکموں میں سے ایک ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے انتظامیہ کے کردار کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ جیل میں پولیس کی بھرتی کے بعد کوئی تربیت نہیں کی جاتی۔ اس کے علاوہ عام پولیس کے مقابلے میں جیل پولیس کی مراعات نہ صرف کم ہیں بلکہ دونوں اداروں میں تنخواہ کا بھی واضح فرق ہے مثلاً جیل پولیس کا انسپکٹر پے سکیل چودہ اور عام پولیس انسپکٹر پے سکیل سولہ میں بھرتی کیا جاتا ہے۔ جیل پولیس کو بعد از بھرتی نہ تو محکمانہ ترقی کے لیے کورسز کروائے جاتے ہیں اور نہ ہی اُن کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی مثبت قدم اٹھایا جاتا ہے۔ اُن کی تعداد اسیران کی تعداد سے مطابقت نہیں رکھتی جس پر توجہ دی جانی ضروری ہے۔ جیلوں میں ہر رنگ و نسل کے لوگ موجود ہیں جن کی معاشرتی قدریں،

مذہبی رجحانات، ذہنی سطح اور سوچ کے انداز مختلف ہیں۔ جیل کا ماحول، اپنوں سے دوری، معاشی پریشانیاں، مقدمے کی فکر اور سزا کا خوف اُن کے رویّوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ساتھ ہی عملے کا ناروا سلوک مزید مسائل کا باعث بنتا ہے۔ جیلوں میں بڑا مسئلہ گنجائش سے زیادہ اسیران کو رکھے جانے کا ہے جس کی وجہ جیلوں کی تعداد میں کمی، معاشرتی ناہمواری، مقامی سطح پر پنچایتی نظام کی کمی، مقدمات کی بھرمار اور عدالتی معاملات میں تاخیر ہے۔ عادی اور بڑے جرائم میں ملوث افراد کے ساتھ چھوٹے جرائم کے اسیران قید کر دیئے جاتے ہیں جس سے ان کی جرائم کی دنیا میں پہچان بڑھ جاتی ہے اور وہ جیل سے رہا ہو کر معاشرے میں مزید برائی پھیلانے کا باعث بنتے ہیں۔ جیل میں ناقص خوراک کی فراہمی دوسرا بڑا مسئلہ ہے۔ اگر کھانے کا معیار بہتر ہو جائے تو یہاں پھیلنے والی بیماریوں پر کسی حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔ الرجی، ٹی بی اور ہیپاٹائٹس کی بیماریاں یہاں عام ہیں۔ جیل ہسپتالوں میں اسیران کی تعداد کے مطابق بیڈز کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ڈاکٹروں کی تعداد مریضوں کے تناسب سے عالمی معیار کے مطابق نہیں ہوتی۔ غیر معیاری ادویات بیماریوں میں مزید اضافے کا موجب بنتی ہیں۔ نرسنگ سٹاف کی جگہ غیر تربیت یافتہ قیدیوں سے کام لیا جاتا ہے جو اپنی لاعلمی اور ناتجربہ کاری کے باعث مریضوں کو لقمۂ اجل بنا رہے ہیں۔ خواتین اسیران کے لیے لیڈی ڈاکٹر نہیں ہوتی۔ اسیران کو علاج کے لیے بیرونِ جیل ہسپتال جانے کی ضرورت ہو تو عدالت یا ہوم ڈیپارٹمنٹ سے رجوع کرنا پڑتا ہے جس کا طریقۂ کار اس قدر طویل اور مشکل ہے کہ مریض قریب المرگ ہو جاتے ہیں۔ سزائے موت کے قیدیوں کو اُن کی اپیل کا حق ہونے کے باوجود سزا کے پہلے دِن سے سزائے موت سیل میں منتقل کر دیا جاتا ہے جو نہایت ناانصافی ہے۔

جیلوں میں اصلاحات کی سخت ضرورت ہے اور اسیران کی بہبود کے لیے تعلیمی ماحول کی بہتری، صحت مندانہ سرگرمیوں کے فروغ، ملاقات کے درست اور سہل نظام کی فراہمی، ضروریاتِ زندگی کی خرید کے لیے جیل کے اندر ڈیپارٹمینٹل سٹور، پی سی او کی تنصیب اور قانونی امداد کی فراہمی جیسے اقدامات کرنا ضروری ہیں۔ صوبہ سرحد میں شادی شدہ قیدیوں کے لیے تنہائی میں اپنی فیملی سے ملاقات کی اجازت دے دی گئی ہے اور اَب دوسرے صوبوں میں بھی اس کے لیے سفارشات کی جا رہی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ طریقہ باعثِ تذلیل ہوگا کیونکہ ہماری معاشرتی قدریں اس بات کی اجازت نہیں دیتیں۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ فیملی کو جیل کی حدود میں بلانے کی بجائے شادی شدہ

قیدیوں کو ہر تین ماہ بعد چند دِن کے لیے پیرول پر رہا کیا جائے تا کہ وہ اپنی فیملی سے آزادانہ اور باعزت طریقے سے ملاقات کر سکیں۔ جیلیں صرف قیدیوں کے لیے ہونی چاہئیں اور جن قیدیوں کے مقدمات زیرِ سماعت ہیں اُنہیں عدالتی نظام آسان بنا کر فوری ضمانت پر رہا کیا جائے جیسے دوسرے ملکوں میں کیا جاتا ہے۔ سیاسی جماعتوں کو جیل اصلاحات کا پروگرام اپنے منشور کا حصہ بنانا چاہیے۔

میں نے اپنی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے عام زندگی میں بہت کم فلمیں اپنی فیملی کے ساتھ دیکھی ہوں گی جب ضمانت پر رہا ہوا تو سیاسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ میں نے اپنی فیملی کو بھی وقت دیا اس دوران کچھ انگریزی اور اردو فلمیں دیکھیں۔ مجھے ایشوریا رائے اور جولیا رابرٹس کی فلمیں بہت پسند آئیں۔

میں ذوالفقار علی بھٹو کی برسی اور پیپلز پارٹی کی CEC کی میٹنگ میں شرکت کے لیے لاڑکانہ گیا۔ مجھے رات گئے ڈیوٹی پر مامور چوکیدار نے جگا کر فون دیا اور کہا کہ آپ سے آپ کی اہلیہ کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہیں۔ میں پریشان ہو گیا مگر میرے استفسار پر میری اہلیہ نے بتایا کہ آج خبروں میں آیا ہے کہ شوٹنگ کے دوران ایشوریا رائے کی ٹانگ زخمی ہو گئی ہے۔ ہم نے سوچا کہ آپ سے افسوس کر لیں۔

میری گرفتاری سے قبل میری بیٹی فضہ کی شادی ہو چکی تھی اور میرا بڑا بیٹا سیّد عبدالقادر او لیولز کے بعد بیلا بیز کالج کیمرج، برطانیہ سے فاؤنڈیشن کورس ان لا اینڈ پولیٹکس کر رہا تھا۔ تینوں جڑواں بیٹے حیدر، قاسم اور موسیٰ، بیکن ہاؤس ڈیفنس (برانچ) لاہور میں ساتویں جماعت میں زیرِ تعلیم تھے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ حال ہی میں بڑے بیٹے سیّد عبدالقادر نے ہارٹفورٹ شائر یونیورسٹی، برطانیہ سے ایل ایل بی (آنرز) کا امتحان پاس کر لیا ہے اور باقی تینوں جڑواں بیٹے اے لیولز کر رہے ہیں۔

میرے چھوٹے بھائی سیّد احمد مجتبیٰ نے بی اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنی عملی زندگی کی ابتداء ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت سے کی۔ انہوں نے والد کی وفات کے بعد ملازمت سے استعفیٰ دے دیا مگر 1988ء میں کاٹن ایکسپورٹ کارپوریشن میں ملازمت اختیار کر

لی۔ میں نے انہیں 1991ء میں ملازمت سے دوبارہ استعفیٰ دِلوا کر ضلع کونسل، ملتان کا انتخاب لڑوایا جس میں وہ کامیاب ہو گئے۔ 1993ء کے انتخابات کے بعد وزیرِ اعظم بینظیر بھٹو نے انہیں چیئر مین سوشل ایکشن بورڈ، ملتان نامزد کر دیا جس میں پیپلز پارٹی ملتان شہر کی تنظیم کے علاوہ سابق وفاقی وزیر ملک مختار احمد اعوان اور سابق ایم این اے پیر ریاض حسین قریشی جو بعد میں ناظمِ اعلیٰ ملتان بھی منتخب ہوئے، جیسے تجربہ کار سیاستدان بھی بطور رکن شامل تھے۔ پیپلز پارٹی کی طرف سے صوبائی اسمبلی کی نشست کے لیے انہیں ٹکٹ بھی دیا گیا لیکن وہ رضا کارانہ طور پر پی پی کے حاجی اختر بھُٹہ کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ جب میں 2002ء میں سنٹرل جیل اڈیالہ، راولپنڈی میں اسیری کے دن کاٹ رہا تھا، اُس وقت وہ ناظم تحصیل صدر، ملتان منتخب ہو گئے۔ انہوں نے محترمہ کی ہدایت پر صدارتی ریفرنڈم کی مخالفت کی۔ انہوں نے تحصیل ناظم کے عہدے سے مستعفی ہو کر قومی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لیا۔ اُن کی کامیابی یقینی تھی مگر حکومتی ہتھکنڈوں کے سبب انہیں چند سو ووٹوں سے ہروا دیا گیا۔ میں طویل عرصہ اقتدار میں رہا ہوں اور اب کئی برسوں سے جیل کی صعوبتیں برداشت کر رہا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ میری سیاست کی کامیابی میرے بھائی کی علاقے میں موجودگی کی وجہ سے ہے۔

دونوں بڑی سیاسی جماعتوں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ نے ایک دوسرے کے رہنماؤں کے خلاف بدعنوانی کی فائلیں تیار کیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو نیب کو اُن رہنماؤں کے خلاف قدم اٹھانے کا جواز نہ ملتا۔ اس لیے سیاسی جماعتوں کو آئندہ ایسے اقدامات سے گریز کرنا چاہیے۔ ایک اسی قسم کی فائل میرے خلاف تیار کی گئی جو پہلے ایف آئی اے اور بعد میں احتساب سیل کو بھیجی گئی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ درخواست گزار اس درخواست پر دستخط بھی نہیں کیے تھے لیکن اس کے باوجود موجودہ نیب نے درخواست منظور کر لی۔ اس درخواست میں مجھ پر پہلا الزام ٹیلی فون کے غلط استعمال کا تھا حالانکہ میں واحد سپیکر تھا جس نے محکمے کو خط لکھا کہ میرے ایک ٹیلی فون پر کوڈ بار اور دوسرے کو نان ایس ٹی ڈی کر دیا جائے جبکہ سپیکر کے ٹیلی فون کے استعمال پر کوئی سیلنگ مقرر نہیں تھی، ویسے بھی سیکرٹری قومی اسمبلی ٹیلی فون کی منظوری اور بل کی اَدائیگی کا مجاز اتھارٹی ہوتا ہے اور اس کے علاوہ قومی اسمبلی نے سپیکر آفس کے ٹیلی فون کے تمام بل بک ڈیبٹ (book debt) کے ذریعے دوسرے محکمے کو ادا کیے۔ قانون کے مطابق سپیکر جہاں زیادہ وقت

رہائش رکھتا ہے اُسے وہاں ٹیلی فون مہیا کیا جاتا ہے۔ مجھے احتساب عدالت نے بھی اس الزام سے بری الذمہ قرار دے دیا جس پر سابق چیئرمین سینٹ وسیم سجاد نے صدر مشرف کو خط لکھا کہ احتساب عدالت نے یوسف رضا کو ٹیلی فون کے الزام سے بری الذمہ قرار دیا ہے، لہٰذا میرے ٹیلی فون کا بل معاف کر دیا جائے۔ جسے صدر نے منظور کر لیا۔ آج وہ سینٹ میں قائدِ ایوان ہیں۔

دوسرا الزام سرکاری کاروں کی خریداری، مرمت اور اُن کے استعمال کا تھا حالانکہ سپیکر کی مراعات کے مطابق سپیکر اور اُس کی فیملی جہاں بھی موجود ہوں اُنہیں اُن کی حیثیت کے مطابق سرکاری گاڑی مہیا کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ جس طرح ٹیلی فون کے استعمال پر سپیکر کے لیے کوئی حد مقرر نہیں، اُسی طرح پٹرول کے خرچ اور کار کی مرمت پر بھی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ کار کے استعمال، پٹرول اور مرمت کی منظوری دینا بھی سیکرٹری کے اختیارات میں تھا۔ نیب کی طرف سے میرے ساتھ ڈیوٹی کرنے والے ڈرائیوروں کو بطورِ استغاثہ گواہ میرے خلاف عدالت میں پیش کیا گیا لیکن اُن میں سے کسی ایک نے بھی کاروں کے غلط استعمال کی تصدیق نہ کی۔ یہ ڈرائیور آج بھی قومی اسمبلی میں ملازمت کر رہے ہیں۔ کاروں کی خریداری، پٹرول کے اخراجات اور مرمت کروانے میں سپیکر کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔ احتساب عدالت کے فیصلے میں بھی کہا گیا کہ کاروں کی خریداری میں سپیکر کا کوئی کردار نہیں تھا۔ جج نے فیصلہ دیتے ہوئے کہا کہ سپیکر کا صرف یہ جرم تھا کہ اُس نے اپنے ماتحت عملے پر نظر نہیں رکھی حالانکہ سیکرٹری قومی اسمبلی پرنسپل اکاؤنٹنگ آفیسر ہوتا ہے۔

تیسرا الزام 'کیمپ آفس' کے غلط استعمال کا تھا جس میں ایک ملتان اور دوسرا 'غازی علم الدین شہید ہوسٹل' اسلام آباد میں قائم کرنے کا تھا۔ حالانکہ ملتان کیمپ آفس کا کرایہ، بجلی، گیس، ٹیلی فون یا کسی قسم کا کوئی بل حکومت کے خزانے سے ادا نہیں ہوا تھا*۔

غازی علم الدین شہید ہوسٹل، اسلام آباد میں قواعد کے مطابق کیمپ آفس قائم کیا گیا اور قومی اسمبلی فنانس رولز (a)21 کے تحت منظوری دی گئی۔ انہی رولز کے مطابق جس چیز کے لیے کوئی رولز واضح نہ ہوں، انہیں ان رولز میں شامل کیا جا سکتا ہے جس کی منظوری سپیکر خود دیتا ہے۔

---

* مجھے سرکاری طور پر دی گئی رہائش گاہ میری entitlement (مراعات) سے کم تھی وہ رہائش گاہ گریڈ بیس کے افسر کی entitlement کے مطابق تھی اس لیے......

The National Assembly (Finance Committee)Rules 1973:

21(a)

> All matters, not specifically provided for in these rules, shall be regulated in accordance with the provisions for the time being in force and applicable to the Federal Secretariat subject to such modifications, variations or exceptions, if any, as the Speaker may, from time to time, by order, specify :Provided that where under the aforesaid provisions, administrative approval or concurrence of any Ministry, Division or other authority outside the Secretariat is required, such approval or, as the case may be, concurrence shall be accorded by the Speaker

1997ء میں اس مقدمے کے دائر ہونے کے بعد سپیکر الٰہی بخش سومرو بھی کیمپ آفس استعمال کر رہے تھے۔ انہوں نے سپیکر کی مراعات میں ترمیم کر کے کیمپ آفس کے استعمال کا حق سپیکر کو دے دیا جس سے میرے مؤقف کی تائید ہوئی۔ دیکھا جائے تو ملک میں صدرِ مملکت سمیت کتنے کیمپ آفس ہوں گے مگر سپیکر پر اس قسم کا الزام لگانا جمہوری روایات کے منافی ہے۔

بطورِ سابق سپیکر قومی اسمبلی سرکٹ ہاؤس، فیڈرل لاجز، ڈپلومیٹک پاسپورٹ اور مفت طبی سہولت آج بھی میری مراعات میں شامل ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ 'چمبہ ہاؤس' لاہور میں سپیکر کا رہائش رکھنا چارج شیٹ کا حصہ بھی نہ تھا اور استغاثہ کے گواہ نے بھی بیان دیا کہ سپیکر کے سرکاری دورے کے دوران 'چمبہ ہاؤس' میں کمرہ بُک کروایا گیا۔ مجھے پھر بھی اس الزام میں سزا سنائی گئی۔

؎ سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

میرے خلاف دوسرا ریفرنس قومی اسمبلی میں ملازمتیں فراہم کرنے کا تھا حالانکہ میں

نے ملازمتیں فراہم کرنے میں قومی اسمبلی کے رولز کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی۔ نیب کے دیگر مقدمات (ریفرنسوں) جن میں ملازمتیں فراہم کرنے کا الزام تھا، اُن میں انور سیف اللہ خان، ریاض فِتیانہ اور صدیق الفاروق کو بری کر دیا گیا اور انتخاب لڑنے کی اجازت بھی دے دی گئی۔ اس کے برعکس مجھے سزا دی گئی اور انتخاب میں بھی حصہ نہ لینے دیا گیا۔ اب ایک حالیہ فیصلے میں بے نظیر بھٹو اور ایم این اے ناہید خان کو بھی پاکستان انٹرنیشنل ائیر لائنز (PIA) میں ملازمتیں فراہم کرنے کے ریفرنس سے بری کر دیا گیا ہے جو میرے مئوقف کی تائید ہے۔ میرے خلاف جو ریفرنس بنایا گیا وہ اختیارات سے تجاوز کرنے کا ہے حالانکہ میں نے قومی اسمبلی کے رولز کی مکمل پاسداری کرتے ہوئے تمام قواعد وضواط، طریقۂ کار اور روایات کے مطابق کام کیا اور نوکریاں دیتے ہوئے جونیئر اہلکار سے لے کر سیکرٹری جنرل تک نے منظوری دی، کسی ایک بھی اَفسر نے اختلاف نہیں کیا۔ ویسے بھی گریڈ 1 تا 16 کی تقرری کے لیے مجاز اتھارٹی سیکرٹری خود ہوتا ہے۔ یہ 'جرم' (Misuse of authority) نیب کے ادارہ کی تشکیل 1999ء کے بعد آرڈیننس میں شامل کیا گیا مگر اس کا اطلاق سابقہ تاریخوں سے ہی کر دیا گیا جو کہ 1973ء کے آئین کی آرٹیکل (1-a)12 کے تحت بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ درخواست دہندہ جن کی درخواست پر میرے خلاف ریفرنس بنایا گیا انہیں بھی گواہ کے طور پر پیش نہ کیا گیا اور نہ ہی سیکرٹری قومی اسمبلی (پرنسپل اکاوَنٹنگ آفیسر) کو شریک ملزم بنایا گیا۔

نیب آرڈیننس کے تحت احتساب عدالتیں قائم کی گئیں جو نیب کی زیرِ نگرانی سیاستدانوں اور دوسرے ملزمان کے خلاف مقدمات کی سماعت کرتی ہیں۔ ہر مقدمے (ریفرنس) میں انفرادی طور پر حساس اداروں کی مدد سے مقدمہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اگر نیب مقدمہ ثابت کرنے پر آئے تو احتساب عدالت اس آرڈیننس کے تحت زیرِ دفعہ (c) 14 شک کا فائدہ استغاثہ (نیب) کو دے کر ملزم کو سزا سنا دیتی ہے جو شرع، اصول، اخلاق اور Cr.P.C کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہے۔ کسی قانون یا آرڈیننس کے بغیر خاص طور پر نیب تھانے بنائے گئے ہیں جو حساس اداروں کے زیرِ کنٹرول ہیں۔ نیب ملزمان کو نوے دن تک جسمانی ریمانڈ پر نیب تھانے میں رکھ کر اولین کوشش کی جاتی ہے کہ ملزمان کو اقبالِ جرم پر مجبور کیا جائے۔ اس کے لیے ملزمان کو ہر طرح سے زِچ کر کے زیادہ سے زیادہ 'رقم' وصول

کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ناکامی کی صورت میں بہت بھاری جرمانہ اور لمبی لمبی سزائیں دی جاتی ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق احتساب عدالتوں میں 80 سے 85 فیصد مقدمات میں سزائیں سنائی جاتی ہیں جبکہ اعلیٰ عدالتوں میں یہ تناسب 10 سے 15 فیصد رہ جاتا ہے جو احتساب عدالتوں پر نیب کے دباؤ کا واضح ثبوت ہے۔ یہ مثالیں بھی موجود ہیں کہ مقدمے میں الزام بہت کم ہے مگر جرمانہ کئی گنا زیادہ اور طویل سزائے قید الگ۔ دورانِ تفتیش وسماعت نیب ملزمان سے ایسا امتیازی سلوک کیا جاتا ہے جو بعد از سزا بھی جاری رہتا ہے کہ انہیں قاتل، اغواء برائے تاوان، سمگلر، ڈرگ مافیا، ڈاکو اور ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث مجرمان سے بھی سنگین مجرم تصور کیا جاتا ہے۔ دوسرے اسیران سزا کے بعد جیل قوانین کے مطابق جیل میں تعلیم حاصل کر کے فی کورس پندرہ دِن سے دو سال تک معافی (remissions)، قیدِ بامشقت کی صورت میں ہر ماہ مشقت کے بدلے پانچ سے آٹھ دِن معافی اور ہر چھ ماہ بعد خون کا عطیہ دینے کی صورت میں ایک ماہ معافی حاصل کر سکتے ہیں۔ انہیں صدر اور صوبائی حکومت کی طرف سے اعلان کردہ اور جیل حکام کی طرف سے بھی معافیاں دی جاتی ہیں۔ جیل قوانین کے مطابق اُن کے لیئے سال بھی 360 دن کا ہوتا ہے مگر نیب ملزمان کے لیئے کوئی معافی نہیں بلکہ سال بھی 365 دن کا اور مشقت بھی۔ ستم تو یہ ہے کہ محکمہ انسدادِ رشوت ستانی اور ایف آئی اے کے تحت انہی جرائم کے مقدمات میں سزائیں پانے والے یہ معافیاں حاصل کر رہے ہیں۔ دوسرے اسیران اپنی سزائیں جیل میں مکمل کر جاتے ہیں مگر نیب کے ملزمان کی سزائیں، جائیدادوں کی ضبطی اور رہا ہونے کے بعد آئندہ دس سال تک اُن کے سماجی، معاشرتی اور معاشی قتل کی صورت میں جاری رہتی ہے جو بنیادی انسانی حقوق کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہے۔ اعلیٰ عدالتوں، سیاسی جماعتوں اور انسانی حقوق کی تنظیموں کو ان اُمور پر غور کر کے نیب قیدیوں کے استحصال اور اُن سے روا امتیازی سلوک کا انسداد کرنا چاہیے۔

مجھے نیب ریفرنسوں میں سزا کے بعد اے آر ڈی اور ایم ایم اے (حزبِ اختلاف) کے علاوہ مسلم لیگ (ق) کے صدر چوہدری شجاعت حسین، سیکرٹری جنرل سیّد مشاہد حسین، سینئر نائب صدر کبیر واسطی اور سینئر نائب صدر منظور احمد وٹو کے علاوہ دیگر جماعتوں کے رہنماؤں نے بیانات دیے کہ یوسف رضا سیاسی اسیر ہیں اور اُن کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ ان سیاسی رہنماؤں نے حکومت سے میری رہائی کا مطالبہ بھی کیا۔ جس پر میں اُن سب کا تہہ

دِل سے مشکور ہوں۔

دورانِ اسیری 2002ء کے عام انتخابات سے قبل ہمایوں اختر نے مجھ سے سرکاری طور پر ہسپتال میں ملاقات کی اور کہا کہ ہم ایک پارٹی بنا رہے ہیں جس میں جیتنے والے لوگ شامل ہوں گے، ہم نے اس فہرست میں آپ کا نام بھی شامل کیا ہے، لہٰذا آپ ہمارا ساتھ دیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ میں آپ کا دوست اور کلاس فیلو ہوں اور یہ نہیں چاہتا کہ آپ اسمبلی سے باہر رہیں، میں نے پیپلز پارٹی کے چند سرکردہ رہنماؤں کے لیے ایسا انتظام کیا ہے جس کے تحت وہ انتخاب جیتنے کی صورت میں صدر مشرف کا ساتھ دیں گے۔ میں نے پارٹی تبدیل کرنے سے انکار کر دیا۔ مجھے ہمایوں اختر نے کہا کہ اگر آپ شامل نہیں ہوں گے تو ہمیں مجبوراً آپ کے سیاسی حریف ملک سکندر بوسن کو شامل کرنا پڑے گا۔ چند دنوں بعد سکندر بوسن مسلم لیگ (ق) میں شامل ہو گئے۔

2002ء میں صدر مشرف کے پرنسپل سیکرٹری طارق عزیز نے مجھ سے سنٹرل جیل اڈیالہ، راولپنڈی میں ملاقات کی۔ انہوں نے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ آپ میرے محسن ہیں کیونکہ اسلام آباد میں آپ نے بطور وزیر ہاؤسنگ و تعمیرات مجھے فیڈرل گورنمنٹ ایمپلائز ہاؤسنگ فاؤنڈیشن کے تحت گھر الاٹ کیا تھا۔ انہوں نے اس ملاقات کے دوران ریفرنڈم کے بارے میں میری رائے دریافت کی تو میں نے انہیں کہا کہ اس سے قوم تقسیم ہو گی اور آپ کی حکومت کا عوام کے سامنے جو مسیحا کا تصور ہے وہ ختم ہو جائے گا جس کا فائدہ حزبِ اختلاف کو ہو گا، لہٰذا ریفرنڈم کے بعد ہماری ملاقات ہونی چاہیے تا کہ ہم جائزہ لے سکیں کہ کیا میرا تجزیہ درست تھا یا نہیں؟ انہوں نے رخصت ہوتے ہوئے کہا کہ آپ چوہدری شجاعت حسین سے بھی ملاقات کر لیں۔ میں نے اُن سے کہا کہ جب مجھے 10رفروری 2001ء کو لاہور سے گرفتار کیا گیا تو چوہدری شجاعت حسین اور چوہدری پرویز الٰہی نے لاہور میں میری اہلیہ سے ملاقات کی اور کہا کہ آپ ہماری بہن ہیں اور جو کچھ ہم یوسف رضا کے لیے کر سکتے ہیں وہ ضرور کریں گے۔ میں نے مزید کہا کہ میرے اُن سے بہت دیرینہ مراسم ہیں، میں چوہدری شجاعت حسین کے والد چوہدری ظہور الٰہی کے ساتھ متحدہ مسلم لیگ کی سنٹرل ورکنگ کمیٹی کا رکن اور چوہدری شجاعت حسین کے ہمراہ محمد خان جونیجو کی کابینہ میں وفاقی وزیر رہ چکا ہوں۔ میں اور پرویز الٰہی، نواز شریف کے خلاف مہم میں شامل رہے ہیں مگر جہاں تک پارٹی بدلنے کا سوال ہے وہ میرے لیے مشکل ہے۔

ضمانت پر رہائی کے بعد میں نے اپنے ایک دوست سعادت علی کالرو کے گاؤں نواب پور، ملتان میں اُن کے ایک عزیز کی شادی میں شرکت کی۔ شادی کی تقریب میں جنرل احتشام ضمیر اور کرنل محمد علی بھی مدعو تھے۔ محمد علی نے میری گرفتاری 10 رفروری 2001ء سے قبل 'گیلانی ہاؤس' ملتان میں مجھ سے ملاقات کی اور ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی جنرل محمود کا پیغام دیا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس موقعہ پر میں نے جنرل ضمیر سے کہا کہ میں اپنی یادداشتیں لکھ رہا ہوں جس میں محمد علی سے منسوب پیرا تا حال نامکمل ہے۔ جس پر جنرل صاحب نے کہا کہ فوج میں مختلف شعبے اپنا اپنا کام کررہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ جنرل محمود آپ سے مل کر کوئی بہتر لائحہ عمل اختیار کرنا چاہتے تھے لیکن اسی دوران نیب نے آپ کو گرفتار کرلیا۔ میرے دریافت کرنے پر جنرل احتشام ضمیر نے مزید بتایا کہ آپ کی گرفتاری کے بعد جیل میں طارق عزیز کی آپ سے ملاقات اسی کی ایک کڑی تھی۔

میرے خلاف پہلے ریفرنس کا فیصلہ 8/ جون 2002ء کو رات آٹھ بجے سنایا گیا۔ مجھے پانچ سال قید اور دس لاکھ روپے جرمانے کی سزا دی گئی اور یوں مجھے میری سالگرہ کی گولڈن جوبلی کے موقعہ پر یہ 'تحفہ' دیا گیا کہ مجھے وہ رات سنٹرل جیل اڈیالہ، راولپنڈی میں گزارنی پڑی۔

عام انتخابات کے بعد سپیکر کے انتخاب سے قبل اَرباب غلام رحیم نے اتوار کے دن جیل میں مجھ سے ملاقات کی۔ انہوں نے آتے ہی کہا کہ مجھے حکومت نے وزیرِ اعلیٰ سندھ نامزد کر دیا ہے، میں آپ کو لینے آیا ہوں کیونکہ میرا دوست جیل میں ہو یہ مجھے پسند نہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے عدالت سے پانچ سال سزا ہو چکی ہے، آپ مجھے کیسے لے جا سکتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ اگر میں اتوار کے روز جیل کھلوا کے آپ سے ملاقات کر سکتا ہوں تو کیا آپ کو باہر نہیں نکلوا سکتا۔ انہوں نے کہا کہ ہم مولانا اعظم طارق کو بھی جیل سے لے کر جا رہے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ چند اراکینِ قومی اسمبلی ایسے بھی ہیں جنہیں آپ صرف اشارہ کر دیں تو وہ ہمارا ساتھ دیں گے، ہم انہیں آپ کی طرف لے آتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اگر وہ میری ملاقات کے لیے آئے تو میں ان سے صاف کہہ دوں گا کہ آپ اپنی پارٹی کا ساتھ دیں۔ پھر انہوں نے تجویز دی کہ اراکینِ قومی اسمبلی مسز نسیم چوہدری اور اپنے بھانجے سیّد اسد مرتضٰی سے کہیں کہ چاہے وہ اپنی وفاداریاں تبدیل نہ کریں مگر سپیکر کے لیے ووٹ ہمارے ہاتھ میں دیں۔ میں نے انہیں یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں

اپنی قابلِ اعتماد پارٹی رکن اور اپنے خاندان کے فرد کو وفاداریاں تبدیل کرنے جیسی غلط ترغیب نہیں دے سکتا۔ یہاں یہ بات کرنا قرینِ انصاف ہوگا کہ ارباب غلام رحیم میرے کزن سیّد تنویر الحسن کے بھی دوست ہیں، کئی مرتبہ ملتان میں عید میلا د النبیؐ کے سالانہ جلسوں اور جلوسوں میں شرکت کر چکے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کیا آپ نہیں جانتے کہ اسد مرتضٰی، سیّد تنویر الحسن کا بھتیجا ہے؟ وہ اَز خود بھی اپنی پارٹی بدل سکتا ہے، اگر وہ ایسا کرتا ہے تو آپ اُس کے فیصلے کی ذمہ داری قبول کرلیں۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر وہ از خود بھی حکومت میں شامل ہو گیا تو میں اپنے آپ کو اُس سے لاتعلق کرلوں گا۔ یہ سن کر وہ دل برداشتہ ہو کر چلے گئے۔

دوسرے روز میرے دو دوستوں کے ہمراہ پھر آ گئے۔ اُن دونوں نے میرے پاؤں پکڑ لیے اور کہا کہ آپ اپنے بچوں پر رحم کریں، ہم آپ کو لینے آئے ہیں، آپ ابھی مسز نسیم چوہدری اور اسد مرتضٰی کے متعلق حامی بھریں، ہم آپ کو کل صبح جیل سے لے جائیں گے اور آپ کو کئی بہتر مواقع بھی ملیں گے۔ میں نے معذرت کر لی اور کہا کہ میں اپنی یادداشتیں لکھ رہا ہوں، آپ مجھے ایک سال مزید جیل میں رکھیں تا کہ میں اپنی یادداشتیں مکمل کر سکوں۔ انہوں نے مجھے کہا کہ ہم آپ کے دوست ہیں ہم آپ کو جیل سے لینے آئے ہیں اور آپ اس قسم کی بات کر رہے ہیں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور انہیں سپرنٹنڈنٹ جیل کے دفتر کے دروازے تک رخصت کرنے گیا۔ میرا دل مطمئن تھا کہ میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ اصولوں پر مبنی تھا جس پر مجھے ذرہ برابر بھی ملال نہیں۔ اصولوں کی پاسداری کرنے کے لیے ایسے کڑے فیصلے کرنا ہی پڑتے ہیں۔

چند دِنوں بعد سپیکر کا انتخاب ہوا۔ پیپلز پارٹی کے کئی اراکینِ قومی اسمبلی نے وفاداریاں تبدیل کرلیں۔ پارلیمنٹ کے دس ارکان نے پیپلز پارٹی پیٹریاٹ کے نام سے ایک فارورڈ بلاک تشکیل دیا۔ انہوں نے پارٹی سے بے وفائی کی۔ کاش یہ لوگ اپنی پارٹی سے ایسا نہ کرتے تو آج ملک میں جمہوریت ہوتی اور آمریت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی۔ پیپلز پارٹی کے دس اراکین کی حمایت سے چوہدری امیر حسین صرف ایک ووٹ کی برتری سے سپیکر بننے میں کامیاب ہو سکے۔ کچھ دنوں بعد وزیرِ اعظم کے لیے اعتماد کے ووٹ کا وقت آیا تو پیپلز پارٹی کے چند مزید اراکین فارورڈ بلاک میں شامل ہو گئے۔ میں ایک رات حسبِ معمول ٹیلی ویژن پر خبریں دیکھ رہا تھا کہ خبروں میں آیا کہ میرا بھانجا اسد مرتضٰی پیپلز پارٹی چھوڑ کر فارورڈ بلاک میں چلا گیا ہے۔ مجھے

جیل میں دو سال رہنے کا اتنا دکھ نہیں تھا جتنا اس کے پارٹی بدلنے کا۔ میرے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا جس کی وجہ سے مجھے ساری رات نیند نہ آئی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسد مرتضیٰ ایسا کرسکتا ہے کیونکہ اُس کے والد مخدوم وجاہت حسین کے ساتھ میرے بہترین تعلقات تھے۔ جیسے اُن کے والد مخدوم شوکت حسین نے میرے والد کا ہمیشہ ساتھ دیا تھا بالکل اسی طرح انہوں نے بھی ہمیشہ میرا ساتھ دیا اور میرے تمام سیاسی فیصلوں کی تائید کی۔ وہ ہمارے گھر کے فرد تھے۔ میری بڑی ہمشیرہ سے شادی کے بعد وہ ہمارے ہی گھر 'گیلانی ہاؤس' ملتان منتقل ہو گئے۔ اُنہیں تعلیم دلوانے میں میرے والد نے بے حد رہنمائی کی۔ اُن کے بیٹے اسد مرتضیٰ اور غلام مصطفیٰ شاہ 'گیلانی ہاؤس' ہی میں پیدا ہوئے۔ میں نے اسد مرتضیٰ کو بی اے تعلیم مکمل کرنے پر بطور آفیسر، زرعی بینک میں تعینات بھی کروایا۔

میں نے ایک ای میل محترمہ کے لیے لکھی جس میں فارورڈ بلاک خصوصاً اپنے بھانجے کے عمل پر اظہارِ ندامت کرتے ہوئے پیپلز پارٹی کے دونوں عہدوں، وائس چیئرمین اور سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کی رکنیت سے مستعفی ہوگیا۔ پریس نے میرا بہت ساتھ دیا، انہوں نے میرے اس اصولی مؤقف کو بے حد سراہا اور میرے لیے 'ڈان' اور 'دی نیوز' اخبارات نے خصوصی طور پر اداریے لکھے۔ محترمہ نے ای میل کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں کیونکہ آپ نے خود احتسابی کا جو معیار اپنے لیے مقرر کیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے، آپ نے اپنے لیے قریبی عزیزوں کی دل آزاری اور بے وفائی پر جو اصول اپنائے ہیں ہم سب کو اُس کی پیروی کرنی چاہیے، ہم ایسے عہدے کسی اور کے لیے نہیں رکھ سکتے، یہ عہدے آپ جیسے با اصول لوگوں کے پاس رہنے چاہئیں۔ مجھے لوگوں کی پرواہ نہیں تھی لیکن میرے لیے پارٹی چیئرپرسن کی طرف سے ایسے الفاظ جیل میں حوصلے کا باعث بنے جنہیں میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ اس لیے میں نے اپنا استعفیٰ واپس لے لیا۔ روزنامہ 'ڈان*' کے اداریہ مورخہ 11 دسمبر 2002ء کے متن کا ترجمہ درج ذیل ہے:

''اصول کی پاسداری''

سیّد یوسف رضا گیلانی کا پاکستان پیپلز پارٹی کے وائس چیئرمین کے

عہدے سے اَزخود مستعفی ہونا ایک انوکھی مثال ہے کہ کوئی رہنما اصولوں کی بنیاد پر پارٹی چھوڑ دے۔ انہوں نے اپنے بھانجے سیّد اسد مرتضیٰ گیلانی کے پاکستان پیپلز پارٹی کے فارورڈ بلاک میں جانے کے فیصلے کو رَد کرتے ہوئے کہا کہ اُن کا اپنے بھانجے کے اس کردار پر ندامت سے سر جھک جاتا ہے جس نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب جیتا تاہم جب انتخاب جیت لیا تو اپنی راہ بدل لی جو کہ اس وقت رولز کی خلاف ورزی تو نہیں ہے کہ جنرل (پرویز مشرف) نے فلور کراسنگ کے اس قانون کو معطّل کر رکھا ہے۔ یہ شاید ٹیکنیکل خلاف ورزی تو نہ ہو مگر اسد موقعہ پرستی کے حوالے سے قصوروار ہے۔ اس کی کامیابی کے پیچھے صرف وہ لوگ ہیں جنہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کی پالیسیوں کی حمایت کی۔ جس پارٹی کے ٹکٹ پر وہ جیتے اُس کو نقصان پہنچانا اور ذاتی مفاد کے لیے دوسری طرف چلے جانا اس پارٹی کو دھوکہ دینا ہے۔ اسد نے اپنے ووٹرز کو دھوکہ دیا ہے۔ اُن سب کی طرح جنہوں نے 10 / اکتوبر کے واقعہ پر اپنی اپنی پارٹی کو چھوڑ دیا۔ پارٹی کی سربراہ بےنظیر بھٹو کو جیل سے لکھے گئے اپنے خط میں اپنی وفاداری کو دوہراتے ہوئے نہ صرف اپنے بھانجے کی سرزنش کی بلکہ اُن تمام اراکین کی بھی جنہوں نے ذاتی مفاد کے لیے موجودہ حکومت سے وابستگی اختیار کر لی۔ ہمارے سیاستدان اصولوں پر پابند رہنے میں کوئی شہرت نہیں رکھتے خاص طور پر اُس وقت جب حکومت اور پارٹی میں اختلافِ رائے نظر آئے۔ تاریخ گواہ ہے کہ وزرائے اعظم نے بھی دوسروں کو پارٹی سربراہ بنانے کی بجائے اَزخود رہنا پسند کیا۔ اس عمل نے نہ صرف پارٹی اور حکومت کو تباہ کیا بلکہ ملک کو بھی۔ جب بھی وزیرِاعظم نے پارٹی اور ریاستی مفادات کو ایک سمجھا تو بطورِ پارٹی سربراہ اُن اراکین کو سزا دینے کی کوشش کی جنہوں نے اُن کی پالیسیوں سے اختلاف

* اخبار کا عکس کتاب کے آخر میں موجود ہے۔

کیا۔ یہ کسی بھی پارلیمانی حکومت کی روایات کے منافی ہے جس میں پارٹی حکومتی نظام کو چلاتی ہے۔کابینہ پارٹی اور مقننہ کو جوابدہ ہوتی ہے جو وزیرِ اعظم اور اراکین کو پارٹی پالیسیوں اور پروگراموں پر کاربند رہنے کی پابند کرتی ہے۔اس وقت وزیرِ اعظم میر ظفر اللہ جمالی اور پاکستان مسلم لیگ (ق) کے سربراہ میاں اظہر میں سابقہ فیصلے پر اختلاف ہے۔جس میں سلیم سیف اللہ کو پارٹی کا سیکرٹری جنرل بنایا گیا تھا۔اس پر میاں اظہر ناراض ہوگئے کہ اُن کو نظر انداز کیا گیا کیونکہ یہ پارٹی کی جنرل کونسل کو حق حاصل ہے کہ وہ سیکرٹری جنرل کا انتخاب کرے۔ یقیناً جمالی صاحب نے پارٹی کے سیکرٹری جنرل کا عہدہ چھوڑ کر درست فیصلہ کیا تھا لیکن انہوں نے اپنی جگہ سلیم سیف اللہ خان کا تقرر کر کے پارٹی آئین کی خلاف ورزی کی۔ پاکستان مسلم لیگ (ق) مشکل سے ایسی جماعت ہے جس کو سیاسی پارٹی کے ماڈل کے طور پر دیکھا جا سکے۔ یہ ابتداء ہی سے سرکاری پارٹی کے نام سے پہچانی جاتی ہے جو مفاد پرستوں ،موقعہ پرستوں اور پارٹیاں تبدیل کرنے والوں کا ٹولہ ہے۔باوجود یہ کہ یہ قومی اسمبلی میں سب سے بڑی جماعت ہے اور اس وجہ سے یہ کم از کم پارلیمانی طرزِ حکومت کے بنیادی اصولوں کی توثیق کرواسکتی ہے۔

2002ء میں بلدیاتی انتخابات کا اعلان کر دیا گیا ۔ شاہ محمود نے مجھ سے احتساب عدالت، راولپنڈی میں ملاقات کی۔ انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ وہ ملتان کے ناظمِ اعلیٰ کے لیے انتخابات میں حصہ لینا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں اپنی مکمل حمایت کی یقین دہانی کروائی۔ وہ انتخابات میں بھاری اکثریت سے جیت گئے اور ناظم تحصیل صدر ملتان کی نشست پر میرے بھائی سیّد احمد مجتبیٰ بھی آسانی سے کامیاب ہوگئے۔

جب صدر مشرف نے بلدیاتی انتخابات کے بعد ریفرنڈم کا اعلان کیا تو شاہ محمود مجھے ملنے کے لیے دوسری مرتبہ احتساب عدالت آئے اور مجھ سے ریفرنڈم کے سلسلے میں مشاورت کی۔ شاہ محمود اور سیّد احمد مجتبیٰ نے ریفرنڈم کی مخالفت کی اور ضلع کے بلدیاتی اداروں کے اکثر عہدیداروں

نے حکومت کی مدد کی۔ شاہ محمود اور سیّد احمد مجتبیٰ عام انتخابات سے قبل اپنے موجودہ عہدوں سے مستعفی ہو گئے۔

عام انتخابات سے قبل پورے ملک میں نئی حلقہ بندی کی گئی۔ ملتان کے حلقوں میں بھی ردّ و بدل کر دیا گیا۔ میرے حلقۂ انتخاب ملتان کو یکسر تبدیل کر دیا گیا۔ میں نے حلقہ 151 سے اپنے بھائی سیّد احمد مجتبیٰ کو اور حلقہ 152 سے اپنے بھانجے اسد مرتضیٰ کو انتخاب کے لیے پیپلز پارٹی کا ٹکٹ دلوا دیا۔ ہم عملی طور پر قومی اسمبلی کی دونوں نشستیں جیت گئے مگر حکومت نے میرے بھائی کو دوسرے دن چند سو ووٹوں سے ہروا دیا۔ اُن کے صوبائی اسمبلی کے اُمیدواروں میں سے ملک اسحاق بُچہ اور سیّد ناظم حسین کامیاب ہو گئے جبکہ ملک احمد حسین ڈہیڑ کو بھی چند سو ووٹوں سے ہروا دیا گیا۔ وہ پیپلز پارٹی کی فیڈرل کونسل کے رکن اور ڈویژنل کوآرڈینیٹر ملتان ہیں اور پارٹی میں فعال کردار کر رہے ہیں۔

کچھ عرصے بعد ہائی کورٹ نے میری ضمانت منظور کر لی۔ مجھے سپرنٹنڈنٹ جیل ندیم کوکب وڑائچ نے یہ خوشخبری سنائی۔ ندیم وڑائچ ایک فرض شناس اور خوش اخلاق اَفسر ہیں۔ اب وہ ڈی آئی جی جیل خانہ جات، فیصل آباد تعینات ہیں۔ ہائی کورٹ میں میری ضمانت میرے جیل کے ساتھی مسلم لیگ (نواز گروپ) راولپنڈی کے سابق ایم پی اے چوہدری تنویر نے دی۔ مجھے خوشی اس بات کی ہوئی کہ انہوں نے میرے کہے بغیر میری ضمانت کے لیے اپنے مچلکے داخل کروائے جس پر میں اُن کا شکر گذار ہوں۔

میں جب جیل سے رہا ہوا تو جیل کے باہر میرا پارٹی کارکنوں اور ملتان سے آئے ہوئے دوستوں نے استقبال کیا۔ استقبال میں میرے رشتہ داروں اور عزیزوں کے علاوہ نواز کھوکھر، نیرّ حسین بخاری، زمرد خان، رانا قاسم نون، چوہدری تنویر اور میاں خرم رسول بھی موجود تھے۔ مجھے میرے جیل کے ساتھی خواجہ عدنان کے گھر اسلام آباد لے جایا گیا۔ وہاں دیگر دوست خاصی تعداد میں پہلے ہی سے موجود تھے۔ ایک خاتون نے بڑا پیارا سا بچہ اٹھایا ہوا تھا۔ جونہی بچے نے مجھے دیکھا تو زور سے آواز دی: ''ابو!''۔ مجھے اُس بچے پر بہت پیار آیا اور میں نے قریب جا کر اسے پیار کیا۔ میں نے خاتون سے دریافت کیا کہ یہ کس کا بچہ ہے؟ خاتون نے شکایتاً کہا کہ آپ اپنے بچوں کو بھی نہیں پہچانتے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ میری بیٹی فِضّہ کا بیٹا تھا۔

اُس کی پیدائش پر میں نے جیل سے خود اُس کا نام ایران کے بادشاہ کے نام پر اسفندیار رکھا۔ اب وہ تقریباً ڈیڑھ برس کا ہو چکا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں جیل میں رہنے کی وجہ سے اسے پہچان نہ سکا۔

میں چند دنوں بعد اپنے بیٹوں کے ہمراہ بذریعہ ٹرین لاہور سے ملتان روانہ ہوا۔ دوستوں میں سے میرے جیل کے ساتھی خواجہ عدنان بھی میرے ہمراہ تھے۔ میرا اوکاڑہ، ساہیوال، چیچہ وطنی، میاں چنوں اور خانیوال کے ریلوے سٹیشنوں پر استقبال کیا گیا۔ میرے دوست چوہدری عبدالقادر کے بیٹے چوہدری ندیم قادر ایڈووکیٹ نے خانیوال ریلوے سٹیشن پر کھانے کا اہتمام کیا۔ میں نے وہاں پر ریلوے یونین کی طرف سے ترتیب دیے گئے پروگرام سے بھی خطاب کیا۔ میرا ملتان سٹیشن پر بہت شاندار استقبال ہوا مجھے جلوس کی شکل میں وی آئی پی لاؤنج میں لے جایا گیا تو وہاں سابق ایم این اے رانا تاج احمد نون بھی میرے استقبال کے لیے موجود تھے۔ انہوں نے میرے کہنے پر میرے بھانجے اسد مرتضٰی کی انتخابات میں مدد کی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے میرے بھانجے کی بے وفائی پر رونا شروع کر دیا۔ مجھے جلوس کی شکل میں دربار پیر پیرانؒ لے جایا گیا۔ ریلوے سٹیشن سے درگاہ کا تین کلومیٹر فاصلہ تقریباً پانچ گھنٹے میں طے ہوا۔ درگاہ کے راستے میں کئی استقبالی کیمپوں سے پھول نچھاور کیے گئے اور میری دستار بندی کی گئی۔ اس پروگرام کو منظم و مرتب کرنے میں پیپلز پارٹی کے کارکن، مقامی تنظیم، گیلانی خاندان اور میرے حلقے کے احباب پیش پیش تھے۔ میرے دوست اور ایم پی اے ڈاکٹر جاوید صدیقی نے سٹیشن سے دربار تک روٹ اپنے حلقے میں سے ترتیب دیا۔ میرے استقبال نے مجھے میری دو سالہ قید بھلا دی۔ مجھ سے ملنے کے لیے کئی دنوں تک سینکڑوں لوگ آتے رہے۔ جاوید ہاشمی اور لیاقت بلوچ نے بھی میرے گھر آ کر مجھے مبارکباد دی۔ علاوہ ازیں بے نظیر بھٹو، میاں نواز شریف، چوہدری شجاعت، فاروق لغاری، وسیم سجاد، سلیم سیف اللہ، گوہر ایوب، پرویز الٰہی، حامد ناصر چٹھہ کے علاوہ متعدد دوستوں نے بذریعہ ٹیلی فون و ٹیلی گرام مجھے مبارکباد دی۔

ضمانت پر رہا ہونے کے بعد حکومت کی توقعات کے برعکس میں سیاسی طور پر خاصا سرگرم رہا۔ کئی ضمنی انتخابات کی مہمات میں حصہ لیا جن میں ملتان، بہاولنگر اور ناظم تحصیل ملتان خاص طور پر شامل ہیں۔ کئی جلسوں، ریلیوں، پریس کانفرنسوں اور کنونشنوں میں شرکت کی۔ بین

الاقوامی کانفرنسوں کا بھی اہتمام کیا اور کئی بار ایسوسی ایشنوں سے خطاب کیا۔ پیپلز پارٹی کے یومِ تاسیس، لاہور کے پروگرام میں شرکت کی۔

2004ء میں والد کی برسی کے اختتام پر میری ملاقات چچا زاد بھائی سیّد محمد رضا سے ہوئی۔ ہم نے رات کا کھانا اکٹھے کھایا۔ کھانے کے فوراً بعد رخصت ہوتے وقت محمد رضا نے مجھے اور میری اہلیہ کو دوسرے روز افطاری کی دعوت دی۔ میں نے اپنی فیملی کے لاہور جانے کا پروگرام منسوخ کروا کے اُن کی دعوت میں شمولیت کا وعدہ کرلیا۔ دوسرے روز جب بھائی سیّد احمد مجتبیٰ اور میری فیملی 'الرضا' پہنچے تو چچا حامد رضا ہمارے انتظار میں تھے۔ ہم نے اکٹھے روزہ افطار کیا۔ اُن سے بڑے خوشگوار ماحول میں ملاقات ہوئی۔ میری اہلیہ اُن کے بہترین دوست پیر اسرار حسین کی بیٹی ہیں جن سے مل کر اُنہیں اور بھی خوشی ہوئی۔ جاتے ہوئے وہ سیّد احمد مجتبیٰ کا ہاتھ تھام کر انہیں علیحدہ لے گئے اور کہا کہ آپ بھائی صاحب سے کہیں کہ اب اکٹھے رہیں۔ سیّد احمد مجتبیٰ نے مجھے کار میں بیٹھنے کے بعد چچا کا یہ پیغام دیا۔

چند روز بعد میں نے چچا حامد رضا کو اپنے گھر، لاہور میں عشائیہ کے لیے مدعو کیا۔ ہمارے سیاسی اختلافات کی وجہ سے میری خوش دامن کا بھی اُن سے رابطہ کٹ چکا تھا۔ میں نے اُنہیں یہ خوشخبری سنائی کہ آج پہلی مرتبہ چچا حامد رضا میرے گھر آرہے ہیں۔ میں نے اُن سے دریافت کیا کہ چچا کو آپ کے ہاتھ کا پکا ہوا کون سا کھانا پسند ہے؟ انہوں نے بہت سے کھانوں کے نام بتائے مگر پھر کہا کہ وہ میرے ہاتھ کی پکی مچھلی بہت پسند کرتے ہیں۔ چچا کیک اور بہت سے پھول میرے لیے لائے اُن کے بیٹے سید محمد رضا بھی اُن کے ہمراہ آئے۔ ہمارے ٹی وی لاؤنج میں دو تصاویر لگی ہوئی ہیں، ایک میرے والد اور دوسری میرے سُسر کی۔ ہم جب لاؤنج میں داخل ہوئے تو چچا کچھ دیر دونوں تصاویر کے سامنے خاموش کھڑے رہے اور کہنے لگے کہ یہ بہت بڑے لوگ تھے۔ میری خوش دامن کے ہاتھ کی پکی مچھلی اُنہیں بہت پسند آئی۔ کھانے کے دوران انہوں نے مجھے کہا کہ اپنے بچوں کو میرے پاس بھیجا کرو، مجھے اُن کی عادات بہت پسند آئی ہیں۔ وہ میرے بچوں کے ساتھ شعر و شاعری بھی کرتے رہے۔ انہوں نے اس ملاقات کے بعد ہمارے مشترکہ دوستوں کو فون کر کے خود اطلاع دی کہ میری اور یوسف رضا کی صلح ہوگئی ہے۔ مجھے دوستوں کے ٹیلی فون آنا شروع ہوگئے جو ہمارے سیاسی اختلافات کی وجہ سے مشکل میں تھے۔

چچا حامد رضا چند دنوں بعد علیل ہو گئے۔ میں نے اُن سے اپنی فیملی کے ہمراہ ملاقات کی۔ انہوں نے اس دوران کہا کہ مجھے دِل کی تکلیف ہے اور میں نے اپنے چند ٹیسٹ برطانیہ بھجوائے ہیں جن کے رزلٹ آنے پر فیصلہ کروں گا کہ میں دل کا بائی پاس پاکستان سے کرواؤں یا برطانیہ سے۔ میں ایک دن اچانک اُن کے گھر گیا تو وہ کہنے لگے کہ میں نے رپورٹ آنے سے پہلے ہی فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اپنا بائی پاس کروانے کے لیے کل ہی پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی، لاہور میں داخل ہو جاؤں۔ میں دوسرے روز ان کے ہسپتال جانے کے وقت پر پہنچ گیا۔ چچا حامد رضا نے ہسپتال جاتے ہوئے اپنی کار خود چلائی۔ اپنے بیٹے محمد رضا اور مجھے بلوا کر کہا کہ آپ میرے ساتھ کار میں بیٹھیں۔ میں اُن کے ساتھ آگے بیٹھ گیا اور محمد رضا پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ میں دو تین دِن میں اپنے آپریشن سے فارغ ہو کر آپ کی یادداشتیں مکمل کرواؤں گا۔ وہ ہسپتال پہنچنے پر رات دیر گئے تک میرے بچوں کے ساتھ گپ شپ کرتے رہے۔ سابق وزیرِ اعظم بلخ شیر مزاری بھی وہاں موجود رہے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا کہ میں اَب آپریشن نہیں کرواتا مگر آپریشن کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ دوسرے روز صبح میں خود اُنہیں ویل چیئر پر بٹھا کر آپریشن تھیٹر لے گیا۔ آپریشن کامیاب ہو گیا مگر انتہائی نگہداشت وارڈ میں منتقل ہونے کے چند منٹ بعد اُنہیں ہیمرج ہو گیا اور اُن کا بلڈ پریشر گرنے سے گردوں نے کام کرنا بند کر دیا جس کی وجہ سے اُن کی تکلیف میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ صحت یاب نہ ہو سکے۔ 24 / جنوری 2004ء کو اُن کی وفات ہو گئی۔ اُن کی نمازِ جنازہ نشتر گراؤنڈ، ملتان میں ہوئی اور اُن کی وصیت کے مطابق تدفین حامد پور، ملتان میں کی گئی۔ اُن کی بہت بڑی قل خوانی آبائی گاؤں حامد پور میں ہوئی جس میں ملک بھر سے مقتدر شخصیات نے شرکت کی۔

میں سابق چیئرمین سنٹرل بورڈ آف ریونیو اعتزاز الدین احمد کی بیٹی زہرہ احمد کی شادی میں شرکت کے لیے میریٹ ہوٹل، اسلام آباد گیا۔ اُن کی بیٹی کی شادی وزیرِ اعظم میر ظفر اللہ جمالی کے بھانجے سے ہوئی جن کا تعلق فارن سروس سے ہے۔ تقریب کے دوران مجھے وزیرِ اعظم کے ساتھ بٹھایا گیا۔ ہمارے ساتھ نوریز شکور، گوہر ایوب خان، نسیم آہیر، احسان الحق پراچہ اور چند دیگر دوست بھی موجود تھے۔ باتوں ہی باتوں میں، میں نے انہیں بتایا کہ میں اپنی اہلیہ کے ہمراہ عمرے کی ادائیگی پر جانا چاہتا تھا، حکومتی پالیسی کے مطابق ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل سیاستدانوں کو

ایک مرتبہ ملک سے باہر جانے کی اجازت عموماً دی جاتی رہی ہے۔ میں نے مزید کہا کہ میں نے بھی عمرے پر جانے کے لیے وزارتِ داخلہ کو درخواست بھجوادی مگر مجھے اجازت نہ دی گئی۔ میں نے اپنے بیٹے سید عبدالقادر کو اپنی اہلیہ کے ہمراہ بطورِ محرم عمرے پر بھجوادیا۔ اس بات پر وزیرِاعظم نے وضاحت کی کہ یہ سب آپ کے دوست کی وجہ سے ہوا ہے۔ اُن کا اشارہ وزیرِ داخلہ سیّد فیصل صالح حیات کی طرف تھا۔ میں نے کہا کہ آپ وزیرِاعظم ہیں، اس لیے میرا گلہ اُن سے نہیں بنتا۔ اسی موقعہ پر میں نے وزیرِاعظم سے کہا کہ بہت جلد نیشنل سیکیورٹی کونسل تشکیل پا جائے گی جس کے اثرات آپ کی حکومت پر بھی ہوں گے۔ لیکن انہوں نے مجھ سے اتفاق نہ کیا۔ کچھ عرصے بعد انہی کے دورِ حکومت میں نیشنل سیکیورٹی کونسل تشکیل پا گئی اور اس کا ردِعمل بھی اُن پر نظر آ گیا۔

علالت کے باعث چچا سیّد فیض مصطفیٰ گیلانی شوکت خانم ہسپتال، لاہور میں داخل کروا دیے گئے لیکن وہ صحت یاب نہ ہو سکے اور 13 ستمبر 2004ء کو اُن کی وفات ہوگئی۔ اُن کی نماز جنازہ دربار پیر پیراںؒ، ملتان میں ہوئی۔ اُن کی وصیت کے مطابق ان کی تدفین پیر مختار، چاہ سہری والا موضع سلطان پور ہمڑ، ملتان میں ہوئی۔ تیسرے روز اُن کی رہائش گاہ 'المصطفیٰ' ملتان میں قل خوانی ادا کی گئی۔ میں شام کی فلائٹ سے لاہور چلا گیا۔ رات اپنے بچوں کے ساتھ گزاری اور اگلی صبح اسلام آباد کے لیے روانہ ہوگیا۔

اسلام آباد پہنچنے پر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سنٹرل جیل اڈیالہ، راولپنڈی چوہدری ایوب سے ائرپورٹ کے وی آئی پی لاؤنج میں میری ملاقات ہوگئی۔ وہ میری گزشتہ اسیری کے دوران سنٹرل جیل اڈیالہ، راولپنڈی میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ تعینات تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ جیل میں میرا کمرہ تیار رکھیں کیونکہ آج میرے خلاف فیصلہ آنے والا ہے۔ حسبِ سابق میاں خرم رسول ائرپورٹ پر مجھے لینے آئے ہوئے تھے۔ میں اُن کے ہمراہ اسلام آباد کلب چلا گیا۔ ہماری وہاں طارق خان سے ملاقات ہوئی۔ ہم تینوں نے اکٹھے ناشتہ کیا۔ جب میں احتساب عدالت پہنچا تو وہاں آصف زرداری پہلے ہی سے موجود تھے۔ انہوں نے میرے چچا فیض مصطفیٰ کی وفات پر فاتحہ خوانی کی۔ مجھے تقریباً ایک بجے احتساب عدالت نمبر 1 میں فیصلہ سننے کے لیے بلایا گیا۔ میرے ہمراہ آصف زرداری اور پارٹی کارکنان بھی عدالت میں گئے۔ عدالت بھری ہوئی تھی۔ میں اپنے وکیل کے بغیر پیش ہوا۔ احتساب جج ملک منظور حسین نے فیصلہ سناتے ہوئے مجھے دس سال قید اور

دس کروڑ روپے جرمانے کی سزا سنائی۔ میں نے دریافت کیا کہ جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں کچھ اور سزا بھی ہے؟ جج نے کہا کہ پانچ سال مزید قید ہوگی۔ فیصلہ سنتے وقت مجھے انور شعور کے یہ اشعار یاد آگئے:

میں جہاں کھڑا ہوں بس اتنی جگہ میری ہے
گرم ہواؤں سے میرا بدن چھلنی ہے
سرد پانیوں سے میرے پاؤں شل ہیں
میں جہاں کھڑا ہوں وہیں کھڑا رہوں گا
سچ کو دنیا میں بس اتنی ہی جگہ ملتی ہے

جج نے فیصلہ سنانے کے بعد اُٹھتے ہوئے کہا: "Thank You."۔ آصف زرداری نے جج سے کہا کہ جب میرے خلاف فیصلہ سنایا گیا تو یہی عدالت تھی، یہی پراسیکیوٹر بصیر قریشی تھا، پھر بتائیں کیا ہوا؟ ملک منظور حسین جاتے ہوئے رُک گئے اور کہا کہ وہ میرا ظرف تھا، یہ آپ کا ظرف ہے۔ آصف زرداری نے مزید کہا کہ جج صاحب! کوئی بات نہیں، آپ نے گیلانی صاحب کو اتنی بڑی سزا دے کر پاکستان کے آئندہ صدر کا اہل بنا دیا ہے۔ جس پر میں نے آصف زرداری سے کہا کہ میں پارٹی کا صرف ادنیٰ کارکن ہی رہنا پسند کروں گا۔ سرکاری وکیل بصیر قریشی نے حالات کو بھانپتے ہوئے کہا: "Sir,The Court has risen." (جناب! عدالت برخاست ہو چکی ہے)۔ میرے عدالت سے باہر آنے تک 'جیو' اور 'اے آر وائی' پر بریکنگ نیوز نشر ہو چکی تھی۔ کسی نے میری بے نظیر بھٹو سے فون پر بات کروائی، انہوں نے بہت افسوس کیا۔ میری اہلیہ اور بچوں سے بھی میری بات ہوئی۔ اس دوران میری ہمشیرہ مسز مخدوم وجاہت حسین کا فون آیا، اُنہوں نے روتے ہوئے کہا کہ میں سب کچھ اس لیے برداشت کر رہی تھی کہ آپ آزاد ہیں، اَب مجھ سے کچھ بھی برداشت نہیں ہوگا۔ میں نے اُنہیں تسلی دی۔

اس طرح 18 ستمبر 2004ء کو مجھے گرفتار کر کے دوسری مرتبہ سنٹرل جیل اڈیالہ، راولپنڈی بھیج دیا گیا۔ جیل جاتے ہوئے جیل کے پرانے ساتھی کلکٹر کسٹمز مظہر انوار نورانی ہمراہ تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ ہمیں پہلے ہی اندازہ تھا کہ آپ کو اتنی بڑی سزا ہوگی، لہٰذا ہم نے آپ کا پرانا کمرہ

آپ کے لیے تیار رکھا ہوا ہے۔ میں جب جیل پہنچا تو شام کے چار بج رہے تھے۔ اُس وقت اے کلاس کے تمام اسیران لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اُن سب کا تعارف مجھ سے کروایا گیا جن میں مظہر انوار نورانی کے علاوہ چوہدری مقبول الٰہی، سابق ڈائریکٹر جنرل وزارتِ محنت و افرادی قوت شیر اکبر، جوائنٹ سیکرٹری وزارتِ محنت و افرادی قوت ایم ایچ شاہ، ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل ملٹری لینڈز قاضی نعیم، پیر نوازش علی شاہ، بزنس مین آغا سیّد انور شاہ اور صاحبزادہ طاہر علی شامل تھے۔ مجھے مشقتی امجد اور پرویز ملنے آئے جو میرے ساتھ پہلے بھی ڈیوٹی دے چکے تھے۔ اُس دن جاوید ہاشمی نے مجھے کھانا، پھل اور اخبارات وغیرہ بھیجے۔ وہ اسی جیل کے سیکیورٹی سیل میں پابندِ سلاسل تھے۔

ایک روز بعد مشقتی پرویز صبح سویرے کمرے میں آیا اور اطلاع دی کہ آپ کی بہن مسز مخدوم وجاہت حسین کی وفات ہوگئی ہے۔ مجھے یقین نہ آیا کیونکہ میری اُن سے ایک روز قبل بات ہو چکی تھی۔ یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ میں قید کی وجہ سے بے بس تھا۔ مجھے حکومت نے پیرول پر ملتان جانے کی اجازت دے دی۔ خرم رسول اور طارق خان مجھے لینے جیل پہنچ گئے۔ میں اپنے بھانجے اسد مرتضیٰ کے فارورڈ بلاک میں جانے کے فیصلے کی وجہ سے گزشتہ دو برسوں سے اپنی بہن کے گھر نہیں گیا تھا۔ میں پیرول پر ملتان اپنی بہن کے گھر دو سال بعد گیا بھی تو اُن کے جنازے میں۔ ہم نے اُن کی نمازِ جنازہ دربار پیر پیراں موسیٰ پاک شہیدؒ پر ادا کی۔ جنازے کے بعد مجھے میرے بہنوئی مخدوم وجاہت حسین نے اپنی اہلیہ (میری ہمشیرہ) کا خط* دیا جو ابھی نامکمل تھا،

چاند سے زیادہ حسین
ولیوں کے ولی
یوسف گیلانی
میرے بابل کی نشانی
تیرے سے دُور ہوئی
ملنے سے مجبور ہوئی

---

* خط کا عکس کتاب کے آخر میں موجود ہے۔

خوشامد کرتے کرتے تھک گئی
اپنی زندگی سے اُک گئی

ملتان سے واپسی پر جیل میں مجھے جاوید ہاشمی کا تعزیتی خط موصول ہوا۔ میری اُن سے جیل کے کانفرنس روم میں ملاقات ہوئی جہاں اُن کے اہل خانہ بشمول بیٹی ایم این اے میمونہ ہاشمی اور دوسری بیٹی سعدیہ جس کی شادی میرے کزن سیّد تنویرالحسن کے بیٹے عمران گیلانی سے ہوئی، نے میری بہن کی وفات پر تعزیت کی۔

اچانک گرفتاری کی وجہ سے میں اپنے گرم کپڑے ساتھ نہ لا سکا۔ چند دن بعد سردی کی لہر آ گئی، میں نے اپنے مشقتی پرویز کو جاوید ہاشمی کے پاس بھیج کر اُن سے گرم شال منگوائی۔ انہوں نے تین شالیں بھجوا دیں جو مختلف رنگوں کی تھیں۔ میں نے اُن میں سے سیاہ رنگ کی شال رکھ کر باقی واپس کر دیں۔ جب میری اُن سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ میں نے آپ کے مشقتی سے کہا تھا کہ گیلانی صاحب سیاہ رنگ کی شال ہی پسند کریں گے، آپ دیکھیں ہم آپ کی پسند کے بارے میں کتنا علم رکھتے ہیں۔ جب اُن کی کتاب شائع ہو گئی تو انہوں نے اس کی ایک کاپی اپنے دستخط کر کے مجھے دی۔ ہم جیل کے کانفرس روم میں اپنی ملاقات پر آئے ہوئے مہمانوں سے ملنے جاتے تو وہاں جاوید ہاشمی اکثر خوشگوار موڈ میں اپنے ملنے والوں سے کہتے کہ مجھے سکیورٹی وارڈ میں علیحدہ رکھا گیا ہے۔ میں اُن دوستوں کو ازراہِ مذاق کہتا کہ ہاشمی صاحب شاید بھول رہے ہیں کہ یہ سکیورٹی وارڈ نواز شریف کے دورِ حکومت میں بے نظیر بھٹو کو پابندِ سلاسل کرنے کے لیے خاص طور سے بنوایا گیا تھا۔

مجھے رمضان المبارک کے دنوں میں خیال آیا کہ میں اپنا وزن کم کروں۔ میں نے چینی، چاول، روٹی اور مٹن کا استعمال ختم کر دیا اور ہائی پروٹین ڈائٹ لینا شروع کر دی جس میں چکن کا استعمال بطورِ وائٹ میٹ شامل تھا۔ دن میں روزے کے باوجود دو مرتبہ واک میرا معمول بن گیا۔ میں ایک رات تقریباً تین بجے باتھ روم جاتے ہوئے کمزوری کی وجہ سے بیہوش ہو کر گر گیا۔ میرے ساتھ والے سیل میں سابق سپیکر قومی اسمبلی صاحبزادہ فاروق علی کے بھتیجے طاہر علی پابندِ سلاسل تھے۔ انہیں میرے گرنے کی آواز آئی تو وہ جلدی سے میرے سیل میں آئے۔ انہوں نے مجھے باتھ روم کے فرش پر گرا ہوا دیکھا تو مشقتیوں کی مدد سے اٹھا کر بستر پر لٹا دیا۔ اس دوران

میں ہوش میں آ گیا۔ انہوں نے فوراً مجھے دودھ میں شہد ملا کر پلا دیا، وہ شوگر کے مریض تھے اور جب اپنے آلے سے معائنہ کیا تو میری شوگر کی سطح درست ہو چکی تھی۔ میں بال بال بچ گیا۔ اگر طاہر علی رات دیر گئے تک کتاب نہ پڑھ رہے ہوتے تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ جب مجھے ساتھی بستر پر لٹا کر چلے گئے تو میں نے سوچا کہ زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آج میں اس دنیا میں نہ ہوتا تو میری ضعیف والدہ کا کیا بنتا۔ میں نے اُس رات اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اگر خدا نخواستہ میری والدہ کو کچھ ہو تو میں اُن کے پاس موجود ہوں۔

اس واقعہ کے چند روز بعد 21 رمضان المبارک کو افطاری کے وقت میرے پاس ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل شیخ اعجاز آئے اور اطلاع دی کہ میری والدہ اس دارفانی سے کوچ کر گئی ہیں۔ اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ بہن کے صدمے کے بعد مجھے والدہ کا اتنا بڑا صدمہ اٹھانا پڑا جو میرے لیے برداشت کرنا خاصا مشکل تھا کیونکہ مجھے مشکل ترین حالات میں بھی ماں کی دعاؤں پر بھروسہ اور آسرا تھا۔ مجھے حکومت نے پیرول پر ملتان جانے کی اجازت دے دی۔ میں ملتان گیا تو اسی روز نشتر گراؤنڈ میں اُن کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ میں نے دوسرے ہی روز ان کی قل خوانی کا اہتمام کیا تا کہ زیادہ دیر رُک کر حکومت کا احسان نہ اٹھاؤں۔ اسی دن وزیرِ اعلیٰ پنجاب پرویز الٰہی نے مجھے ٹیلی فون کر کے پیشکش کی کہ آپ زیادہ دن رُک جائیں۔ اس پر میں نے کہا کہ میری والدہ کی قل خوانی ہو چکی ہے۔ لہٰذا قل خوانی کے اگلے روز میں واپس سنٹرل جیل اڈیالہ، راولپنڈی آ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول کر لی کہ مجھے والدہ کا آخری دیدار نصیب ہوا اور میں اُن کی نمازِ جنازہ اور قرآن خوانی میں بھی شریک ہو سکا ورنہ میں اپنے آپ کو بدنصیب تصور کرتا۔

میں نے اپنی یادداشتوں کو مکمل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس سلسلے میں اے کلاس کے ساتھی شیر اکبر سے مشورہ کیا۔ انہوں نے مسودہ پڑھنے کے بعد مشورہ دیا کہ اس مسودہ کو ترتیب میں لایا جائے۔ دراصل اس مسودہ کی سی ڈی خراب ہو چکی تھی، لہٰذا انہوں نے مسودہ کو کاٹ کر سال بہ سال واقعات کو الگ الگ کرنا شروع کر دیا۔ یہ بہت محنت طلب کام تھا کیونکہ مسودے کے تین ساڑھے تین سو صفحات کو الگ الگ کرنا اور پھر اُسے ترتیب بھی دینا تھا۔

میرے اے کلاس کے ایک اور ساتھی جنہوں نے میری بے حد مدد کی وہ مقبول الٰہی تھے۔ وہ اردو تحریر میں مہارت رکھتے تھے اور سکول کے زمانے میں اردو تحریر میں کئی انعامات حاصل

کر چکے تھے۔انہوں نے شیر اکبر کے ترتیب دیے ہوئے واقعات کو نئے سرے سے لکھنا شروع کر دیا۔انہوں نے اس کام کا آغاز بڑے خلوص اور محنت کے ساتھ کیا۔کچھ عرصے بعد شیر اکبر، ایم ایچ شاہ، صاجزادہ طاہر علی اور قاضی نعیم ضمانت پر رہا ہو گئے اور نوازش علی شاہ بھی اپنی سزا مکمل ہونے پر رہا ہو گئے۔

انہی دنوں میری ظفر اقبال منہاس سے ملاقات ہو گئی جن کا تعلق پیر غلام معین الحق گیلانی گولڑہ شریف سے ہے۔وہ تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔انہوں نے مسودے کو پڑھنے کے بعد الطاف حسین حالی کے اس شعر،

آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
دوست یاں کم ہیں اور بھائی بہت

کے طرحی مصرعہ سے کتاب کا نام 'چاہِ یوسف سے صدا' رکھا۔

آصف زرداری کی آٹھ سال بعد ضمانت ہو گئی ۔انہوں نے نہایت بردباری سے قیدِ تنہائی کاٹی۔وہ مجھے اکثر بتاتے تھے کہ شروع کے دنوں میں اُن کے قریبی دوست بھی ملاقات کے لیے نہیں آتے تھے اور عدالت میں صرف اُن کا وکیل اور وہ خود ہوتے تھے۔میں سمجھتا ہوں کہ نہ صرف پیپلز پارٹی بلکہ اُن کے سیاسی حریف بھی ان کی جرأت و ہمت کے قائل ہیں۔پیپلز پارٹی کی طویل داستان جدوجہد اور قربانیوں سے رقم ہے اور آصف زرداری کو اُن قربانیوں میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔وہ اسیران کے لیے مشعلِ راہ رہے اور انہوں نے اپنی جواں مردی سے دوسروں کا حوصلہ اور ہمت بڑھانے میں فعال کردار ادا کیا۔

جاوید ہاشمی کو کچھ عرصے بعد سیکیورٹی سیل سے اے کلاس منتقل کر دیا گیا جہاں ہم نے چند دن اکٹھے گزارے۔ اُن دنوں ہم کھانا، واک اور نماز اکٹھے ادا کرتے تھے۔اچانک انہیں سنٹرل جیل، لاہور منتقل کر دیا گیا اور یوں ہم اُن کی رفاقت سے محروم ہو گئے۔

اے کلاس میں مزید نئے چہرے آئے جن میں لیفٹننٹ کرنل (ر) عمر چوہدری، ایڈیشنل ڈائریکٹر نیب میجر (ر) مشہود لودھی، ملک عامر علی خان، چیف ایگزیکٹو آفیسر اسلامک انوسٹمنٹ بینک جاوید قریشی، ڈائریکٹر اسلامک بینک ندیم انور، رجسٹرار سپریم کورٹ محمد امین فاروقی، زبیر اللہ خان بنگش، چوہدری احمد سعید، نواب نادر خان یوسف زئی، محمد حسین چوہدری عرف

بھولا اور بزنس مین عمر رفیع شامل تھے۔

حال ہی میں ڈسٹرکٹ جیل' لاہور سے مسلم لیگ (نواز گروپ) کے ایم این اے سعد رفیق کو قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے رُول 90 کے تحت پروڈکشن آرڈر کے ذریعے لایا گیا۔ وہ چند دن ہمارے ساتھ رہے۔ موجودہ حکومت کے دور میں یہ پہلے پروڈکشن آرڈر جاری کیے گئے ہیں۔

اے کلاس میں بڑے عرصے سے میس کا نظام چل رہا ہے۔ پہلے وقار عظیم اُن کے بعد مظہر نورانی، پھر نوازش علی شاہ میس کے انچارج رہے، اُن کی رہائی کے بعد کرنل عمر چوہدری نے یہ ذمہ داری سنبھالی، چوہدری صاحب کی ضمانت کے بعد ملک عامر میس انچارج بنے جن کی رہائی کے بعد میس انچارج امین فاروقی رہے اور اَب ندیم انور میس انچارج ہیں۔

ہمارے بی کلاس کے اسیران میں سے سردار احمد رضا، میجر (ر) طارق محمود ایڈووکیٹ، میجر (ر) انوار الحق، نعمان جان کیانی اور ڈاکٹر عرفان کے علاوہ حیات خان مندوخیل سے اچھے مراسم ہیں، اداکار اسد ملک اور امریکن اداکار ایرک اکثر تہواروں اور ملاقاتوں میں ہمارے ساتھ مل بیٹھتے تھے۔

میری چوہدری نثار علی سے پرانی دوستی ہے۔ ہم 1985ء سے 1996ء تک اکٹھے ایم این اے رہے ہیں۔ ہم نے کئی نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ ہم ایک سیاسی جماعت میں بھی رہے۔ میری پیپلز پارٹی میں شمولیت کے باوجود ہمارے تعلقات میں فرق نہیں آیا۔ ہم آئی پی یو کی کانفرنس میں شرکت کے لیے رومانیہ کے شہر بخاریسٹ اکٹھے گئے تھے۔ نواز شریف کے دورِ اقتدار میں مجھے اُن سے ملاقات کرنی ہوتی تو چوہدری صاحب خود میرے پاس آجاتے اور کہتے کہ آپ کے اور میرے تعلقات کا نواز شریف کو علم ہے مگر محترمہ کو نہیں، لہٰذا میں نہیں چاہتا کہ محترمہ کے دل میں آپ کے متعلق کوئی غلط فہمی پیدا ہو۔ کچھ عرصے پہلے 2005ء میں میری چوہدری صاحب سے سنٹرل جیل اڈیالہ، راولپنڈی میں اُس وقت ملاقات ہوئی جب وہ اپنی پارٹی کے معاملات کو سلجھانے کے لیے جاوید ہاشمی سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ چوہدری صاحب ایک منجھے ہوئے سیاستدان اور معاملہ فہم شخص ہیں۔ وہ مشکل ترین ذمہ داریوں کو نہایت خوش اسلوبی سے نبھاتے ہیں۔ ایک مرتبہ وہ بلڈ پریشر گرنے کی وجہ سے سخت علیل ہو گئے۔ انہوں نے اپنا علاج

اسلام آباد کے ہومیو پیتھ ڈاکٹر پروفیسر اشفاق سے کروایا۔ اُن کے بعد بے نظیر بھٹو اور نواز شریف نے بھی اُن سے علاج کروایا تھا۔ میں نے ایک موقعہ پر محترمہ سے اس بات کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ ان حکیم صاحب کو اپوزیشن اور حکومت کو صحت مند رکھنے کے صلے میں ایوارڈ ملنا چاہیے۔

جس وقت میں 1988ء میں وزیرِ سیاحت تھا اُس وقت ہندوستان میں شیوراج پاٹیل بھی وفاقی وزیرِ سیاحت سول ایوی ایشن تھے۔ جب میں 1993ء میں سپیکر قومی اسمبلی منتخب ہوا، اُس وقت وہ سپیکر لوک سبھا تھے۔ سیّد جلیل عباس جیلانی دفترِ خارجہ کے ترجمان بھی رہے ہیں۔ وہ اٹل بہاری واجپائی کے دور میں ہندوستان میں قائم مقام ہائی کمشنر بھی تعینات رہ چکے ہیں۔ اُن کی دورۂ ہندوستان کے دوران شیوراج پاٹیل سے بھی ملاقات ہوئی جو اس وقت ہوم منسٹر ہیں۔ انہوں نے جلیل عباس سے میرے بارے میں دریافت کیا۔ میرے جیل میں ہونے کا سن کر وہ بہت حیران ہوئے۔ انہوں نے جلیل عباس سے کہا کہ کچھ عرصہ پہلے میں بھی جیل میں رہ چکا ہوں، میرا سیاسی کیرئیر یوسف رضا کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ یہ بات دورانِ اسیری مجھے جلیل عباس نے ملاقات کے وقت بتائی۔

صدر مشرف اور صدر مسلم لیگ (ق) چوہدری شجاعت حسین کے من پسند وزیرِ اعظم میر ظفر اللہ خان جمالی زیادہ دیر اس عہدے پر فائز نہ رہ سکے کیونکہ وزیرِ اعظم اور چوہدری شجاعت حسین کے درمیان غلط فہمیاں بڑھ گئی تھیں۔ صدر مشرف میرے کلاس فیلو وفاقی وزیرِ تجارت ہمایوں اختر خان کو وزیرِ اعظم بنانا چاہتے تھے مگر اُن کے خلاف بھی حکومتی مسلم لیگ کے اندر سے مخالفت کا سامنا تھا، لہٰذا پینتالیس دن کے لیے چوہدری شجاعت حسین کو ملک کا وزیرِ اعظم منتخب کیا گیا جو اپنی نوعیت کا پاکستان کی تاریخ میں انوکھا واقعہ تھا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ وفاقی وزیرِ خزانہ سینیٹر شوکت عزیز کی بطورِ وزیرِ اعظم نامزدگی چوہدری شجاعت حسین کے عبوری وزیرِ اعظم بنائے جانے کے وقت ہی کر دی گئی تھی جبکہ قانون کے مطابق ایم این اے ہی وزیرِ اعظم بن سکتا تھا جو کہ وہ نہیں تھے۔ نامزدگی کے بعد انہیں دو نشستوں پر ایم این اے منتخب کروایا گیا۔

امریکہ میں عام انتخابات میں صدر جارج بش نے ڈیموکریٹک اُمیدوار جان کیری کو شکست دے دی۔ انہی دنوں ہندوستان میں بھی عام انتخابات ہوئے جس میں کانگریس (آئی)

حکومت بنانے میں کامیاب ہوگئی۔ اکثریتی پارٹی کی لیڈر سونیا گاندھی نے اَزخود وزیرِ اعظم بننے سے انکار کر دیا جس سے ایک نئی تاریخ نے جنم لیا کہ دنیا میں ایسے رہنما بھی موجود ہیں جنہوں نے اقتدار کو ٹھوکر ماردی ہو۔ میرے نزدیک سیاسی طور پر سونیا گاندھی کی قدرومنزلت بڑھ گئی۔

2005ء کے بلدیاتی انتخابات 2002ء کے بلدیاتی انتخابات کی طرز پر کروائے گئے۔ نئی حلقہ بندیاں کی گئیں۔ حکومت نے اپنے نامزد اُمیدواروں کو کامیاب کروانے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا۔ بڑے پیمانے پر دھاندلی کی گئی جس کے متعلق ایم ایم اے اور اے آر ڈی نے چیف الیکشن کمشنر کے پاس شکایات درج کروائیں۔ اس قدر دھاندلی ہوئی کہ خود کنگز پارٹی میں دراڑیں پڑ گئیں اور اس میں فارورڈ بلاک تشکیل پا گیا۔ اکثر بین الاقوامی مبصرین نے ان بلدیاتی انتخابات پر سخت نکتہ چینی کی۔

8/اکتوبر 2005ء کے زلزلے سے اسلام آباد، سرحد، آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ جات میں ایسی تباہی آئی ہے کہ دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ حادثہ سونامی اور قطرینہ حادثے سے بھی زیادہ تباہی کا موجب بنا جس کے نتیجے میں ایک لاکھ سے زائد افراد لقمۂ اَجل بنے اور اتنی ہی تعداد میں زخمی یا اپاہج ہوئے۔ چار سے پانچ لاکھ گھروں کے مسمار ہونے سے ملک میں ایمر جنسی کی سی صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ دشوار گذار علاقوں اور سخت موسم کے باعث ان زلزلہ زدگان کے لیے امدادی کام اور مستقل بنیادوں پر بحالی خاصا مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ حزبِ اختلاف نے حکومت کے بحالی پروگرام کے طریقۂ کار سے اختلاف کیا ہے۔ حکومت نے عالمی برادری سے امداد کے حصول کے لیے اسلام آباد میں ڈونرز کانفرنس کا اہتمام بھی کیا مگر عالمی برادری نے سونامی حادثے میں جس جذبے کا مظاہرہ کیا اُس کی جھلک یہاں نظر نہیں آئی۔ اس نازک اور مشکل وقت میں ملک کے اندر سے اور بیرونِ ملک مقیم پاکستانی عوام نے دِل کھول کر امداد دی۔ میں اُن کے اس جذبے اور کاوش کی دِلی قدر کرتا ہوں۔

یہ بدلتے ہوئے تمام ملکی اور بین الاقوامی حالات میں نے دورانِ اسیری دیکھے۔

باب دہم

اختتامیہ

آج ملکی حالات اس نہج پر پہنچ چکے ہیں کہ ملک کو حقیقی سیاسی جماعتیں ہی دلدل سے نکال سکتی ہیں۔ دو جماعتی نظام بڑی کامیابی سے چل رہا تھا، کچھ مذہبی و علاقائی جماعتیں مسلم لیگ کے ساتھ تھیں اور کچھ پیپلز پارٹی کے ساتھ مگر اَب ایجنسیوں نے یہ حالت کر دی ہے کہ دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کو ملک سے باہر کر دیا ہے اور اُن کی پارٹیوں کو توڑا جا رہا ہے جو ملک و قوم کے مفاد میں نہیں۔ میں سمجھتا ہوں وہی دو جماعتی نظام ہی ان تمام برائیوں کا حل ہے۔

ہمارے ملک کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ بانیٔ پاکستان کی خواہش کے باوجود یہاں جمہوریت کو پنپنے کا موقعہ نہیں دیا گیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ محدود جمہوریت مختصر عرصہ کے لیے رہی ہے۔ ڈکٹیٹر کی نہ کوئی پہچان ہوتی ہے اور نہ ہی عوام میں جڑیں مگر اس کے باوجود وہ ہمیشہ برسرِ اقتدار رہنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرتا ہے۔ اُس کا پہلا قدم غیر جماعتی بنیادوں پر بلدیاتی انتخابات کروانے کا ہوتا ہے جس کے بعد کنگز پارٹی کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ ہارس ٹریڈنگ اور نیب جیسے اداروں کے ذریعے منتخب اراکین کی وفاداریاں خریدی جاتی ہیں، اس طرح راتوں رات یہ سب سے بڑی جماعت بن جاتی ہے۔ سیاستدانوں کا کام آئین سازی کرنا، داخلہ و خارجہ پالیسی وضع کرنا، ملک وقوم کی فلاح و بہبود کے لیے نظام کے بارے میں سوچنا، قومی و بین الاقوامی

سطح کی سوچ اپنانا، صحت، غربت، تعلیم، فرقہ واریت اور اقتصادی مسائل کا حل تلاش کرنا ہے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ سیاستدان اپنی سوچ کو وسیع کریں۔ کامیاب سیاستدان صرف اقتدار میں ہی نہیں بلکہ حزبِ اختلاف میں رہتے ہوئے بھی ملک وقوم کی ترقی اور جمہوریت کے لیے کردار ادا کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنی جماعت کے منشور پر وفاداری کے ساتھ عمل کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ ساتھ ہی سیاسی جماعتیں بھی اپنے اندر ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی قوت پیدا کریں۔ جمہوریت میں اختلافِ رائے ہی زندگی ہے، اس کا گلہ گھونٹنے کی کوشش جمہوریت کی موت ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارے ملک میں عدلیہ آزاد ہو اور قانون کی بالادستی ہو تو صرف ہمارا معاشرتی نظام ہی بہتر نہیں ہوگا بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں ترقی ہوگی کیونکہ جب تک عوام میں تحفظ کا احساس پیدا نہ ہو تب تک انہیں فرائض اور ذمہ داریوں کی طرف راغب نہیں کیا جاسکتا جس کے لیے ججوں کی تقرری کی شفاف پالیسی اپنانا، عدلیہ سے 1973ء کے آئین کے مطابق حلف لینا اور خصوصی عدالتوں کو ختم کرنا ضروری ہے۔

اس وقت ملک میں آبی ذخائر کی تعمیر کا مسئلہ اٹھا ہوا ہے۔ حکومتِ وقت کالا باغ ڈیم کی تعمیر ہر حال میں کرنے پر مُصر تھی جبکہ تین صوبے اس کے خلاف قراردادیں منظور کر چکے ہیں حکومت کی کوشش تھی کہ اس مسئلہ کے حق میں قومی اسمبلی اور سینٹ سے قرارداد منظور کروائی جائے۔ میرا خیال ہے کہ حکومت کو صوبوں سے اتفاقِ رائے اور افہام وتفہیم کے ساتھ چلتے ہوئے اس مسئلہ کو حل کرنا چاہیے ورنہ مرکز اور صوبوں کا تصادم خطرناک صورتِ حال اختیار کر سکتا ہے جو کسی طور ملک کی سلامتی اور جمہوریت کے لیے مناسب نہ ہوگا۔ حکومت کو ڈیموں کی تعمیر ضرور کرنی چاہیے مگر یہ متنازعہ نہ ہوں۔ دیگر ڈیم جن پر حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف مطمئن ہو، کی تعمیر بلاتاخیر شروع کی جائے۔ کالا باغ ڈیم پر اتفاقِ رائے نہ ہونے کے باعث اَب دیامیر بھاشا ڈیم کا اعلان کردیا گیا ہے۔

میرا تجزیہ ہے کہ نیوکلیئر ٹیکنالوجی کے بعد آئندہ جنگیں پانی کے حصول پر ہوں گی۔ اس کے بعد اگر کوئی سنجیدہ ترین مسئلہ ہے تو وہ آبادی میں اضافے کی رفتار ہے جس پر فوری توجہ کی

ضرورت ہے۔ایک اندازے کے مطابق ہمارے ملک کی آبادی میں اُنتیس لاکھ سالانہ اضافہ ہو رہا ہے جو خطرناک حد تک زیادہ ہے اور ترقی میں حائل رکاوٹوں میں سے ایک بڑی رکاوٹ ہے۔آبادی میں اضافے کی تیزی کو روک کر تیز رفتار ترقی کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔اس مقصد کے حصول کے لیے علماء کی مدد اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

ہمارے ملک میں اقتصادی حالات غیر یقینی صورتحال کا شکار ہیں جس سے ہمارا ملک اقتصادی لحاظ سے تنزل پذیر ہے۔قطع نظر سیاسی وابستگیوں کے ایسی اقتصادی پالیسی اپنائی جائے جس پر اتفاقِ رائے سے ایک مستقل لائحہ عمل مرتب ہو کہ آنے والی حکومتیں بھی اسی پر گامزن رہیں۔ہوتا یہ ہے کہ ایک حکومت منصوبہ شروع کرتی ہے تو دوسری آ کر اسے ختم کر دیتی ہے یا تبدیل کر دیتی ہے جس سے ملک وملّت کا نقصان ہوتا ہے اور وہ منصوبے اپنی افادیت کھو دیتے ہیں۔سرمایہ کار مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ملک کے وقار کو بھی ٹھیس پہنچتی ہے۔اگر ہماری اقتصادی پالیسی میں تسلسل اور استحکام ہو تو نہ صرف بیرونِ ملک سے سرمایہ کاری میں اضافہ ہو گا بلکہ ان منصوبوں کا فائدہ بھی عوام تک بروقت پہنچ سکے گا۔

دنیا میں تیز رفتار ترقی کے لیے ہر شعبے میں کمپیوٹر کا استعمال بڑھ رہا ہے کیونکہ یہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کا دور ہے۔پوری دنیا سمٹ کر گلوبل ولیج بن چکی ہے۔اگر ہمیں ترقی یافتہ ممالک کے شانہ بشانہ چلنا ہے تو ہمیں اپنے تعلیمی اداروں میں مذہبی اور درسی تعلیم کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر کی تعلیم پر بھرپور توجہ دیتے ہوئے اسے لازمی قرار دینا ہو گا تا کہ ہم زیادہ سے زیادہ افرادی قوت پیدا کر سکیں اور ہمارے تمام ادارے کمپیوٹرائزڈ ہو کر ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکیں۔

ہمارا ملک بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے جس کے ستر فیصد عوام کا پیشہ زراعت ہے لیکن ہم ابھی تک اس شعبے میں جدید ٹیکنالوجی کے استعمال کو فروغ نہیں دے سکے۔کوآپریٹو فارمنگ اور آسٹریلیا کی طرز پر جدید ٹیکنالوجی استعمال کی جائے تو پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ممکن ہے جس سے ملک کی اندرونی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ زرِمبادلہ کے حصول کا بڑا ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے اور اس شعبے میں خود کفالت کی منزل حاصل کی جا سکتی ہے۔بھٹو صاحب کی زرعی اصلاحات بھی اسی پروگرام کا حصہ تھیں۔زراعت میں نئی تحقیق اہم مقام رکھتی ہے۔ہم

دوسروں کے مرہونِ منت ہونے کی بجائے اپنے ماحول، آب وہوا اور ضروریات کے مطابق تحقیقی کام کر کے بہترین نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔

فوج ہمارے ملک کا اہم ترین ادارہ ہے جس کا شمار دنیا کی بہترین افواج میں ہوتا ہے مگر بدقسمتی سے چندلوگوں کے انفرادی کردار کی وجہ سے یہ ادارہ اپنی ساکھ کے حوالے سے متنازعہ حیثیت اختیار کرتا جارہا ہے۔فوج کی بار بار اقتدار میں مداخلت نے نا صرف بحیثیت ادارہ اس کی اپنی حیثیت متاثر کی ہے بلکہ اس سے جمہوریت کے سفر میں بھی بار بار تعطل پیدا ہوا ہے۔فوج کتنی بھی مخلص یا فرض شناس کیوں نہ ہو حکومت چلانا اُس کا کام نہیں۔ضروری ہے کہ فوج آئین کے مطابق دیے گئے حلف کی پاسداری کرتے ہوئے سرحدوں کی حفاظت یقینی بنائے۔

فوج کو مزید مضبوط اور عالمی معیار کے مطابق بنانے کے لیے جدید ٹیکنالوجی کی فراہمی بہترین اقدام ہوگا۔خصوصاً فضائی اور بحری شعبے میں ہماری افواج کے پاس جدید سہولیات کی کمی ہے جس پر توجہ دینا ازحد ضروری ہے۔ بجٹ میں بہت بڑا حصہ اس ادارے کے لیے مختص کیا جاتا ہے مگر اُس کا آڈٹ نہ ہونا شکوک وشبہات کو جنم دیتا ہے۔اس کا بجٹ باقاعدگی سے قومی اسمبلی میں پیش ہونا چاہیے۔

آئین کے بانیوں نے سینٹ کا فورم اس لیے متعارف کروایا تھا تا کہ چھوٹے صوبوں میں احساسِ محرومی کو ختم کیا جا سکے اور آئین میں ترمیم دونوں ایوانوں کی دوتہائی اکثریت سے اسی لیے تجویز کی تھی تا کہ کسی قسم کی غیر آئینی ترمیم نہ کی جا سکے مگر اس کے برعکس سترھویں ترمیم دباؤ کے تحت پاس کروائی گئی اور اُن اراکین نے اس کی حمایت کی جو اپنی جماعت سے بے وفائی کر کے آئے تھے۔ملکی سلامتی اور جمہوری تسلسل کے لیے اراکینِ پارلیمنٹ کو چاہیے کہ وہ سترھویں ترمیم ختم کر دیں۔ بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کو واپس لایا جائے۔ایجنسیوں کے ذریعے بنائی گئی پارٹی عوام پر مسلط نہ کی جائے۔خود مختار الیکشن کمیشن قائم کیا جائے۔ ملک میں قومی حکومت کے تحت آزادانہ، منصفانہ اور شفاف انتخابات غیر ملکی مبصروں کی نگرانی میں کروائے جائیں۔ پارلیمنٹ کی بالادستی قائم کی جائے۔

بلوچستان اور وزیرستان کے مسئلے کی صحیح تشخیص کر کے فوجی آپریشن بلا تاخیر بند کیا

جائے۔ جتنا جلد ممکن ہو ان اقدامات پر عمل کیا جائے، تاخیر ملک کے لیے خدانخواستہ خطرہ نہ بن جائے۔ ہر ادارہ قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنا اپنا کام کرے۔ اگر اداروں کا تصادم ہوا تو ملکی سالمیت کے لیے خطرناک ہوگا۔ ملک کے مسائل کا آسان حل یہ ہے کہ خاموش اکثریت کو اپنا فیصلہ خود کرنے دیا جائے:

جنہیں زندگی کا شعور تھا انہیں بے زری نے بچھا دیا
جو گراں تھے سینۂ خاک پر وہی بن کے بیٹھے ہیں معتبر
یہ بجا کہ آج اندھیرا ہے بس رُت بدلنے کی دیر ہے
جو خزاں کے خوف سے خشک ہے وہی شاخ لائے گی برگ و بر

❁❁❁

مصنف کے غیر ممالک کے دورے

میں نے کئی ممالک کے سرکاری، نیم سرکاری اور نجی دورے کیے۔ کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں ملک کی قیادت کی۔ اس میں آئی پی یو، سی پی اے اور دوطرفہ تعلقات (Bilateral Relationships) شامل ہیں جو حسب ذیل ہیں:

1984ء پارلیمانی وفد کے ہمراہ بطور رکن جکارتہ، سولو (انڈونیشیاء) کا دورہ۔

1986ء بطور وفاقی وزیر ریلوے، ریلوے لائن مابین حفوف و دمّام (سعودی عرب) کا معائنہ۔

1986ء سعودی عرب کے دارالخلافہ ریاض کی سلور جوبلی & 'Riyadh Today Yesterday' تقریبات میں شرکت۔

1988ء عمان اور اسلام آباد کو جڑواں شہر قرار دیے جانے کی تقریب منعقدہ عمان (اردن) میں شرکت۔

1989ء امام خمینی کی نمازِ جنازہ تہران (ایران) میں حکومتِ پاکستان کی نمائندگی بطورِ وفاقی وزیر۔

1989ء ورلڈ ٹورازم آرگنائزیشن کے اجلاس منعقدہ پیرس (فرانس) میں شرکت۔

1989ء بطورِ وزیرِ سیاحت جزیرہ بالی (انڈونیشیاء) کا دورہ۔

1989ء پاکستان ایسوسی ایشن آف ٹریول ایجنٹس (PATA) کے اجلاس منعقدہ نئی دہلی (بھارت) میں شرکت کے علاوہ آگرہ، فتح پور سیکری، جے پور، اَجمیر، ممبئی، شملہ اور

چیل کا دورہ۔

1990ء بے نظیر بھٹو کی طرف سے سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے سالانہ بین الاقوامی کنونشن منعقدہ برلن (جرمنی) میں بطورِ نمائندہ شرکت اور کوپن ہیگن (ڈنمارک) کا دورہ۔

1990ء بے نظیر بھٹو کی طرف سے سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے سالانہ بین الاقوامی کنونشن منعقدہ ریجیو ملی (اٹلی) میں بطورِ نمائندہ شرکت۔

1991ء امام خمینی کی برسی تہران (ایران) میں شرکت۔

1992ء بطور رکن پارلیمانی وفد کے ہمراہ 87ویں آئی پی یو کے اجلاس منعقدہ یونڈے (کیمرون) میں شرکت۔

1992ء قائدِ حزبِ اختلاف بے نظیر بھٹو کے ہمراہ راجیو گاندھی کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے دہلی (بھارت) اس کے علاوہ جے پور اور اجمیر شریف کا دورہ۔

1993-94ء بطور سربراہ پارلیمانی وفد مصر، اردن، شام، نیپال، مالدیپ، سپین، سویڈن، تھائی لینڈ اور ہنگری کا دورہ۔

1994ء بطور سربراہ وفد کینبرا، سڈنی، مورے، تسمانیہ، پورٹ آرتھر (کالا پانی) آسٹریلیا کا دورہ۔

1994ء دولتِ مشترکہ کے رکن ممالک کے سپیکرز اور پریذائیڈنگ آفیسرز کے اجلاس منعقدہ پاپوانیوگنی میں شرکت۔

1994ء جمہوریت کی مضبوطی کے لیے سی پی اے کے اجلاس منعقدہ لندن (برطانیہ) میں شرکت۔

1994ء بطورِ سربراہ وفد، آئی پی یو کے 91ویں اجلاس منعقدہ پیرس (فرانس) میں شرکت۔

1994ء بطورِ سربراہ وفد، آئی پی یو کے 92ویں اجلاس منعقدہ کوپن ہیگن (ڈنمارک) میں شرکت۔

1995ء دولتِ مشترکہ کی طرف سے سڈنی بندرگاہ (آسٹریلیا) میں نئے سال کے آغاز پر تقریبات میں شرکت۔

1995ء 'رابطہ عالمِ اسلامی' کی دعوت پر تقریب 'غسلِ کعبہ' میں شرکت و ادائیگی 'حجِ اکبر'۔

1995ء آئی پی یو کی طرف سے اقوامِ متحدہ کی گولڈن جوبلی تقریبات منعقدہ نیو یارک (امریکہ) میں شرکت اور اقوامِ متحدہ کے اجلاس سے خطاب۔

1995ء دولتِ مشترکہ کے رکن ممالک کے سپیکرز اور پریذائیڈنگ آفیسرز کی سٹینڈنگ کمیٹی کے اجلاس منعقدہ کوالالمپور (ملائیشیاء) میں شرکت۔

1995ء بطورِ سربراہ پارلیمانی وفد، پاک پیک (PAK-PAC) کے پہلے سالانہ اجلاس منعقدہ لاس ویگاس (ریاست نواڈا، امریکہ) میں شرکت۔

1995ء دولتِ مشترکہ کے رکن ممالک کے سپیکرز اور پریذائیڈنگ آفیسرز کی سٹینڈنگ کمیٹی کے اجلاس منعقدہ جزیرہ بالی (انڈونیشیاء) میں شرکت۔

1995ء ہینسائیڈل فاؤنڈیشن (Hensidel Foundation) کی طرف سے دورۂ جرمنی۔

1995ء بطورِ سربراہ پارلیمانی وفد، سارک کے رکن ممالک کے سپیکرز کے پہلے اجلاس منعقدہ دہلی (بھارت) میں شرکت۔

1995ء بطورِ سربراہ پارلیمانی وفد، سی پی اے کے 41ویں اجلاس منعقدہ کولمبو (سری لنکا) میں شرکت۔

1995ء بطورِ سربراہ پارلیمانی وفد، آئی پی یو کے 94ویں اجلاس منعقدہ بخارسٹ (رومانیہ) میں شرکت۔

1995ء مسلمان خواتین پارلیمنٹیرینز کی پہلی بین الاقوامی کانفرنس منعقدہ اسلام آباد (پاکستان) کی میزبانی وصدارت۔

1995ء بطورِ سربراہِ پارلیمانی وفد مالدیپ کا دورہ۔

1995ء بطورِ سربراہِ پارلیمانی وفد، پاپوانیوگنی کا دورہ۔

1996ء 'Climate Change Conference' منعقدہ منیلا (فلپائن) میں شرکت۔

1996ء بطورِ سربراہ پارلیمانی وفد، دولتِ مشترکہ کے سپیکرز اور پریذائیڈنگ آفیسرز کے 13ویں اجلاس منعقدہ نیسکوسیا (قبرص) میں شرکت۔

1996ء بطورِ سربراہ پارلیمانی وفد، آئی پی یو کے 95ویں اجلاس منعقدہ استنبول (ترکی) میں شرکت۔

1996ء بطورِ سربراہ پارلیمانی وفد، مشہد، اصفہان (اسلامی جمہوریہ ایران) کا دورہ اور ایران کی پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب۔

1996ء بطورِ سربراہ پارلیمانی وفد، پاک پیک کے دوسرے سالانہ اجلاس منعقدہ ڈیئر بورن، مِشی گن (امریکہ) میں شرکت۔

1997ء این ڈی آئی کی طرف سے احتساب کے نظام کے مطالعہ کے لیے جوہنیس برگ، کیپ ٹاؤن، پریٹوریا (جنوبی افریقہ) کا دورہ۔

امریکہ، ہانگ کانگ، سنگاپور، فرانس، آسٹریلیا، ہالینڈ، سپین، سوئٹزرلینڈ، مکاؤ، برما، تھائی لینڈ، یونان، جاپان، نائجیریا، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے سرکاری، نیم سرکاری اور نجی دورے۔

1998ء دوبئی میں بےنظیر بھٹو سے ملاقات۔

1998ء تادمِ تحریر میرا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ* میں شامل ہے۔

☆☆☆

* وہ فہرست جس میں ایسے نام شامل ہوتے ہیں جن پر ملک سے باہر جانے کی پابندی لگائی گئی ہو۔

والد سیّد علمدار حسین گیلانی 'ایک نظر میں'

پیدائش: 12/دسمبر 1919ء ملتان۔

تعلیم: 1941ء بی اے، ایمرسن کالج، ملتان۔

سیاست: بطورِ طالب علم پاکستان مسلم لیگ میں شمولیت۔

- 1940ء قراردادِ پاکستان پر دستخط کیے۔
- 1951ء مسلم لیگ کے ٹکٹ پر لودھراں سے ایم ایل اے منتخب ہوئے۔
- 1953ء وزیرِ اعلیٰ پنجاب ملک فیروز خان نون کی کابینہ میں وزیرِ صحت و بلدیات رہے۔
- 1953ء ایل ایس ایم ایف سکول، بہاولپور قائم کیا۔
- 1954ء نشتر میڈیکل کالج و ہسپتال، ملتان قائم کیا۔
- 1954-55ء دنیا کی مشہور سوانح عمری کتاب 'The World's Who's Who' میں نام کی شمولیت ہوئی۔
- 1956ء خانہ کعبہ کے اندر عبادت کرنے کا شرف حاصل ہوا۔
- 1956ء ایم ایل اے منتخب ہوئے۔
- 1956ء رکن آئی پی یو رہے۔
- 1958ء وزیرِ اعظم ملک فیروز خان نون کی کابینہ میں وزیرِ مملکت رہے۔
- 1958ء ایبڈو کا شکار ہوئے۔

- 1970ء قومی اسمبلی کے انتخاب میں ملتان سے پاکستان پیپلز پارٹی کے اُمیدوار سے شکست۔
- بیرون ملک دوروں میں متعدد بار پاکستان کی نمائندگی کی۔
- مسلم لیگ ضلع ملتان کے صدر رہے۔
- مسلم لیگ کی سنٹرل ورکنگ کمیٹی کے رکن رہے۔
- 'انجمن اسلامیہ' ملتان میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔

رحلت:۔ 9/اگست 1978ء بمطابق تین رمضان المبارک اس دارِفانی سے رخصت ہوئے۔

❀ ❀ ❀

چچا سیّد حامد رضا گیلانی 'ایک نظر میں'

پیدائش: 17راگست 1936ء ملتان۔

تعلیم: بارایٹ لا، برطانیہ۔

سیاست: 1962ء لودھراں سے ایم این اے منتخب ہوئے۔

. 1962ء پارلیمانی سیکرٹری برائے اُمورِ خارجہ مقرر ہوئے۔

. 1964ء لودھراں سے بلا مقابلہ ایم این اے منتخب ہوئے۔

. 1964ء پارلیمانی سیکرٹری مقرر ہوئے۔

. 1970ء قومی اسمبلی کے انتخاب میں پیپلز پارٹی کے اُمیدوار سے شکست۔

. 1972ء کینیا میں پاکستان کے سفیر تعینات ہوئے۔

. 1977ء پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر ملتان سے ایم این اے منتخب ہوئے۔

. 1977ء وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی کابینہ میں وزیرِ صنعت بنے۔

. 1985ء غیر جماعتی انتخابات میں ملتان سے ایم این اے منتخب ہوئے۔

. 1986ء نیشنل پیپلز پارٹی کے نائب صدر بنے۔

. 1990ء قومی اسمبلی کی نشست پر پیپلز پارٹی کے اُمیدوار سے شکست ہوئی۔

. 1991ء مسلم لیگ کی طرف سے سینیٹر منتخب ہوئے۔

. چیئرمین بورڈ آف گورنرز نشتر ہسپتال، ملتان رہے۔

. دنیا کے بیشتر ممالک کا دورہ کیا اور متعدد بار پاکستان کی نمائندگی کی۔

رحلت: 24رجنوری 2004ء اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے۔

Glossary

1. ILA Indian Legislative Assembly
2. MLA Member Legislative Assembly
3. IJI Islami Jamhoori Itehad
4. IPU Inter Parliamentary Union
5. EBDO Elective Bodies (Disqualification) Order
6. BDS Basic Democracy System
7. KG Kindergarten
8. CSS Civil Superior Services
9. NCC National Cadet Corps
10. PNA Pakistan National Alliance
11. ARD Alliance for Restoration of Democrac
12. GHQ General Headquarters
13. MSF Muslim Student's Federation
14. ADB Asian Development Bank
15. ITDC Indian Tourism Development Corporation
16. PWD Pakistan Works Department
17. NAB National Accountability Bureau
18. FGEHF Federal Government Employees Housin Foundation
19. NPP National People's Part

20.	CDA	Capital Development Authorit
21.	MRD	Movement for Restoration of Democracy
22.	CEC	Central Executive Committee
23.	MQM	Muttahida Quami Movement
24.	PTDC	Pakistan Tourism Development Corporation
25.	GDA	Grand Democratic Alliance
26.	TIC	Tourism Information Centre
27.	PATA	Pakistan Association of Travel Agents
28.	WTO	World Tourism Organization
29.	IB	Intelligence Bureau
30.	CCP	Chinese Communists Party
31.	ISI	Inter Services Intelligence
32.	DCC	Defence Co-ordination Committee
33.	ISPR	Inter Services Public Relations
34.	CPA	Commonwealth Parliamentary Assocaition
35.	NPC	National People Congress
36.	UBL	United Bank Limited
37.	PAK-PAC	Pakistan Physicians Public Affairs Committee
38.	NDI	National Democratic Institute for International Affairs
39.	IPP	Independent Power Plant
40.	ILO	International Labour Organization
41.	CEC	Cotton Expert Corporation
42.	ECL	Exit Control List
43.	FIA	Federal Investigation Authority
44.	SIW	Special Investigation Wing (of ISI)

45. PIMS Pakistan Institute of Medical Sciences

46. NIH National Institute for Handicapped

47. PIC Pakistan Institute of Cardiology

48. ICU Intensive Care Unit

49. CBR Central Board of Revenue

50. CWC Central Working Committee

51. DMLA Deputy Marshal Law Administrator

52. ANP Awami National Party

☆☆☆

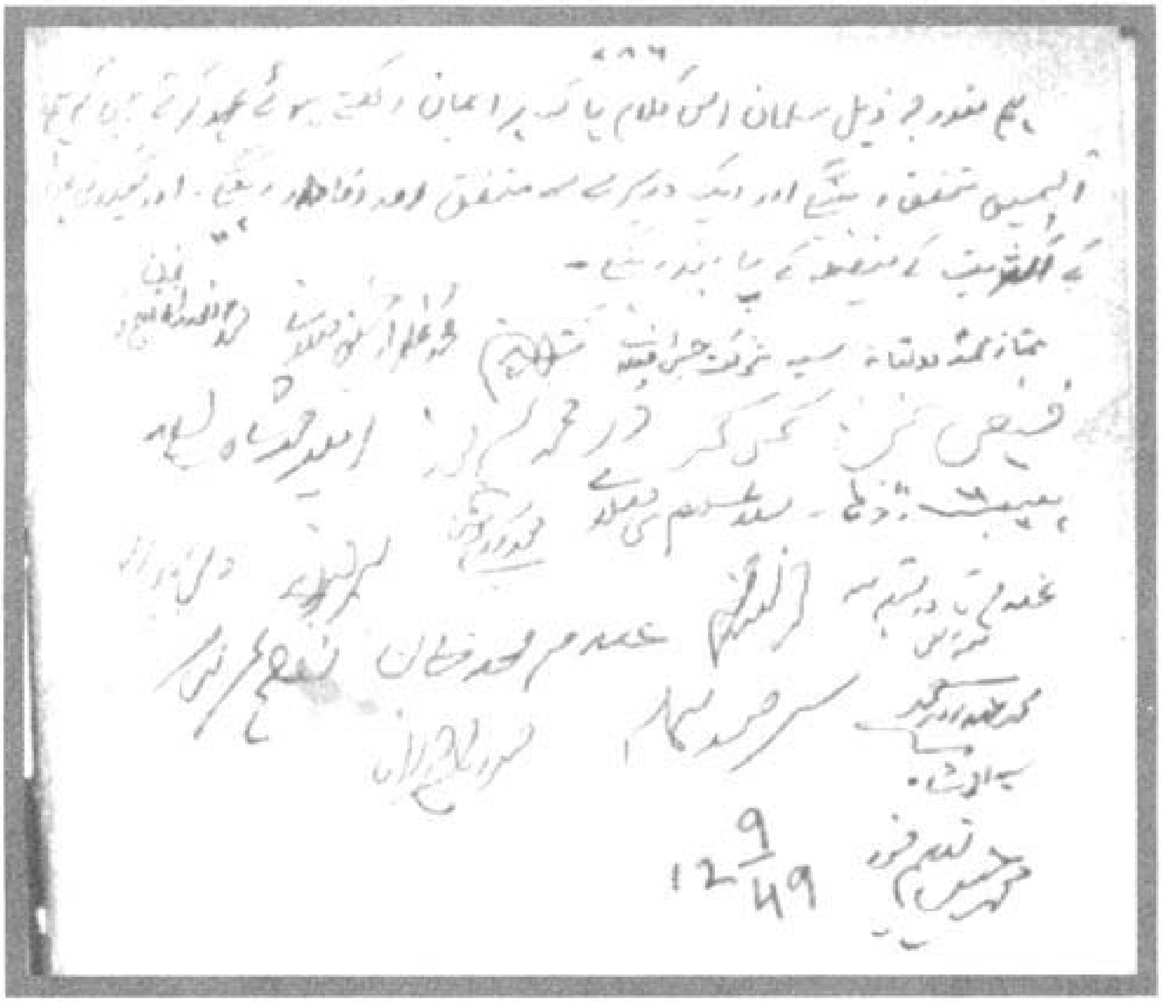

گیلانی دولتانہ پیکٹ کا عکس 12 ستمبر 1949ء

سید یوسف رضا گیلانی کے نام نگہت بہن کا آخری پیغام

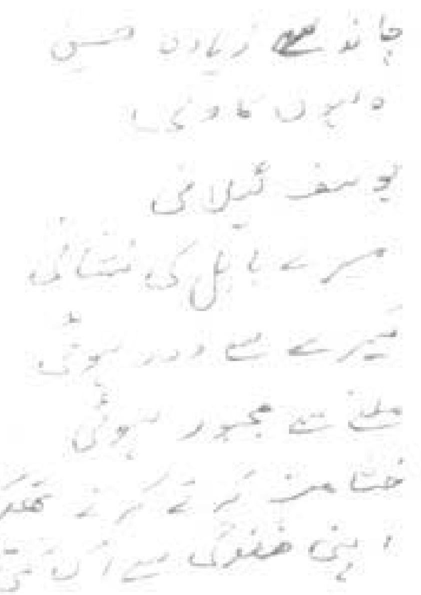
چاند سے زیادہ حسین
دلہن کا دولہا
یوسف گیلانی
میرے بابل کی نشانی
تیرے سے دور ہوئی
ملنے سے مجبور ہوئی
خدمت کرتے کرتے تھک گئی
اپنی خفگی سے آزاد ہوئی

ہمشیرہ کے خط کا عکس

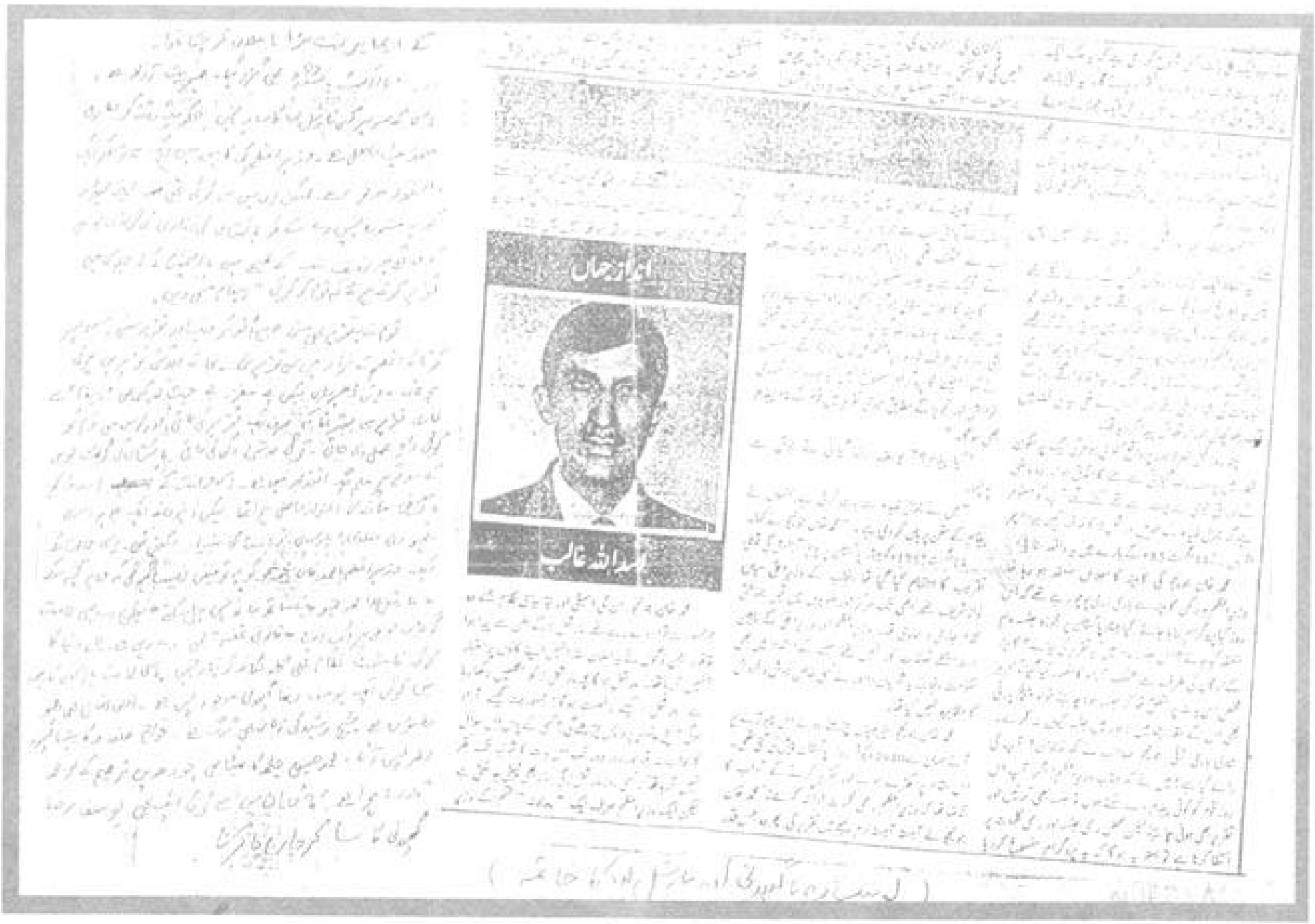

اخبار 'روزنامہ جنگ' کا عکس (جمہوریت اور مارشل لاء)

DAWN
Wednesday, December 11, 2002
Tel: 111-444-777—2202701; Fax (Edit) 2202710, (Advt) 2202707, (Management) 2202707
Dawn on Internet: http://DAWN.com
© Pakistan Herald Publications (Pvt) Ltd, 1998
E-Mail: Editorial: editor@dawn.com Marketing: mktg@dawn.com
Resident Editor (Islamabad): re.isb@dawn.com Marketing: mktg.isb@dawn.com
Resident Editor (Lahore): re.lhr@dawn.com Marketing: mktg.lhr@dawn.com

A matter of principle

SYED Yusuf Raza Gilani's resignation as central vice-chairman of the People's Party is a rare example in Pakistan of a leader quitting a party office on a matter of principle. He condemned his nephew's decision to join the PPP "forward bloc" and said he had to hang his head in shame for the conduct of Asad Murtaza Gilani, who won a Punjab provincial assembly seat on a PPP ticket. The senior Gilani accepted his responsibility for getting Asad a PPP ticket. However, once elected, Asad chose to cross the line — which is not a violation of the rules yet because the relevant clause forbidding floor-crossing has been held in abeyance by the generals. A technical violation it may not be, but most certainly, morally speaking, Asad Gilani is guilty of gross opportunism. He won because of the votes he received from those who supported PPP policies. By ditching the party on whose ticket he won and by moving over to the other side for possible lucrative gains, Asad has betrayed the trust of his voters — as have all others who have left their parties after October 10. In his letter from his prison cell to party chief Benazir Bhutto, Yusuf Raza Gilani has pledged his loyalty to the PPPP and condemned not only his nephew but "all other party members — who have chosen to align themselves with the present regime for personal gains."

Our politicians are not very famous for upholding principles, especially when it comes to seeing the difference between party and government. As history shows, prime ministers have chosen to remain party chiefs instead of letting others run their parties. This has had disastrous effects not only on parties and governments but also on the country itself. Invariably, whenever a prime minister was also the party chief, he or she considered party interests synonymous with state interests. As party chiefs, they have also tended to punish members who dared differ with their policies. This is in contrast to the tradition in established parliamentary democracies, where it is the party that controls the government. The cabinet is as much responsible to the party as it is to parliament. This makes the prime minister and cabinet members behave and conform to party policies and programmes.

At present there is trouble between Prime Minister Zafrullah Khan Jamali and PML(Q) chief Mian Azhar over the former's decision to nominate Saleem Saifullah Khan as party secretary-general. This has angered Mian Azhar, who feels bypassed. Besides, it is the party's general council that has the right to elect the secretary-general. Mr Jamali, of course, has done the right thing by quitting the office of party secretary-general. But, by appointing Saifullah in his place, he has violated the party's constitution. The PML(Q) is hardly the kind of party that can be cited as a model of political propriety. Its very origin and epithet — "king's party" — serve to remind one of what future this motley crowd of turncoats and opportunists has as a party. Nevertheless, it is the largest party in the National Assembly, and for that reason it can at least begin by conforming to the fundamental principles of parliamentary democracy.

اخبار ’ڈان‘ کا عکس
(اصول کی پاسداری)

Benazir's return must to fill vacuum, says Gilani

Tariq Butt

LAMABAD: Former Prime Minis- Benazir Bhutto has no option but to come back if she wants to ntinue to play a role in politics. usuf Raza Gilani, Vice Chairman Pakistan People's Party (PPP) d former National Assembly peaker said on Friday.

"There is a political vacuum in e country after Nawaz Sharif's exit; no third political force has emerged on the political horizon so enazir Bhutto will have to come ck... there is no other option," Gi- ni told The News in an interview.

He said some political parties ave tried to click as a third force ut failed to prove themselves a bstitute of Nawaz Sharif and Be- nazir Bhutto.

"The heads of the two main- ream parties are abroad, one by oice and the other by default, and ith the present government fail- ing to provide any relief to the pub- lic, people are again ready to de- end on the previous political aders," he said.

Gilani said nobody could bar Nawaz Sharif from coming back nder any law of Pakistan. Exile as no place in the Constitution.

He said the public reaction to e ouster of the Nawaz Sharif gov- ernment was emotional that has vaporated and realities have come to the fore.

He said the Musharraf govern- ment has also no option but to hold general elections. Running the country is the job of politicians, and it should be left to them, he said.

After the recent Supreme Court verdict on the review petitions against the validation of October 12, 1999 military takeover, there is no moral ground for the military government to hold general elec- tions.

Gilani said there was no deal between the government and the PPP for Benazir's return. Specula- tion hinting at such deal are part of a disinformation, he said and stopped short of blaming the mili- tary government for it. He held the vested interest responsible for such campaign.

"If there has been any deal, the PPP wouldn't be spending its ener- gies for public mobilisation. We have been sitting home comfortably.

The PPP leader said that Be- nazir's return was a must. "Today there is a vacuum, tomorrow it may not be ..." he added.

Gilani said the PPP was chan- neling its energies to gauge and prepare public for Bhutto's home- coming.

Gilani did not mention any date for Benazir's return, and said nei- ther Benazir nor any other leader of the PPP was looking for the 1986 like welcome.

"That was a one-day event. Her coming back to a rousing welcome only will not serve the purpose. Her return is much more important than that," he added.

The PPP leader brushed aside Benazir's possible arrest on return, saying it was not the party's headache. "When the PPP will give a green signal to her, of course, we will be ready for all eventualities."

The PPP and Pakistan Muslim League (PML), Gilani said, gave Pakistan a two-party system, and also played a vital role in taking the regional parties into their folds, taking them away from parochial politics.

Today, he said, there is again talk of provincialism and the 1940 Resolution. This happened because the smaller parties are no more in the national mainstream, he said.

On Chief Executive General Pervez Musharraf's remark that he speaks not with the wiles of a politician, Gilani said that politi- cians have to play a role whether one likes or not.

"We have to perform our role sooner or later. No one can pull along without politicians. When politicians are discredited, ousted and maligned, separatists come to the forefront," he said.

Gilani said people have become disappointed with the present gov- ernment. They welcomed it on Oc- tober 12, 1999, pining their hopes on them, but today they are disillu- sioned, he said.

"There are so many problems right now. First, there is political vacuum, sectarian violence is again on the rise, Constitution is in abeyance, economy getting worse and worse, border tensions with India going on with Kashmir issue simmering and of course, price- hike swelling day by day."

To tackle these problems, the PPP leader said, Pakistan needs leaders with vision, a political pro- cess, to create an atmosphere of national reconciliation; an atmo- sphere where people are proud to be called Pakistani," he added.

Gilani said though the country was facing multi-faceted gover- nance crisis, he was not disap- pointed with the future outlook. Pakistan is a wonderful country with tremendous potential.

On accountability, the PPP leader said that his party supports the process, but this should be in- stitutionalised. He said there was a very thin line between accountabil- ity and victimisation.

"The accountability setup should not be headed by executive, but by judiciary, so that the process could be made permanent and above board. When every incum- bent starts accountability of the predecessor, the acrimony out of this vicious circle will never end. We will continue to have people like Saifur Rehman...".

Gilani called for formation of a Truth and Reconciliatory Commis- sion to make a new start in politics.

Asked about the recent disclo- sure made by the Intelligence Bu- reau bugging devices, the PPP leader said the intelligence agencies always made their presence felt.

But, he said, time has come when every institution should work within the ambit of the 1973 Con- stitution, fearing that the clash of institutions would lead to chaos.

"In 1973 Constitution, there are clear instructions for every institu- tion, which should be abided by to avoid any disaster," he said.

Gilani refused to comment on a hard-hitting Benazir Bhutto inter- view against the intelligence agen- cies, saying those were observa- tions and he did not know in which context they were uttered.

About the difference in the regimes of General Ziaul Haq and General Pervez Musharraf, Gilani said that Zia got together anti-Bhutto elements around him, but Musharraf failed to rally the anti-Nawaz force (assembled in the Grand Democratic Alliance) behind it.

"PNA became a shock observer between the people and the Ziaul Haq government; this time there are no shock observers, and disap- pointment in this government's performance is all too evident," he said.

اخبار"دی نیوز" کا عکس (بے نظیر بھٹو کی واپسی)